نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۴۹	باخبروں کی خاموشی	۶۰
۵۰	ننانوے ناموں کا ورد اور ننانوے کا پھیر	۶۱
۵۱	مُلّا اور صوفی	۶۱
۵۲	خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے	۶۱
۵۳	بس خدا سے کام رکھو	۶۲
۵۴	آغاز وہ تھا۔ انجام یہ ہے	۶۲
	باب ۳۷	
	اسلام سے بیگانگی	
۵۵	شیخ بھی توحید کا کلمہ بھولے	۶۵
۵۶	حرص و حسد کی آگ	۶۵
۵۷	مسجد میں عالم خاموشی	۶۵
۵۸	گور پرستی و زر پرستی	۶۶
۵۹	ضعف مذہب کے ساتھ دولت و جاہ کی کمزوری	۶۶
۶۰	مذہبی عقیدوں میں کمزوری	۶۶
۶۱	مسلمان ہیں، کہاں؟	۶۶
۶۲	غیرتِ دینی کا فقدان	۶۷

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۳	نماز اور وظیفے کے ساتھ خلیفہ بھی رخصت۔	۶۷
۶۴	یہ خودسری ہے یا خودکشی	۶۷
۶۵	شیخ پر لاحول	۶۸
۶۶	اللہ کے نام کی تجارت	۶۸
۶۷	از دست خویشتن فریاد	۶۸
۶۸	صلح و جمعت کم ہونے کی وجہ	۶۹
۶۹	آئینِ دین چھوڑنے کا نتیجہ	۶۹
۷۰	مصروفیاتِ دنیا اور مذہب	۶۹
۷۱	قبلہ و کعبہ کی دیرنشینی	۷۰
۷۲	نوجوانوں کی تعلیم اور ربایش	۷۰
۷۳	نہ وہ صورت ہے نہ وہ سیرت	۷۰
	باب ۳۸	
	دین و دانش	
۷۴	ہیلون میں خدا سے باتیں	۷۳
۷۵	فہم اور وہم	۷۳
۷۶	اللہ کی یاد سے اطمینان قلب	۷۳

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۷۷	عظمتِ دنیا کے احساس کا مقابلہ	۷۴	۹۳	مرنا ہے ضرور اور قیامت برحق	۸۰
۷۸	تدبیر جزوِ تقدیر	۷۴	۹۴	فلسفہ اور دین کی دشمنی	۸۰
۷۹	سب کچھ خدا کا ہے۔	۷۴	۹۵	دعوئے خدائی نہ کرد	۸۰
۸۰	خدا کا قرآن اور شیطان کا فلسفہ	۷۵	۹۶	مذہب کے قبول میں زیادہ دخل کس کو ہے؟	۸۱
۸۱	یہ سب ہے ایک ہستی کا ظہور	۷۵	۹۷	مادّے میں شعور کیسے پیدا ہوا؟	۸۱
۸۲	رنج و راحت قابل وقعت نہیں	۷۵	۹۸	عقل مانۂ ازل تک نہ پہنچ سکی	۸۱
۸۳	ذاتِ باری میں بحث بے سود ہے	۷۶	۹۹	ہستی سے قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا	۸۲
۸۴	نیچر کے مرید	۷۶	۱۰۰	جوش طاقت دلیل درازئ عمر نہیں	۸۲
۸۵	یورپ کا آسمانی باپ اور برق اور بھاپ	۷۷	۱۰۱	خیال عقبےٰ اور نار و جنت	۸۳
۸۶	دہ سیلنے ہم کالے	۷۷		باب ۵	
۸۷	نفس اور نیچر کو مخلوطانہ کرد	۷۷		لامذہبی	
۸۸	علم و خرد کے بت کی پرستش	۷۸	۱۰۲	یونی اور خرِ بے دُم	۸۵
۸۹	شیطان کا کوئی ممنون نہیں	۷۸	۱۰۳	منکرِ خدا کے فہم کا قصور	۸۵
۹۰	زندگی کس کی مرضی پر ہے	۷۹	۱۰۴	سرکار، چھٹکارا اور بے رونقئ دربار	۸۵
۹۱	ہم کو کس نے چلا رکھا ہے	۷۹	۱۰۵	فتح مذہب کی ہوگی	۸۶
۹۲	انجام موت ہے۔	۷۹	۱۰۶	اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ	۸۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۰۷	توحید نہیں ہوگی تو الحاد ہوگا	۸۶	۱۲۰	ناصح بہت اور عامل مفقود	۹۷
۱۰۸	دھرم نہیں رہا تو ذات بھی نہیں رہے گی	۸۷	۱۲۱	بال سفید۔ عمل سیاہ	۹۷
۱۰۹	مست ہونے سے بے ہوش رہنا اچھا	۸۷	۱۲۲	پتلون کو لنگوٹی کر دینے والی شراب	۹۸
۱۱۰	دنیا نے دین کو بھلا رکھا ہے	۸۷	۱۲۳	کینہ پروری بڑی بُری چیز ہے	۹۸
۱۱۱	دنیا طلبی کا ہنگامہ	۸۸	۱۲۴	ذلت کے جینے سے مرنا اچھا	۹۸
۱۱۲	شیطانی فلاسفی کی دی ہوئی آزادی	۸۸	۱۲۵	رشوت، عیاشی، خوشامد اور گستاخی	۹۹
۱۱۳	دین میں دل کو چھپا لیا۔	۸۸	۱۲۶	بے حیا سے مکار اچھا	۹۹
	باب ۶		۱۲۷	وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا	۹۹
	شیعہ سُنّی		۱۲۸	ہم رنگ سے ارتباط، بے میل سے احتراز	۱۰۰
۱۱۴	شیعہ سُنّی کی تفریق	۹۱	۱۲۹	مرنے کے بعد	۱۰۰
۱۱۵	چار یار اور پنج تن کی نیک نامی	۹۱	۱۳۰	حاسد کا احساس پستی	۱۰۰
۱۱۶	بنارس شیعہ کالج	۹۲	۱۳۱	دکتِ کیتنس اور تمّتْ بِالخَیْر	۱۰۱
۱۱۷	شیعہ سُنّی کے جھگڑے پر فیصلے	۹۴	۱۳۲	اثر انداز کہنا اور سننا	۱۰۱
	باب ۷		۱۳۳	اللہ پر بھروسہ رکھو	۱۰۱
	پند و موعظت		۱۳۴	اصلی دولت، زینت اور عزت	۱۰۱
۱۱۸	شراب شیطان کی پرائیویٹ سکریٹری	۹۷	۱۳۵	خوشی سے مرنا سیکھو	۱۰۲
۱۱۹	سعیِ بازو اور حسن تدبیر	۹۷	۱۳۶	اللہ کو دل میں بساؤ •	۱۰۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۳۷	ایمان کو مضبوط رکھو	۱۰۲
۱۳۸	خدا کی یاد میں دونوں جہان کا نفع	۱۰۳
۱۳۹	صوفی اور مُلّا کا اختلاف	۱۰۳
۱۴۰	تم کو خدا نے دیا ہے تو دوسروں کو بھی دو	۱۰۳
۱۴۱	نمود بے سود اور اچھل کود کو چھوڑ	۱۰۳
۱۴۲	ماں باپ کی رضا جوئی	۱۰۴
۱۴۳	قومی عزت نیکیوں سے ہے	۱۰۴
۱۴۴	نفس حریص کی غلامی	۱۰۴
	باب ۸	
	اخلاق و معاشرت	
۱۴۵	اصلی اور نقلی معاشرت	۱۰۷
۱۴۶	معیارِ عزت عمل نیک ہے	۱۰۷
۱۴۷	دولت و لذت، راحت و عزت	۱۰۸
۱۴۸	ترقیٔ باطن	۱۰۸
۱۴۹	رذیل فطرت، کثیف دل	۱۰۸
۱۵۰	علالتِ اخلاقی	۱۰۹

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۵۱	دولت و شہرت بڑھنے کا سودا	۱۰۹
۱۵۲	رنگین اور سادہ جھوٹ	۱۱۰
۱۵۳	حرص، قناعت، اور محنت	۱۱۰
۱۵۴	لیاقت، وجاہت اور شرافت	۱۱۱
۱۵۵	حد سے بڑھی ہوئی حرص اور خود بینی	۱۱۱
۱۵۶	حرص اور ہوس سے بے غیرتی پیدا ہوتی ہے	۱۱۱
۱۵۷	بے شرم و سرو مہر حسین	۱۱۲
۱۵۸	مذہب، ادب اور خاکساری	۱۱۲
۱۵۹	دل داریٔ و طلبگاریٔ دو دنیا	۱۱۲
	باب ۹	
	بصارۂ و حکم	
۱۶۰	نور لاہوت اور بھوت	۱۱۵
۱۶۱	نظری اور مصنوعی خوبی	۱۱۵
۱۶۲	درعمل کوش ہر چہ خواہی پوش	۱۱۶
۱۶۳	مذہبی غول بندی	۱۱۶
۱۶۴	پیرِ فرنگ کی حکمت	۱۱۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۶۵	کام میرا نام آپ کا	۱۱۷
۱۶۶	مُردہ زندگی	۱۱۷
۱۶۷	ذلیل اور بے غیرت دنیا	۱۱۷
۱۶۸	جینا اور مرنا	۱۱۸
۱۶۹	طاقت و عزت اور تعلیم و تربیت	۱۱۸
۱۷۰	حاضر و غائب خدا	۱۱۸
۱۷۱	عالم و عاقل	۱۱۹
۱۷۲	واقفیت کی آخری منزل	۱۱۹
۱۷۳	وہی غفلتیں اور وہی گلیلیں	۱۱۹
۱۷۴	الفاظ سے غلط فہمی	۱۲۰
۱۷۵	ظاہر اور باطن	۱۲۰
۱۷۶	ماضی و حال	۱۲۱
۱۷۷	حُسن کی طاقت سے مجبوری	۱۲۱
۱۷۸	بے ہوش اور سنہ سیئے ہوئے باہوش	۱۲۱
۱۷۹	اچھا رنگ ڈھنگ	۱۲۲
۱۸۰	حشمِ پینا کا قحط	۱۲۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۸۱	کامل کمِ اہل ارشاد بہت	۱۲۳
۱۸۲	انقلابات جہاں	۱۲۳
۱۸۳	سب خدا کے محتاج ہیں	۱۲۳
۱۸۴	راحت، عزت اور آدمیت	۱۲۴
۱۸۵	غفلت اور عبرت	۱۲۴
۱۸۶	زینتِ دنیا	۱۲۴
۱۸۷	دورِ فنا میں ہر بات برائے نام	۱۲۵
۱۸۸	سننے والے جتنے ہیں رونے والا کوئی نہیں	۱۲۵
۱۸۹	قدر شناس کی تحسین اور ناقدر شناس کی شاگردی	۱۲۵
۱۹۰	چمن دہر کو گلے کا ہار نہ بناؤ	۱۲۶
۱۹۱	عزم و عمل کی کمزوری	۱۲۶
۱۹۲	نہ دل پر میرا بس ہے نہ زبان پر	۱۲۶
۱۹۳	گرم جوشی ختم، سودائے خود فروشی رخصت	۱۲۷
۱۹۴	آبادی پر طاعون کا ٹیکس	۱۲۷
۱۹۵	تغیرات و انقلابات	۱۲۷
۱۹۶	سچی دوستی قابل قدر	۱۲۸

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۱۹۷	کہتا ہے کم آں جس کو حاصل ہے کمال	۱۲۸
۱۹۸	لغزش بے ارادہ	۱۲۸
۱۹۹	چرب زبانی اور خلوص	۱۲۹
۲۰۰	نیکی اور بدی۔ زندگی اور موت	۱۲۹
۲۰۱	راز دھر نہ کھلنے کا شکوہ	۱۲۹
۲۰۲	کام کا علم	۱۳۰
۲۰۳	تقدیر اور اتفاقات	۱۳۰
۲۰۴	سلطان، مسلمان اور شیطان	۱۳۱
۲۰۵	منزل عدم کے لئے ریل بے کار	۱۳۱
۲۰۶	موت کے بعد صرف اعمال کام آتے ہیں	۱۳۱
۲۰۷	انسان، ایمان اور مسلمان	۱۳۱
۲۰۸	شوق عزت، ذوق زینت، نذر ملت	۱۳۲
۲۰۹	دل، ایمان اور عاقبت	۱۳۲
۲۱۰	خلق خدا سے ملو مگر خدا کے واسطے	۱۳۲
۲۱۱	دل بہ یار، دست بہ کار	۱۳۳
۲۱۲	بڑے عمل کا مقصد بھی بڑا ہونا چاہیئے۔	۱۳۳
۲۱۳	خدا کا دفتر دیکھو	۱۳۴
۲۱۴	جو میسر ہے اُس پر قانع رہو	۱۳۴
۲۱۵	خود سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت	۱۳۵
۲۱۶	اصلی طاقت وعزت اور صحیح تعلیم وتربیت	۱۳۵
۲۱۷	فنا اور بقا کا راز	۱۳۵
۲۱۸	دنیائے دنی کی محبت	۱۳۶
۲۱۹	حد ادب	۱۳۷
۲۲۰	باپ دادا پر بے جا فخر	۱۳۷
۲۲۱	شکوہ اور شکایت کا وقت ختم	۱۳۸
۲۲۲	ذہنی انقلاب نے بے حجابات کو بجا کر دیا۔	۱۳۸
۲۲۳	شراب اور خودکشی	۱۳۸
۲۲۴	ابتدا سے رنجیدگی۔ انتہا سے بے حسی	۱۳۹
۲۲۵	"ہم" کا تصور چھوڑ دو۔ "میں" پر نظر رکھو	۱۳۹
۲۲۶	فضول بحث اور دنیا پسندی	۱۳۹
۲۲۷	مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق	۱۴۰
۲۲۸	جب تھے تو خوب تھے	۱۴۰

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۲۲۹	افسانہ گو خود افسانہ ہو گیا	۱۴۰
۲۳۰	عمر امروز و فردا ہی میں کٹتی ہے	۱۴۱
۲۳۱	لب خنداں زیادہ، دیدۂ تر کم	۱۴۱
۲۳۲	نگاہوں میں زمانے، زبانوں پر فسانے	۱۴۱
۲۳۳	صبر و قناعت کا حظ	۱۴۲
۲۳۴	ہم کچھ بھی نہیں ہیں	۱۴۲
۲۳۵	بحر ترقی میں خود ہی بہے جاتے ہیں	۱۴۲
۲۳۶	فلسفہ پرست بدھو	۱۴۳
۲۳۷	تعلی اور خاکساری	۱۴۴
۲۳۸	عارف کو بے ہوشی زیبا، عاقل کو خاموشی زیبا	۱۴۴
۲۳۹	زبان زندہ، دل مردہ	۱۴۴
۲۴۰	خضر نہیں غول بیابانی	۱۴۵
۲۴۱	اقبال مندی کا طاعت کی طرف میلان	۱۴۵
۲۴۲	اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو	۱۴۶
۲۴۳	صیاد کے لئے طرز نو کے جال	۱۴۶
۲۴۴	نیکلہ نشینوں سے قدر شناسی کی امید نہیں۔	۱۴۷
۲۴۵	تبر آزل اور بادہ فروش	۱۴۷
۲۴۶	نہ وہ نعرہ نہ وہ نالہ	۱۴۸
۲۴۷	غم اور خوشی کا سچا احساس	۱۴۸
۲۴۸	بے ثباتی دنیا سے عبرت	۱۴۹
۲۴۹	شخصی اور قومی زندگی	۱۴۹
۲۵۰	زور قلم کے سوا اور کوئی طاقت نہیں	۱۴۹
۲۵۲	پہلی کتابیں ردی، صاحب کا قول سچا	۱۵۰
۲۵۲	دوسروں کے عمل دیکھ کے خود کچھ نہ کیا	۱۵۰
۲۵۳	اندھیرے میں پامال ہونے سے جل کر مر جانا اچھا	۱۵۰
۲۵۴	زور حکومت کے بغیر مذہب محض ایک فلسفہ ہے	۱۵۱
۲۵۵	اعتدال کی چال	۱۵۱
۲۵۶	بلبل اپنی پیس دیتی ہے اور پروانہ جان	۱۵۲
۲۵۷	عقل کثیر اور حسن تدبیر	۱۵۲
۲۵۸	کفر کا علاج ممکن، نیٹویت جان کے ساتھ ہے	۱۵۲
۲۵۹	آپ بڑھے، ہم گھٹے	۱۵۳
۲۶۰	قوم نیچرل ہے وہ بن نہیں سکتی۔	۱۵۳

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۲۶۱	گریۂ زاہد کی نماز	۱۵۴
۲۶۲	دسترس رکھنا چاہو تو بے بس نہ بنو	۱۵۴
۲۶۳	ایشیا کی غفلت اور یورپ کی نظر	۱۵۴
۲۶۴	تقلید دہر	۱۵۵
۲۶۵	آزادی غیروں کی امیری کا نام نہیں ہے	۱۵۵
۲۶۶	نورِ عرفاں کے لئے قرارِ دل ضروری	۱۵۵
۲۶۷	ہم اور ہماری اولاد	۱۵۶
۲۶۸	جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی	۱۵۶
	باب ۱۰	
	قومیات اور سیاسیات	
۲۶۹	دوالے، رسالے، مسجد اور شوالے	۱۵۹
۲۷۰	نیٹو ہونے کا رنج۔ ممبر ہونے کی خوشی	۱۵۹
۲۷۱	انگریزوں کی بادشاہی میں مدّو اور ہندو	۱۶۰
۲۷۲	ہند میں شیخ جیسے گنگا میں اونٹ	۱۶۰
۲۷۳	شوق لیلائے سول سروس	۱۶۰
۲۷۴	خوش حالی سے بہرہ کرنے کے لئے بنگالی نکتہ	۱۶۱

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۲۷۵	مذہب کی کہو تو دل لگی، مطلب کی کہو تو پالیسی	۱۶۱
۲۷۶	جہاں تھے وہیں رہے بلکہ اور بدتر ہو گئے	۱۶۱
۲۷۷	یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا	۱۶۲
۲۷۸	باہر حشن۔ گھر میں فاقہ	۱۶۲
۲۷۹	ارتقائے حال و خیال	۱۶۲
۲۸۰	بڑا وہ جو صاحب سے ڈرے	۱۶۳
۲۸۱	سخن فہم کم۔ گزٹ فہم زیادہ	۱۶۳
۲۸۲	دل کو سنبھالے رکھنا بھی غنیمت ہے	۱۶۳
۲۸۳	معنی نہ سہی صورت تو وہ ہو	۱۶۴
۲۸۴	بے ایمانوں سے تعرض نہ کرو	۱۶۴
۲۸۵	نہ ملک اسلام، نہ ملک لچھمن و رام، یورپ کا گودام	۱۶۴
۲۸۶	قوم کے فاقے شبرات کے پڑاقے	۱۶۵
۲۸۷	نہ بھرم رہے گا نہ دھرم	۱۶۵
۲۸۸	جوانی میں عشق بتاں پیری میں عشقِ قوم	۱۶۵
۲۸۹	آزادیٔ رندانہ اور اسیریٔ فکرِ خانہ	۱۶۶
۲۹۰	پیٹ دوڑاتا ہے	۱۶۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۲۹۱	پاس کی فکر دور سے بے فکری	۱۶۶
۲۹۲	مذہبی بحث اور قومی اصلاح	۱۶۷
۲۹۳	ہر شخص بجائے خود ایک قوم	۱۶۷
۲۹۴	ننانوے کا پھیر	۱۶۷
۲۹۵	نہ علم دیں، نہ علم زمیں، بس فکرِ نانِ جویں	۱۶۸
۲۹۶	دشمن کے ہاتھوں میں نہ کھیلو	۱۶۸
۲۹۷	مشغلۂ یونیورسٹی	۱۶۸
۲۹۸	میل کی ضرورت نہیں	۱۶۹
۲۹۹	رسالے والوں کے دوانے	۱۶۹
۳۰۰	خان بننا ہو تو انگریزی خواں بنو	۱۶۹
۳۰۱	آنر کے لئے زبان درازی پڑی، روٹی کیلئے جائز	۱۷۰
۳۰۲	سب کو نوکری نہیں مل سکتی	۱۷۰
۳۰۳	صحت، روزی اور تسکینِ دل	۱۷۰
۳۰۴	اپنے ہی نفس کی غلامی	۱۷۱
۳۰۵	وسعتِ مشرب کے لئے تبدیلیٔ وضع ضروری نہیں	۱۷۱
۳۰۶	شان و شوکت کی نہیں راحت کی ضرورت ہے	۱۷۱

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۳۰۷	غذا میسر نہ ہو تو مانگ بیکار ہے	۱۷۲
۳۰۷ (الف)	ایک دوسرے کی توہین جہالت ہے یا نفسانیت	۱۷۲
۳۰۸	سرکاری خطاب کی دل کشی	۱۷۳
۳۰۹	سب کچھ کرے مگر قوم کا ہمدرد رہے	۱۷۳
۳۱۰	اصلی آزادی	۱۷۳
۳۱۱	خدا کی یاد، روٹی اور صفائی	۱۷۴
۳۱۲	دلِ مشرق کی بیتابی	۱۷۴
۳۱۳	تیری بھی کوئی صف ہے کہ نہیں	۱۷۴
۳۱۴	قومی غیرت کی کمی	۱۷۵
۳۱۵	دھنی بننے کے لئے کمپنی بننے کی ضرورت	۱۷۵
۳۱۶	وضع مغربی میں بھی دل مشرقی رکھو	۱۷۵
۳۱۷	قانون سے فائدہ اٹھانے کیلئے وفاداری کی ضرورت	۱۷۶
۳۱۸	پڑے رہو تو تل بجندا	۱۷۶
۳۱۹	جنگ کا تہیں بھنگ کا خیال	۱۷۶
۳۲۰	جاہ اور شاہ کے خواہاں	۱۷۷
۳۲۱	دل کی پھانسیں	۱۷۷

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۳۲۲	زمینداروں کی محتاجی	۱۷۷	۳۳۸	غیبت اور بدگمانی میں محبت کیسے قائم رہے	۱۸۵
۳۲۳	پیر ہمپیر ہونا آسان، علی برادر ہونا مشکل	۱۷۸	۳۳۹	نئی تحریروں سے دنیا کی بے چینی	۱۸۵
۳۲۴	چپ رہنے والا گردن زدنی، بولنے والا کافر	۱۷۸	۳۴۰	قوم کو قوت کی ضرورت ہے فربہی کی نہیں	۱۸۵
۳۲۵	دھوتی کی شکن اور تپلون کا بٹن	۱۷۹	۳۴۱	لفظی اور بے معنی قومیت	۱۸۶
۳۲۶	ہوائیں پھر وہی ہوں اور وہی امن	۱۷۹	۳۴۲	بے قوام کی قوم	۱۸۶
۳۲۷	خضاب پر سب کچھ واپس	۱۸۰	۳۴۳	عہدوں سے قوم نہیں بنتی	۱۸۶
۳۲۸	پنجاب کا بلوا بھی بُرا علی گڑھ کا حلوا بھی	۱۸۰	۳۴۴	قومی عزت و آسودگی کیونکر حاصل ہو	۱۸۷
۳۲۹	شملہ کا طرّہ	۱۸۱	۳۴۵	سب کچھ خدا کا وہم و گماں ہمارا	۱۸۸
۳۳۰	یہی غنیمت ہے کہ کھانے کو مل رہا ہے	۱۸۱	۳۴۶	جنہیں زور نہیں اُن کا مامن گور ہے۔	۱۸۸
۳۳۱	فیس اور ٹیکس کا خوف	۱۸۲		باب ۱۱	
۳۳۲	چندہ اور مردہ آخر میں	۱۸۲		**طنزیات**	
۳۳۳	مولانا کو مات اور مسٹر کو مساوات	۱۸۳	۳۴۷	جس کی لاٹھی اُس کی بھینس	۱۹۱
۳۳۴	زر اُن کا زور اُن کا علم و حکومت اُن کی	۱۸۳	۳۴۸	بیوی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب	۱۹۱
۳۳۵	پریوں کا عشق اور جنات کی غلامی	۱۸۴	۳۴۹	ہر مسلک میں ایک پخ	۱۹۱
۳۳۶	محنت، ہمت، حکمت اور قسمت	۱۸۴	۳۵۰	ہوائی گولا اور اپنا چولا	۱۹۲
۳۳۷	شیخ کا مصلے اور شاعر کی آرزوئے معلیٰ	۱۸۴	۳۵۱	تلخ مباحث اور شوخ شکر لب	۱۹۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۳۵۲	اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں	۱۹۳	۳۶۸	انگریز پرستوں کی آستاں بوسی	۱۹۹
۳۵۳	نہ معشوق نہ صندوق نہ بندوق	۱۹۳	۳۶۹	پرشاد اور مٹن دونوں تبرک	۲۰۰
۳۵۴	خدا کے تین ٹکڑے کر دینے والے	۱۹۴	۳۷۰	پنڈت اور مولوی سے گریجویٹ ہونا اچھا	۲۰۰
۳۵۵	نئی روشنی کے چند اماموں	۱۹۴	۳۷۱	قومی ترقی کی شناخت	۲۰۱
۳۵۶	لاحول کے انگریزی ترجمے کی ضرورت	۱۹۴	۳۷۲	بندہ اور بندی	۲۰۱
۳۵۷	طعنے اور گالیاں سننے کی بجائے قوالی سنو	۱۹۵	۳۷۳	زبانِ مِس پر قدرت	۲۰۲
۳۵۸	روٹی نہ ملی تو کیا کریں گے	۱۹۵	۳۷۴	بازمانہ بساز، یعنی سایہ کی جگہ پشواز	۲۰۳
۳۵۹	دو رُخی پالیسی	۱۹۶	۳۷۵	پھونک پھونک کر قدم رکھنے والوں کی کود پھاند	۲۰۳
۳۶۰	یہ مراقبہ ہے یا پینک	۱۹۶	۳۷۶	مئے گلگوں اور ریشِ سفید	۲۰۴
۳۶۱	کلیسا کا چوٹا	۱۹۷	۳۷۷	مفلسی میں آٹا گیلا	۲۰۵
۳۶۲	چندے کے پھندے	۱۹۷	۳۷۸	درگا بائی اور بی نصیبن	۲۰۵
۳۶۳	سودائے سفر لندن	۱۹۷	۳۷۹	نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا	۲۰۶
۳۶۴	چلیے اجمیر شریف	۱۹۸	۳۸۰	شیطان کا ہتک عزت کا نوٹس	۲۰۶
۳۶۵	اے۔ بی	۱۹۸	۳۸۱	ناول پڑھو اور پتلون و بوٹ پہنو	۲۰۷
۳۶۶	گریۂ بے سُر	۱۹۹	۳۸۲	نئی روشنی کے صوفی اور واعظ	۲۰۷
۳۶۷	ایک دوسرے کو پاجی کہنا حاجی کہنے سے بُرا ہے	۱۹۹	۳۸۳	پہلے چرخ کے رف رف اب کمسریٹ کا اونٹ	۲۰۸

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۳۸۴	نئی روشنی والے شب تاریک کے جگنو	۲۰۸	۴۰۰	تام کے مسلمان ہونے کی برکت	۲۱۵
۳۸۵	دنیا پر لات مارنے سے پہلے توٹ تو پیدا کرو	۲۰۹	۴۰۱	مضمون رہ گیا اور جوتا چل گیا	۲۱۶
۳۸۶	کھانے کے لئے متنجن رہنمائی کے لئے انجن	۲۰۹	۴۰۲	اُن کو لطف مستی آیا، ہم بدمستی سے اُلو ہو گئے	۲۱۶
۳۸۷	نان پاؤ بنیالی پلاؤ علی گڑھ کا بھاؤ	۲۱۰	۴۰۳	مغربی فانوس اور خرقہ سالوس	۲۱۷
۳۸۸	ڈبل روٹی کھاؤ اور کلرکی کی خوشی سے پھول جاؤ	۲۱۰	۴۰۴	غزالی اور رومی کی بجائے اسپنسر و مِل	۲۱۷
۳۸۹	اُنکی ٹوپوں میں کیڑے پڑیں	۲۱۱	۴۰۵	خالی خولی واہ واہ	۲۱۸
۳۹۰	شب فرقت حکومت سے فرصت	۲۱۱	۴۰۶	تعلیم مغربی سے قوم کے زنانوں کا پردہ کھل گیا	۲۱۸
۳۹۱	بسکٹ سے شیرمال اچھی	۲۱۲	۴۰۷	اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو	۲۱۹
۳۹۲	ممبری پر جنگ، سائیکل پر سواری	۲۱۲	۴۰۸	تو ہارے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم	۲۱۹
۳۹۳	زبان آتی ہے کان جاتا ہے	۲۱۲	۴۰۹	تسبیح پر درود کی بجائے ڈوبائی صاحب کی	۲۱۹
۳۹۴	آج کل کے شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں	۲۱۳	۴۱۰	جنّات کی خدمت، پریوں کی خوشامد	۲۲۰
۳۹۵	کارونیشن، ٹومار ونیشن	۲۱۳	۴۱۱	پل صراط کے لئے بائیسکل	۲۲۰
۳۹۶	بی نصیبن پڑھ کر بھی بی نصیبن ہی رہیں	۲۱۴	۴۱۲	لیلےٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ	۲۲۱
۳۹۷	شیخ جی دوست بھی غلام بھی	۲۱۴	۴۱۳	شیوخ شہر اور شیوخ کیمپ	۲۲۱
۳۹۸	انگریز خوش، ہند ونگن، ہم ڈسوں میں پول	۲۱۴	۴۱۴	رز نھیا ز رنذار، مس کی کثرت سیم گم	۲۲۲
۳۹۹	آب و دانے کی حکمرانی	۲۱۵	۴۱۵	جنّت میں فوٹو ہو تو دوزخ میں جانے کے لئے تیار	۲۲۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۴۱۶	اِس زمانے میں خدا کا ذکر	۲۲۳	۴۳۰	گاندھی جی سے شیخ جی کا میل	۲۳۱
۴۱۷	حباب اور موجوں کا ساتھ	۲۲۳	۴۳۱	گاندھی جی اور ہوم رول کی چاٹ	۲۳۱
۴۱۸	وظیفہ کی جگہ پانیر	۲۲۴	۴۳۲	تحریک سودیشی	۲۳۲
۴۱۹	مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے	۲۲۴	۴۳۳	صاحب حفاظت کریں اور ہم حکومت	۲۳۲
۴۲۰	نزع کے وقت لٰسین کے بجائے فوٹو	۲۲۵	۴۳۴	قید کی تکلیف سے بزرگی کا ثبوت	۲۳۳
۴۲۱	اولڈ بوائے کے بعد اولڈ گرل	۲۲۵	۴۳۵	ترک تعاون کا تجربہ	۲۳۳
۴۲۲	عزتیں اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ	۲۲۵	۴۳۶	گاندھی جی کا سوراج اور انگریز کا پیار	۲۳۴
۴۲۳	آبرو کی کجی اور کجی	۲۲۶	۴۳۷	حکومت پرست اور پیروان گاندھی	۲۳۴
۴۲۴	ممبری لیڈری اور مسٹری	۲۲۶	۴۳۸	گاندھی کیپ اور ترکی ٹوپی	۲۳۴
۴۲۵	سلک الموت کی زتند	۲۲۷	۴۳۹	گاندھی جی اور مالوی جی	۲۳۵
۴۲۶	اللہ کہیں تو واہ کہاں	۲۲۷	۴۴۰	گاندھی سے لڑے کون	۲۳۵
۴۲۷	خدا رسیدہ اور گورنمنٹ رسیدہ	۲۲۸	۴۴۱	ہماری حالت نزع اور ہوم رولیوں کی دھمکی	۲۳۶
۴۲۸	مسلم ختم، یونیورسٹی موجود	۲۲۸	۴۴۲	گاندھی جی کا وجد اور ہماری اُچھل کود	۲۳۶
	باب ۱۲		۴۴۳	پٹیں خوب اور سر نہ اٹھائیں	۲۳۷
	گاندھی جی اور اُن کی تحریکیں		۴۴۴	چُپ چاپ گزی کے تھان مُنو	۲۳۷
۴۲۹	گاندھی جی اور انگریز کی لڑائی	۲۳۱	۴۴۵	صاحب کے بیرے کا ہوم رول	۲۳۸

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۴۴۶	ملک سے رشتہ رکھنا ہے تو چرخہ بھی کاتو	۲۳۸	۴۶۰	عورتوں کو گھر کے لئے پڑھاؤ قوم کے لئے نہیں	۲۴۹
۴۴۷	عزیمت گاندھی وجہالت مغرب	۲۳۹	۴۶۱	مردی کی شرم کا پردہ اُٹھ گیا	۲۴۹
	باب ۱۳		۴۶۲	نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی بیبیاں	۲۴۹
	تعلیم نسواں و پردہ نسواں		۴۶۳	شوہر پرستی کی بجائے پبلک پسندی	۲۵۰
۴۴۸	مردوں کی عقل پر پردہ	۲۴۳	۴۶۴	بیگم پیچوان، لیڈی سگرٹ	۲۵۱
۴۴۹	زنے از پردہ بروں آید کارے بکند	۲۴۳	۴۶۵	یہ قوم کی عقدہ کشائی ہے یا پردہ دری	۲۵۱
۴۵۰	شوکت وغیرت اور لن ترانی ختم	۲۴۴	۴۶۶	بنائے عمارت فخر النسا کہیں در پردہ بے پردگی کی بنا نہ ہو	۲۵۲
۴۵۱	چالیس برس بعد	۲۴۴	۴۶۷	اچھے تخم کے لئے اچھے درختوں کی ضرورت	۲۵۲
۴۵۲	اُدھر حکومت کا سایہ اِدھر عزت کا پردہ	۲۴۵	۴۶۸	پردہ دردوں کا راز آشکار	۲۵۳
۴۵۳	حرم سرا کا مطلب حد ادب	۲۴۵	۴۶۹	پردہ ذریعۂ عزت و تمکنت	۲۵۳
۴۵۴	پردہ کے مخالف پیرانِ نابالغ	۲۴۶	۴۷۰	عورت کی شان کا ظہور	۲۵۳
۴۵۵	نئی تعلیم یافتہ بے پردہ لڑکیاں	۲۴۶	۴۷۱	نور اسلام کی حفاظت کے لئے فانوس پردہ کی ضرورت	۲۵۴
۴۵۶	قومی چادر کی نہیں کُھلتی جاتی ہیں	۲۴۷	۴۷۲	آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگی کل خراب	۲۵۴
۴۵۷	استاد ہونے چاہئیں۔ استاد جی نہیں	۲۴۷	۴۷۳	بے حجابی پڑوسی کے لئے نہیں، حکام رسی کے لئے	۲۵۸
۴۵۸	حجاب کے دن۔ نقاب کے دن	۲۴۸	۴۷۴	الاؤ پر فانوس نہیں رہ سکتا	۲۵۸
۴۵۹	میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلے	۲۴۸		باب ۱۴	

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
	نئی اور پُرانی تہذیب		۴۹۰	سول لائن اور شہر کی رہائش	۲۶۷
۴۷۵	شیطان کو بھی شیطان نہ کہو	۲۶۱	۴۹۱	زندہ تمام مُردے اور مُردوں سے بدتر زندے	۲۶۷
۴۷۶	قید مشرب وملت سے آزادی	۲۶۱	۴۹۲	نئی روشنی عارضی ہے اور پرانی پائیدار	۲۶۸
۴۷۷	بھوکا یہ بھی نہ کہے کہ میں بھوکا ہوں	۲۶۱	۴۹۳	عاشقی عقل کے ساتھ	۲۶۸
۴۷۸	اڈھنی اور ٹم ٹم، توال اور چھم چھم	۲۶۲	۴۹۴	ہم نہ رہے جان رہ گئی	۲۶۹
۴۷۹	نئی تہذیب کے انڈے	۲۶۲		باب ۱۵	
۴۸۰	پیری کی نابالغی کا انتظار	۲۶۳		نئی اور پرانی تعلیم	
۴۸۱	باپ کی لاحول اور ماں کی نوج پر خندہ زن	۲۶۳	۴۹۵	خان صاحب اور خانساماں صاحب	۲۷۳
۴۸۲	ہر پھول میں کانٹا	۲۶۳	۴۹۶	مغربی تعلیم کا اثر دلوں پر	۲۷۳
۴۸۳	مشرق غربی جھپیٹ میں	۲۶۴	۴۹۷	سعدی کا بھتیجا اور ملٹن کا غلام	۲۷۳
۴۸۴	کاش بچے پیدا ہی نہ ہوتے	۲۶۵	۴۹۸	اسکولی قوم	۲۷۴
۴۸۵	کالج کے پاس اور مسجد کے پاس	۲۶۵	۴۹۹	تعلیم جدید کا فتنہ	۲۷۴
۴۸۶	نکٹائی سے تو زُنار ہی اچھی تھی	۲۶۶	۵۰۰	بے غیرتی اور بے بصیرتی	۲۷۵
۴۸۷	آج کل کے لیڈر اور پہلے کے بزرگ	۲۶۶	۵۰۱	فارسی کے ساتھ اُردو بھی رخصت	۲۷۵
۴۸۸	لیونڈر اور عطر حنا	۲۶۶	۵۰۲	موجِ تسنیم کی بجائے وہسکی کی لہر	۲۷۶
۴۸۹	مرکزیت ختم ہو جانے کا اندیشہ	۲۶۷	۵۰۳	نہ بازوؤں میں قوت نہ دل میں نور	۲۷۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۵۰۴	بے نور کے تارے	۲۷۷	۵۱۸	تحصیلِ علوم کا نتیجہ مفلسی و گمنامی	۲۸۷
۵۰۵	طلب عہدہ اور الفتِ وطن	۲۷۷	۵۱۹	پھول کا پودا نہیں گلدان کا گلدستہ	۲۸۷
۵۰۶	فونوگرافی تعلیم	۲۷۷	۵۲۰	خود فروشی کے بغیر ہی انمول ہو گئے	۲۸۸
۵۰۷	مذاقِ قوم کو مذہب سے بیگانہ نہ ہونے دو	۲۷۸	۵۲۱	چندہ کی سلامی	۲۸۸
۵۰۸	گملوں ہی پر پھلنے والے لڑکے	۲۷۸	۵۲۲	پرانی روشنی بالائے طاق	۲۸۹
۵۰۹	کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی	۲۷۹	۵۲۳	قوم کے عشق میں ایک ہی دھن	۲۸۹
۵۱۰	ندوہ کو تو قبلہ رخ رہنے دو	۲۷۹	۵۲۴	یورپ کی پیری کے آگے کچھ نہ چلی	۲۸۹
۵۱۱	کاش ہم باپ اور کمیٹی میں آپ نہ ہوتے	۲۷۹	۵۲۵	جاگو ضرور مگر اللہ کا نام لے کر	۲۹۰
۵۱۲	دیوبند۔ ندوہ۔ اور علی گڑھ	۲۸۰	۵۲۶	نہ پڑھنے کا کوئی اصول، نہ پڑھنے کی کوئی راہ	۲۹۰
۵۱۳	تعلیم بازاری نقش سرکاری	۲۸۱	۵۲۷	کانگریس اور سرسید	۲۹۰
۵۱۴	کالج کا کاکاتوا	۲۸۲	۵۲۸	ارکانِ لیگ میں تخفیص علیگ	۲۹۱
۵۱۵	احیار زبان سنسکرت	۲۸۳	۵۲۹	علی گڑھ کالج۔ لندن کی مسجد	۲۹۱
۵۱۶	غل مچانے والوں کے استاد تو آپ ہی ہیں	۲۸۳	۵۳۰	آپ نے اپنے باپ سے سیکھا ہے ہیں نے آپ سے	۲۹۱
	باب ۱۶		۵۳۱	چھوٹنے لگے تو بڑے تھے چھلے نہیں	۲۹۲
	علی گڑھ کالج اور سرسید		۵۳۲	حضرت سید دے گئے مذہب میں لوچ	۲۹۳
۵۱۷	سٹرابیہ کی بجائے سٹرلماسٹر	۲۸۷	۵۳۳	خدمتِ سرسید میں حاضری	۲۹۳

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ	نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۵۳۴	حکام کی عینی نفسی سے اعضار کالج کی زندگی	۲۹۳	۵۴۸	ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم	۳۰۲
۵۳۵	نبیوں میں کوئی پنشن یافتہ نہیں ہوا	۲۹۴	۵۴۹	نئی روشنی کے پروانے	۳۰۲
۵۳۶	بت خانہ کو اپنا کر لیا	۲۹۴	۵۵۰	بے بصیرتی، بے ہمتی اور بے دینی	۳۰۲
۵۳۷	سرسید بڑے کام کرنے والے تھے	۲۹۵	۵۵۱	نئی روشنی خوشنما تو ہے مگر بے اصول	۳۰۳
۵۳۸	پڑھے لکھے مسلمانوں میں جنگ	۲۹۵	۵۵۲	گورے کو نہ بنانا سالا	۳۰۳
	باب ۱۷		۵۵۳	ہوٹل میں عیش، ہسپتال میں ہائے ہائے	۳۰۳
	تقلیدِ فرنگ		۵۵۴	نماز روزہ خلاف فیشن	۳۰۴
۵۳۹	صرف نقالی	۲۹۹	۵۵۵	بیلی اسکول مسٹرس اور فیس ریڈر	۳۰۴
۵۴۰	دن کو کچہری کی مسلیں، رات کو تاریخ اسلام	۲۹۹	۵۵۶	آزادی و تقلید بے جا کی یورش	۳۰۵
۵۴۱	دل آگیا نٹ پر	۲۹۹	۵۵۷	حکومتی کیمپ کا چکر	۳۰۵
۵۴۲	نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے ہوئے	۳۰۰	۵۵۸	مشین میں اُلجھے ہوئے گھسٹ رہے ہیں	۳۰۵
۵۴۳	یورپی قال کا حال	۳۰۰	۵۵۹	نہ تو رول ہے نہ شمع مزار ہے	۳۰۶
۵۴۴	شوقِ ترقی سبب تباہی	۳۰۰	۵۶۰	مسلموں کے حرم میں انگلش لیڈیاں	۳۰۶
۵۴۵	جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں	۳۰۱	۵۶۱	رگوں میں وہ خون ہی نہ رہا	۳۰۶
۵۴۶	آنکھوں میں عینک منہ میں مصنوعی دانت	۳۰۱	۵۶۲	فلک کو کد ہے کہ بگڑ دو اور بگاڑ دو	۳۰۷
۵۴۷	کیک نے روٹی اور پتلون نے لنگوٹی بھی کھوئی	۳۰۱	۵۶۳	مغربی چکر	۳۰۷

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۵۶۴	لاالٰہ موجود الا اللہ غائب	۳۰۸
۵۶۵	ہانڈی سرد مذہب پر آنچ	۳۰۹
۵۶۶	بتانِ کلیسا کی مریدی	۳۱۰
۵۶۷	میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں	۳۱۰
	باب ۱۸	
	انگریز اور انگریزی حکومت	
۵۶۸	الحاد کی طرف میلان	۳۱۳
۵۶۹	قسمت نہ لڑنے کا باعث انگریز کی خوش انتظامی	۳۱۳
۵۷۰	انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ	۳۱۳
۵۷۱	ہندی کی نجات مشکل ہے	۳۱۴
۵۷۲	انگریزی حکومت میں ترقی کی معراج	۳۱۴
۵۷۳	ابتری معاشرت کا ذمہ دار کون ہے	۳۱۵
۵۷۴	انگریز مہربان نہ ہوں تو نہ سرسید کچھ کر سکتے ہیں نہ حالی	۳۱۵
۵۷۵	پہلے آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے اب خون نکل رہا ہے	۳۱۵
۵۷۶	اپنے ہمنشیں بھی رقیبوں کے مصاحب ہو گئے	۳۱۶
۵۷۷	گنگی کی بجائے پنی، دین گیا تو دنیا بھی چھنی	۳۱۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	نمبر شمار
۵۷۸	اب گریجویٹوں کی قدر ہے یا میٹوں کی	۳۱۶
۵۷۹	منصفی کا دروازہ بھی بند	۳۱۷
۵۸۰	انگریزوں پر مشرقی ہوا کا اثر	۳۱۷
۵۸۱	راہِ رزق میں کانٹے	۳۱۷
۵۸۲	اپنی زبان سکھانے کا مقصد	۳۱۸
۵۸۳	برٹش اقبال کو اپنا اقبال نہ سمجھو	۳۱۸
۵۸۴	انگریز کا رعب داب	۳۱۸
	باب ۱۹	
	ہندی مسلمان اور ہندو مسلمان	
۵۸۵	کھانے کو پپیتا، دل بڑھانے کو گیتا	۳۲۱
۵۸۶	تدبیر ناکام، تقدیر بدنام	۳۲۱
۵۸۷	قومی، مذہبی، یا روحانی	۳۲۱
۵۸۸	ہندی مسلم میں ہند کی نیو	۳۲۲
۵۸۹	نسخۂ گاؤزبان کی مضرت	۳۲۲
۵۹۰	آپس میں ملتے بھی ہیں اور لڑتے بھی ہیں	۳۲۳
۵۹۱	لڑو مگر ایک رہو	۳۲۳

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۵۹۲	ہندو زر کے لئے عزت چاہتا ہے اور مسلمان عزت کیلئے زر	۳۲۳
۵۹۳	ہم خیالی نہ ہونے سے آپس میں دشمنی کیوں ہو	۳۲۴
۵۹۴	شیخ جی کی پالیسی مجو صاحب کی مرضی"	۳۲۴
۵۹۵	مسلم کی رکاکت آمیز پالیسی اور ہندو کی خوفناک ترنگ	۳۲۵
۵۹۶	مشرقی تعصب، مغربی پالیسی	۳۲۵
۵۹۷	بچنا انگریز سے چاہیئے یا ہندو سے	۳۲۵
۵۹۸	گائے کا گوبر اور اونٹ کی مینگنی	۳۲۶
	باب ۲۰	
	اُردو اور ہندی	
۵۹۹	اُردو کی حمایت اخبار البشیر میں	۳۲۹
۶۰۰	اُردو سے ہندی رو گئی	۳۲۹
۶۰۱	اُردو میں عربی اور ہندی میں سنسکرت	۳۳۰
۶۰۲	ہمدم اور لیڈر کی بحث	۳۳۰
۶۰۳	خوب مل کر لڑی زباں سے زباں	۳۳۱
۶۰۴	تین چوتھائی اُردو کے مالک ہندو ہیں	۳۳۱
۶۰۵	اُردو کو عربی اور بھاشا بنانے کی کوشش	۳۳۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
	باب ۲۱	
	ادبی چٹکلے اور شعری لطائف	
۶۰۶	چاہ ذقن اور گیسو کا جال	۳۳۵
۶۰۷	ہیں فرشتہ نہ کہار	۳۳۵
۶۰۸	خیال عاشق کی نیک معاشی	۳۳۵
۶۰۹	چینِ جبیں اور دلِ زار	۳۳۶
۶۱۰	داغِ دل کا روبی (لعل) اور اشک کا پرل (موتی)	۳۳۶
۶۱۱	کیا خوب کہلے ہے۔ آداب بجا لاتا ہوں	۳۳۶
۶۱۲	عشق نوازی	۳۳۷
۶۱۳	گوالن کا عشق کونڈے کی آگ	۳۳۷
۶۱۴	آپ کالا لوگ	۳۳۷
۶۱۵	چہرے کی ڈاڑھی یا فرد کی تفصیلِ ذیل	۳۳۸
۶۱۶	ڈیر کلو	۳۳۸
۶۱۷	کاسۂ سر یا چولہے پر توا	۳۳۹
۶۱۸	سب بول ڈالیئے	۳۳۹
۶۱۹	ڈاڑھی کبھی پیٹ کی طرف جاتی ہے	۳۳۹

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۲۰	بے زر عشق ٹیں ٹیں	۳۴۰
۶۲۱	فراقِ یار	۳۴۰
۶۲۲	بتانِ گمراہ بہ گردِ حبیب اللہ	۳۴۰
۶۲۳	شملہ بمقدارِ علم	۳۴۱
۶۲۴	درپناہِ من بیا	۳۴۱
۶۲۵	سورج کی ڈاڑھی	۳۴۱
۶۲۶	مدہوشِ لذت	۳۴۲
۶۲۷	نوشتۂ تقدیر سے بے خبری	۳۴۲
۶۲۸	لیلیٰ کی صورت کا تصوّر	۳۴۳
۶۲۹	مچھر اور طاعون	۳۴۳
۶۳۰	میرے اندر میں کام کرتا ہے	۳۴۴
۶۳۱	مس کے لینے میں سٹیک	۳۴۴
۶۳۲	سلونو، نونو اور خونو	۳۴۴
۶۳۳	ہولی بائیبل	۳۴۵
۶۳۴	کھچڑی ڈاڑھی اور زرش روئی کی چٹنی	۳۴۵
۶۳۵	انرجی، بیزرجی، وقت ڈنرجی	۳۴۶

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۳۶	او بہ فکرِ عجبے من بہ خیالِ عجبے	۳۴۶
	باب ۲۲	
	شعر و شاعری	
۶۳۷	شاعروں کا نالۂ موزوں	۳۴۹
۶۳۸	غیر فطری شاعری	۳۴۹
۶۳۹	وقت نے شاعروں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے	۳۵۰
۶۴۰	آج کل کی شاعری	۳۵۰
۶۴۱	آرائشِ الفاظ	۳۵۱
۶۴۲	شاعری کی تین قسمیں	۳۵۱
۶۴۳	کلامِ حافظ و فردوسی کی بجائے باضابطہ لٹریچر	۳۵۲
۶۴۴	کام کی اور کھیل کی شاعری	۳۵۲
۶۴۵	شاعروں کا مذہب	۳۵۳
	باب ۲۳	
	اکبر اور اُن کی شاعری ریزبانِ خویش	
۶۴۶	صاحب کی محفل اور اکبر کے احباب	۳۵۷
۶۴۷	بزمِ اکبر سے اعراض	۳۵۷

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۴۸	پیری آئی ہوئی جوانی رخصت	۳۵۷
۶۴۹	اکبر کے اشعار کا اثر ہوگا مگر ٹھوکریں کھا کر	۳۵۸
۶۵۰	اکبر کی، ایک ہی رٹ	۳۵۸
۶۵۱	کنجِ تنہائی اور خدا کا دھیان	۳۵۸
۶۵۲	نظارۂ شاہدِ معنی	۳۵۹
۶۵۳	دل و دماغ بے قابو	۳۵۹
۶۵۴	نظمِ اکبر دافعِ سحر و کفر	۳۵۹
۶۵۵	عام شاعروں کی پیروی	۳۶۰
۶۵۶	انقلابِ زمانہ کا اثر اکبر پر	۳۶۰
۶۵۷	زبان تیغ کے بجائے عصا ہو گئی	۳۶۰
۶۵۸	واہ واہ کے لیے لفظوں کی دوکان	۳۶۱
۶۵۹	شیخ و سید کی ذات سے خطاب	۳۶۲
۶۶۰	دل کو گرم رکھنے والا نغمہ	۳۶۲
۶۶۱	بلبل کو بے سُرا کہنے والے	۳۶۳
۶۶۲	بچپن کی دُھن میں بُتِ طناز کی تردید	۳۶۳
۶۶۳	دلِ رنگین کا خون	۳۶۳

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۶۴	شیطان پر طعن کا طعنہ	۳۶۴
۶۶۵	مقرر کردہ حدودِ شاعری	۳۶۴
۶۶۶	شاہدِ معنی پر ظرافت کا لباس	۳۶۵
۶۶۷	اکبر کے کلام سے ناواقفی	۳۶۵
۶۶۸	کہتے بھی خوب ہیں سنتے بھی خوب ہیں	۳۶۶
۶۶۹	عارفانہ شاعری کے متعلق بدگمانی	۳۶۶
	باب ۲۴	
	ذاتیات	
۶۷۰	نواب محسن الملک کی کارگزاری	۳۶۹
۶۷۱	ڈاکٹر مینارڈ کی مہارتِ فن	۳۶۹
۶۷۲	مدرسۃ البنات کان پور اور منشی رحمت اللہ رعد	۳۷۰
۶۷۳	نواب محسن الملک مرحوم کی رہنمائی	۳۷۰
۶۷۴	ایڈیٹر حبل المتین سے معذرت	۳۷۱
۶۷۵	مولوی محمد کریم صاحب کی بھیجی ہوئی مچھلی	۳۷۱
۶۷۶	ایک دوست کی غلط فہمی	۳۷۱
۶۷۷	مولانا شبلی کو کھانے کی دعوت	۳۷۲

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۷۸	مولانا شبلی کی شمس العلمائی	۳۷۲
۶۷۹	سر سلیمان جج ہائی کورٹ	۳۷۳
۶۸۰	منشی بگن پرشاد	۳۷۴
۶۸۱	لالہ نہال چند	۳۷۴
۶۸۲	منشی نثار حسین سے آموں کی فرمائش	۳۷۵
۶۸۳	حافظ محمد حسین اور نواب محسن الملک	۳۷۵
۶۸۴	حضرت اکبر کے چند قابلِ قدر دوست	۳۷۶
۶۸۵	سیّد عشرت حسین سے خطاب	۳۷۷
۶۸۶	راجہ صاحب محمود آباد کی قدر شناسیِ کلام اکبر	۳۷۷
۶۸۷	مولانا حسرت موہانی	۳۷۸
۶۸۸	مولوی عبد الکافی صاحب اور الٰہ آباد کی مسجد	۳۷۹
۶۸۹	خواجہ حسن نظامی صاحب	۳۷۹
۶۹۰	مولوی عبد الماجد دریابادی	۳۸۰
۶۹۱	مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ یو۔پی	۳۸۱
۶۹۲	سید عشرت حسین کا بنگلہ	۳۸۲
۶۹۳	محمد موسیٰ صاحب کی بھیجی ہوئی کیچیاں	۳۸۲

باب ۲۵
نوحے، تہنیتیں اور مادہ ہائے تاریخ

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۶۹۴	بر وفات سید محمود مرحوم	۳۸۵
۶۹۵	بر وصال مولانا محمد حسین الٰہ آبادی مرحوم	۳۸۵
۶۹۶	تاریخِ وفات والدہ صاحبہ سید عشرت حسین	۳۸۶
۶۹۷	مادۂ تاریخ ولادت سید ہاشم	۳۸۶
۶۹۸	مادۂ تاریخ ولادت سید عقیل ابن سید عشرت حسین	۳۸۶
۶۹۹	تاریخ وفات جناب سید تفضل حسین صاحب پدر حضرت اکبر	۳۸۷
۷۰۰	بر وفات سید ہادی علی صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ الٰہ آباد	۳۸۷
۷۰۱	نوحۂ وفات عثمان پرشاد پسر مہاراجہ کرشن پرشاد	۳۸۷
۷۰۲	بر وفات مولانا شبلی نعمانی	۳۸۸
۷۰۳	بر وفات والدۂ ڈاکٹر اقبال	۳۸۹
۷۰۴	بر وفات سید ہاشم	۳۹۰
۷۰۵	بر ولادت و وفات پسر سید عشرت حسین	۳۹۰
۷۰۶	بر وفات شمیم فاطمہ صاحبہ دختر مفتی افتخار حسین صاحب	۳۹۰
۷۰۷	قطعہ تاریخ وفات سید مہدی حسن صاحب	۳۹۱

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۷۰۸	قطعہ تاریخ وفات بی بوٹا صاحبہ زوجۂ ثانی حضرت اکبر	۳۹۲

باب ۲۶
تقریظات

نمبر شمار	اشارہ مضمون	صفحہ
۷۰۹	ایڈیٹر صاحب رسالہ ید بیضا کے نام	۳۹۵
۷۱۰	شاہی کیوڑہ کی تعریف میں	۳۹۵
۷۱۱	ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کی تعریف	۳۹۶
۷۱۲	ایم۔ آر۔ آرزو کا بنولے کا تیل	۳۹۶
۷۱۳	نقی محمد خاں صاحب کی تصنیف پر قطعہ تاریخ	۳۹۶
۷۱۴	تقریظ کتاب "المجیبۂ اسرار"	۳۹۷
۷۱۵	تقریظ کتاب "ہدیہ حیدری"	۳۹۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کُلّیات اکبر کی نئی ترتیب

کلیات اکبر الٰہ آبادی سالہا سال سے نایاب ہوگئی تھی اس لئے عالی مرتبت جناب چوہدری نذیر احمد خاں صاحب، صدر بزم اکبر نے مجھے ہدایت فرمائی کہ نئی ترتیب کا خیال پھر کر لینا، کلیات جیسی پہلے چھپتی رہی ہے، ایک دفعہ فوراً اسے ویسا ہی چھاپ دینا چاہیئے۔

چنانچہ تین حصے کلیات اکبر کے پیش کئے جا چکے ہیں۔ پہلا حصہ ایک جلد میں اور دوسرا اور تیسرا حصہ دوسری جلد میں ـــ چوتھا حصہ اور گاندھی نامہ وغیرہ اور بقیہ تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام خدا کو منظور ہوا تو تیسری جلد میں آجائے گا۔

اگرچہ تبدیلی نہیں کی، تاہم تھوڑا بہت فرق کلیات کے سابقہ ایڈیشنوں اور بزم اکبر کے شایع کردہ ایڈیشنوں میں ضرور ہے۔ کم از کم لکھائی چھپائی اور جلد بندی کا فرق۔

بزم اکبر کی شائع کردہ جُملہ کتابیں مجلّد ہیں اور اس قدر شاندار کہ شاندار سے شاندار کتابوں کے برابر رکھی جاسکتی ہیں۔

ترتیب کو زیادہ چھیڑے بغیر کلیات اکبر شایع کر دینے کے بعد نئی ترتیبوں کا دور آپہنچا اور اس دور کا ثمر اوّل قطعات و رباعیات اکبر کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ قطعات و رباعیات اکبر کا ایک حصہ ہے۔ دوسرا حصہ انشاء اللہ جلد ملاحظہ سے گزرے گا۔ قطعات و رباعیات اکبر ابھی نصف باقی ہیں۔

قطعات و رباعیات اکبر کی کلیات سے چھنٹائی اختر انصاری صاحب اکبر آبادی نے فرمائی ہے اور ان کی تبویب، ترتیب، تشریح، عنوانات قایم کرنا اور فہرست بنانا سب جناب بھیا احسان الحق صاحب کے کام ہیں۔

بزم اکبر بھیا کی از حد ممنون ہے کہ انہوں نے اپنے علم و فضل اور اپنی اہلیت و صلاحیت سے بزم کو فایدہ اٹھانے کا موقع بخشا۔

اختر انصاری صاحب کی مستعدی اور حضرت اسد ملتانی کے مشوروں کی بھی بزم شکرگزار ہے۔ حقیقتاً تجویز اسد صاحب کی تھی جسے میں نے اختر انصاری صاحب سے شروع اور بھیا سے مکمل کرایا۔

مسٹر شتاق احمد، معتمد بزم اکبر خاص میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ جس طرح عزت مآب جناب سردار عبد الرب صاحب نشتر نے کلیات اکبر حصہ دوم و سوم کی اشاعت میں دست گیری کی تھی اسی طرح شتاق احمد صاحب نے قطعات و رباعیات اکبر کی اشاعت میں ہمت دکھائی اور ہمت بندھائی۔ حالات ایسے بگڑے تھے کہ شتاق احمد صاحب بزم کے سکریٹری نہ ہوتے تو قطعات و رباعیات اکبر کا مسودہ پڑا ہی رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی بابت تو کہنا کیا ہے ؎

جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

۲۶ رجب ۱۳۷۱ھ
۲۲ راپریل ۱۹۵۲ء

محمد واحدی
ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف، بزم اکبر۔ کراچی

عذر تقصیر خدمت

حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام سے تھوڑی بہت دل چسپی تو مجھے اُس زمانہ میں ہوگئی تھی جبکہ میں نے علمی و ادبی شعور کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کیونکہ جس مشرقی ثقافت و تہذیب اور جن مذہبی خیالات و رجحانات کا رنگ حضرت اکبر کے اشعار میں نمایاں تھا تقریباً اُسی تہذیب کے ماحول میں میں نے ہوش سنبھالا تھا اور اُن ہی خیالات و رجحانات کے زیر سایہ میں نے تربیت پائی تھی۔ پھر جب شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب سے جو حضرت اکبر کو اپنا معنوی استاد سمجھتے اور کہا کرتے ہیں میری نیازمندی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یعنی اب سے تقریباً ۴۵ سال قبل، تو حضرت اکبر کے کلام ہی کے ساتھ نہیں بلکہ اُن کی ذات کے ساتھ بھی میری عقیدتمندانہ دل چسپی بڑھتی رہی جو ابھی تک موجود ہے۔ اگرچہ میرے ذہنی اور اعتقادی انقلاب کی وجہ سے اُس کی نوعیت میں کافی تبدیلی ہوگئی ہے۔

کراچی میں بزم اکبر قائم ہونے پر میرے شفیق مکرم جناب مُلّا واحدی صاحب اور عزیز محترم جناب شتاق احمد صاحب وحدی کے وہ گشتی اعلانات و بیانات مجھ کو بھی دہلی میں پہنچے جو حالات و کلام اکبر کی فراہمی و اشاعت کے مقصد سے شائع کئے گئے تھے اور اس سلسلہ کی خط و کتابت میں واحدی صاحب نے مجھ کو لکھا کہ کلام اکبر کی تبویب و تفصیل کا کام

میں اپنے ذمہ لے لوں، یعنی کلام اکبر کو ان کے مطالب و مقاصد کی مناسبت کے لحاظ سے مناسب ابواب و فصول کے تحت ترتیب دیدوں۔ میں بیوی بچّوں کے کراچی چلے آنے کی وجہ سے دہلی میں تنہائی اور غیر دل جمعی کی زندگی گزار رہا تھا۔ میرا عزیز کتب خانہ، جو مجھ جیسی حیثیت کے شخص کے لئے بیش قیمت بھی تھا، ۱۹۴۷ء کے نامراد فسادات دہلی کی نذر ہو چکا تھا۔ کلیات اکبر کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔ مگر چونکہ کلام اکبر کا کافی حصہ میری نظر سے گزرا ہوا تھا اس لئے مجھے اندازہ تھا کہ اگر کلام اکبر کی صحیح معنوں میں کوئی تبویب و تفصیل کی گئی تو بہت سی نظموں ہی کو نہیں بلکہ بہت سے شعروں کو بھی مختلف مطالب و مقاصد کا حامل ہونے کی وجہ سے کئی کئی بابوں اور فصلوں میں درج کرنے کی ضرورت پڑے گی اور اس طرح یہ ایک خاصا لمبا اور فرصت طلب کام ہو جائے گا۔ جو قیام دہلی کے زمانہ میں مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے میں نے افسوس کے ساتھ واحدی صاحب کو لکھ دیا کہ میں بزم اکبر کی یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں۔

شروع مئی ۱۹۵۱ء میں جب میں مستقل طور پر دہلی سے کراچی آگیا تو واحدی صاحب سے ملنے جلنے، تبادلہ خیالات کرنے اور جو کام بزم اکبر کے سلسلہ میں ہو چکا تھا یا ہو رہا تھا اس کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دیکھا کہ واحدی صاحب بزم اکبر کے نگران تالیف و اشاعت ہونے کی حیثیت سے بھی اپنی قدیم میانہ روی و عمل پسندی کی عادت کے مطابق طلب کل، کی ہوس سے فوت کل کے خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتے اور کچھ ہو جانے کو نہ ہونے سے بہر حال غنیمت سمجھتے ہیں۔ یعنی اُن کا مطمح نظر یہ نہیں ہے کہ جو کام بھی اُن کے ہاتھ سے نکلے یا اُن کی نگرانی میں تکمیل تک پہنچے وہ ہمہ وجوہ مکمل اور ہر لحاظ عیوب و نقائص سے پاک ہو۔ بلکہ وہ "مصلحت ہیں وکلا آساں کن" کے حکیمانہ اصول کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ بزم اکبر کے سلسلہ میں جو کام بھی اُن کے اور اُن کے رفقاء کار کی امکانی کوشش سے بہ آسانی ہو سکے

وہ ہو جائے۔ تاکہ بزم اکبر بھی بہت سی دوسری علمی و ادبی بزموں کی طرح محض نام کی بزم ہو کر نہ رہ جائے اور کچھ نہ کچھ کرتی رہے۔ اگر وہ اپنے بلند مقاصد تک دوڑ کر نہ پہنچ سکے تو کم از کم ان کی طرف استقلال سے بڑھتی تو رہے۔

واحدی صاحب جتنے عملی اور استقامت پسند ہیں بدقسمتی سے میں اتنا ہی غیر عملی اور متلوّن مزاج واقع ہوا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں کچھ نہیں کرتا، یا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ واحدی صاحب ہر ذمہ داری کے کام کو ایسی عملی سلامت روی اور استقلال سے کرتے ہیں کہ ان کی کوششوں کے بُرے بھلے نتائج جلد سامنے آجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں۔ خصوصاً تالیف و تصنیف کے کام میں۔ اُس کے متعلق شروع ہی سے میرے ذہن میں کوئی ایسا بلند معیار قائم ہو جاتا ہے جو اُس کام کی انجام دہی میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتا رہتا ہے اور محض بلندی معیار کی وجہ سے اکثر وہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ لیکن بزم اکبر کا جو کام واحدی صاحب ازراہ خلوص و محبت مجھ سے لینا چاہتے تھے اُس کی انجام دہی میں واحدی صاحب کی میانہ روی و استقلال پسندی نے میری ہمت بندھائی اور واحدی صاحب کے طریق کار کو سامنے رکھ لینے سے میری، بے عملی نے بھی کم از کم ایک بدعملی کی شکل اختیار کر ہی لی جسے میں معذرت و ندامت کے ساتھ اس مُرتّبہ کی شکل میں بزم اکبر کی طرف سے شائقین کلام اکبر کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جہاں تک قطعات و رباعیات اکبر کی تبویب و ترتیب کا تعلق ہے اس میں اگرچہ منطقی تقسیم اور جامعیت و مانعیت کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ ناقص و نامکمل تبویب و ترتیب بھی اُن حضرات کے لئے کافی مفید ثابت ہوگی جو کسی خاص موضوع یا مضمون پر حضرت اکبر کے خیالات اور اُن کی جولانی بائے فکر کو یکجا

دیکھنا چاہتے ہیں یا جن کی یہ خواہش ہے کہ کلام اکبر کی تدوین و اشاعت میں ایسی ترتیب ملحوظ رکھی جائے کہ کسی مطلوبہ قطعہ یا رباعی کی تلاش میں اُن کو ورق گردانی کی زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ میں نے قطعات و رباعیات اکبر کی تدوین و ترتیب اس طرح پر کی ہے کہ اہم مطالب و مضامین کے اشتراک کے لحاظ سے ان کو بابوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ مگر فصلیں قائم کرنے کی کوشش مجھ کو مقصد کے لحاظ سے زیادہ مفید معلوم نہیں ہوئی اس لئے بجائے فصلیں قائم کرنے کے میں نے ہر ایک قطعہ اور رباعی کے لئے ایک جداگانہ عنوان ایسا تجویز کر دیا ہے جو اُس قطعہ یا رباعی کے اہم مضمون ہی کی طرف نہیں بلکہ اس کے نمایاں الفاظ کی طرف بھی رہنمائی کر رہا ہے، تاکہ کتاب کی مکمل فہرست مضامین میں بابوں کی سُرخیوں کے نیچے ہر قطعہ اور رباعی کا جداگانہ عنوان بھی درج ہو جانے سے اس قطعہ یا رباعی کا تلاش کرنا شائقین کے لئے آسان ہو جائے اور فہرست مضامین پر سرسری نظر ڈالنے سے مضامین و مطالب کتاب کا ایک مکمل خاکہ قارئین کتاب کے ذہن میں آجائے۔

جو ابواب قطعات و رباعیات اکبر کے لئے قائم کئے گئے ہیں اُن ہی کے تحت میں یا صرف چند نئے ابواب کے اضافہ کے بعد حضرت اکبر کی بہت سی باقی ماندہ نظموں کے اشعار بھی درج کئے جا سکتے ہیں۔ اور کلام اکبر خصوصاً اکبر کے اصلاحی اور تبلیغی کلام کی اشاعت کا حقیقی مقصد جب ہی پورا ہو سکتا ہے کہ حضرت اکبر کے منتخب اشعار کا ایک ایسا مختصر مجموعہ ابواب و فصول کے ماتحت ترتیب دے کر شائع کیا جائے جس میں قومی و ملی مقاصد و خیالات سے تعلق رکھنے والے وہ تمام بلند پایہ اشعار یکجا کر دیئے جائیں جو کلیات کی مختلف جلدوں میں منتشر ہیں۔ خواہ وہ غزلوں یا مسلسل نظموں کی شکل میں ہوں، یا قطعات و رباعیات و ابیات کی شکل میں۔

ابتداءً واحدی صاحب نے قطعات و رباعیات اکبر کی صرف تبویب و تدوین کا کام میرے سپرد کیا تھا

اور یہ کام میرے لئے زیادہ دشوار بھی نہیں تھا۔ مگر قطعات و رباعیات کی تبویب و تدوین کے سلسلہ میں مجھ کو کافی اشعار ایسے ملے جن کے مطالب و مقاصد اور محاسن شعری و ادبی کی طرف میرا ذہن بآسانی منتقل نہیں ہو سکا اور میں نے یہ سوچا کہ اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کرنے والوں میں کم از کم پچھتر فی صدی ایسے ضرور ہوں گے جن کی کم استعدادی و کم فہمی میری طرح اکثر قطعات و رباعیات اور خصوصاً اکبر کے بلند پایہ اشعار کے صحیح مفہوم تک پہنچنے اور اُن کے محاسن لفظی و معنوی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے میں مانع ہو گی، اس لئے مجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قطعات و رباعیات کو معرّیٰ نہیں بلکہ محشّیٰ شائع کیا جائے۔ تاکہ کلام اکبر کی مقبولیت و افادیت صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی تک محدود نہ رہے بلکہ کم استعداد رکھنے والے وہ نوجوان اور طالبانِ علم بھی اس سے مستفید و محظوظ ہو سکیں جن کے خیالات و رجحانات کو کورانہ تقلید کی بے اعتدالیوں سے بچانا حضرت اکبر کی شاعری و جگر کاوی کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے اور جن کو اردو شعر و شاعری کی بعض قابل قدر خصوصیتیں کلام اکبر میں مل سکتی ہیں جو کسی دوسرے مشرقی شاعر کے کلام میں مجموعی طور پر نہیں مل سکتیں۔

قطعات و رباعیات اکبر کو محشّیٰ شائع کرنے کی ضرورت کے متعلق جب میں نے اپنے مذکورہ خیال کا اظہار واحدی صاحب سے کیا تو اُنہوں نے بھی میری اس رائے سے اتفاق کیا مگر شاید اس غلط فہمی میں کہ یہ مشورہ میں نے اِس لئے دیا ہے کہ حاشئے لکھنے کا کام بھی میں خود ہی کرنا چاہتا ہوں بلا تامل یہ فرما دیا "تو حاشئے بھی آپ ہی لکھ دیجئے" حالانکہ میرا خیال یہ تھا کہ اس اہم اور ذمہ داری کے کام کے لئے واحدی صاحب کی نظر انتخاب کسی ایسے شخص پر پڑے گی جو مولانا عبدالماجد دریابادی کی طرح ماہر ادبیات و عالم معانی و بیان بھی ہو۔ مذہب و تصوف اور حکمت و فلسفہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت

اکبر کا ہم مذاق و ہم خیال ہو اور حضرت اکبر سے ذاتی روابط و مراسم رکھنے کا بھی اسے امتیاز حاصل ہو۔ مگر واحدی صاحب نے کلام اکبر پر حاشیہ نگاری کے لئے ان تمام اہلیتوں کی موجودگی کی ضرورت کو نظرانداز کرکے یا یہ کہ میری نااہلیتوں کی طرف سے عمداً آنکھیں بند کرکے محض "مصلحت بین و کارآساں کن" کے اصول عمل کو سامنے رکھا اور میری معذرتوں کے باوجود قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیہ نگاری کا اہم و دشوار کام بھی میرے ہی سپرد کر دیا اور میں نے بھی یہ سوچ کر کہ جب یہ کام مجھے کسی ایسے بلند معیار پر نہیں کرنا ہے جو میری قابلیت و استعداد علمی کی پہنچ سے باہر ہو یا جو مولانا دریابادی جیسے قابل لوگوں کے اونچے معیار پر پورا اُتر سکے۔ ہر چہ باداباد، کو نصب العین بنا کر طوعاً و کرہاً اسے شروع کر دیا اور تقریباً آٹھ نو مہینے کی کاوش و کوشش کے بعد بُرا بھلا جیسا بھی بن پڑا کم از کم ایک ایسی شکل میں تکمیل تک پہنچا دیا جسے واحدی صاحب نے بزم اکبر کی طرف سے شائع کرنا گوارا کر لیا۔

ضعیف العمری و دائم المرضی کی وجہ سے حافظہ اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ روزمرہ کے الفاظ کے معنی بھی بعض وقت یاد نہیں آتے اور مذہبی و تاریخی معلومات کا اگر کوئی وصندللا سا خاکہ ذہن میں موجود بھی ہوتا ہے تو اس کی صحت پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری کتب لغات و کتب معلومات کی موجودگی کے بغیر قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیہ نگاری کا کام انجام دینا میرے لئے ناممکن تھا کچھ کتابیں تو میں نے خرید لیں جن کی دوسرے کاموں کے لئے بھی مجھے اکثر ضرورت پڑتی رہتی تھی اور کچھ کتابیں مخدومی جناب حکیم حافظ محمد سعید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کراچی نے اپنے کتب خانہ سے مستعار عنایت فرما دیں۔ مگر ان فراہم شدہ کتابوں کی موجودگی کے باوجود میری تمام دشواریاں حل نہیں ہو سکیں اور بہت سی توضیح طلب باتوں پر خاطر خواہ حواشی لکھنے میں کامیاب

نہیں ہو سکا بلکہ کئی قطعات و رباعیات کا مفہوم سمجھ میں نہ آنے یا اپنے سمجھے ہوئے مفہوم پر پورا اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے مجھے واحدی صاحب کو لکھنا پڑا کہ وہ ایسے اشعار پر مولانا دریابادی وغیرہ سے حاشیے لکھوالیں۔ چنانچہ کچھ حاشیے جن کی تعداد غالباً پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہے دوسرے صاحبان کے لکھے ہوئے بھی آپ کو اس مجموعہ میں ملیں گے جن کے آخر میں میں نے حاشیہ نگار صاحب کا نام درج کر دیا ہے اور کچھ اشعار جن کو میں ٹھیک طور پر نہیں سمجھ سکا تھا اور جن پر دوسرے صاحبان سے بھی حاشیے لکھوانے کی واحدی صاحب نے ضرورت نہیں سمجھی وہ اس مجموعہ میں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے شعروں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

قطعات و رباعیات پر حاشیے لکھنے میں جو مقصد میرے سب سے زیادہ پیش نظر رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت اکبر کے کم از کم ایسے اشعار جو دقیق رموز تصوف و نکات حکمت و فلسفہ کے حامل نہیں ہیں اور جن میں مازک استعارات و کنایات یا بلند صنائع و بدائع سے کام نہیں لیا گیا ہے ان کے الفاظ و معانی کی ایسی عام فہم توضیح و تشریح کر دی جائے کہ معمولی استعداد کے اردو خواں بھی ان شعروں کو بخوبی سمجھ لیں اور اُن کے لفظی و معنوی محاسن ادبی سے بھی وہ بقدر اپنی استعداد کے مستفید و محظوظ ہو سکیں۔ اسی مقصد کے ماتحت مجھ کو بہت سے ایسے لفظوں کی بھی لغوی توضیح و تشریح کرنی پڑی ہے جو اگرچہ استعمال تو عام طور پر ہوتے ہیں لیکن اشعار اکبر میں ان کے استعمال کا پورا لطف جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اُن کے لغوی اور مجازی معنی بلکہ ان کی اشتقاقی کیفیت بھی معلوم ہو۔ جن ذی استعداد حضرات کو ایسے کثیر الاستعمال الفاظ کی لغوی و معنوی توضیحات غیر ضروری معلوم ہوں ان کو ثانوی درجہ کے کسی طالب علم سے فیصلہ کرانا چاہیئے کہ وہ کس حد تک ضروری ہیں یا غیر ضروری۔

اسی طرح قطعات و رباعیات میں جو توضیح طلب الفاظ یا تلمیحات وغیرہ بار بار آئی ہیں، حاشیوں میں بھی ان کی بار بار توضیح ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ یہ تکرار توضیحات فضول ہے۔ بلکہ اس تکرار کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کر سکیں انہیں کسی خاص شعر یا اشعار کے سمجھنے کے لئے مکرر استعمال ہونے والے لفظوں وغیرہ کی توضیحات پچھلے حاشیوں میں تلاش کرنے کی زحمت نہ ہو بلکہ خود اسی شعر یا اشعار کے حاشیوں سے ان کا مقصد پورا ہو جائے۔ کم استعداد مطالعہ کرنے والوں کی کم استعدادی کا لحاظ رکھنے کے لئے حاشیوں میں طوالت تو ضرور ہو گئی ہے مگر اس طوالت کے مقابلہ میں کتاب کی فائدہ رسانی میں جو اضافہ ہوا ہے وہ زیادہ قابل لحاظ ہے۔

جو اشعار اکبر دقیق رموز و نکات تصوف و حکمت کے حامل ہیں ان کی معنوی مشکلات کے حل کرنے کی بھی میں نے امکانی کوشش کی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ میری اس کوشش سے کم استعداد کے مطالعہ کرنے والوں کو پورا فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور جن قابل حضرات کے ذہن ان اشعار کے حقایق تک پہنچ سکتے ہیں ممکن ہے کہ وہ میری تشریحات سے مطمئن نہ ہوں۔ یا ان میں غلطیاں پائیں ان قابل حضرات کی خدمت میں تو سوائے اپنی کم استعدادی کی معذرت کے میں کوئی اور صفائی پیش نہیں کر سکتا اور کم استعداد حضرات سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسے اشعار سے پورے طور پر مستفید ہونے کے لئے اپنی استعداد علمی کے بڑھنے کا انتظار کریں۔

حضرت اکبر کے کلام میں استعارات و کنایات اور صنائع و بدائع وغیرہ کی ایسی بے شمار خوبیاں ملتی ہیں کہ اُن سب کی پوری توضیح و تشریح کی جاتی تو حاشیئے اور بھی طویل ہو جاتے۔ اس لئے میں نے صرف

انہیں محاسن شعری و ادبی کی طرف اشارات کر دینے کافی سمجھے ہیں جن کا اثر شعر کے مطالب و مقاصد پر بھی پڑتا تھا یا جن تک سطحی نظریں مشکل سے پہنچ سکتی تھیں۔

جو لوگ مجھ سے یا میرے خیالات سے واقف ہیں ممکن ہے کہ انہیں یہ شبہ ہو کہ حضرت اکبر کے اشعار پر حواشی لکھنے میں میں نے اپنے خیالات و رجحانات کو بھی دخل دیا ہے لیکن دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کے فرض کو میں بالکل ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کسی کی رکھوائی ہوئی امانت کا واپس کرنا۔ یعنی میرے نزدیک کسی دوسرے کے خیالات کو اُن سے خود متفق نہ ہونے کی بنا پر توڑ مروڑ کر یا اپنے خیالات کے رنگ میں رنگ کر پیش کرنا ایک بڑی بد دیانتی ہے۔ اس لئے کئی باتوں میں حضرت اکبر سے اصولی اختلاف رکھنے کے باوجود میں نے اپنے اختلافات کو نہ صرف یہ کہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے بلکہ اپنے آپ کو حضرت اکبر کا ایک ہم خیال تصور کر کے ان کے خیالات و معتقدات کی تائید میں دلیلیں بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میرے لکھے ہوئے حاشیوں سے پڑھنے والوں کو نہ تو یہ غلط فہمی ہونی چاہیئے کہ ان میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ حضرت اکبر کے نہیں بلکہ میرے خیالات ہیں اور نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے خیالات کے خلاف کسی حاشیئے کے لکھ دینے سے میرے خیالات و معتقدات میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔

تالیفی اور تصنیفی کاموں کے انجام دینے میں ایک بڑی رکاوٹ مجھ کو یہ پیش آیا کرتی ہے کہ اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں تو مجھے اکثر نظر آجاتی ہیں لیکن ان غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح میں اپنی

کم علمی و کم اہلیتی کی وجہ سے بہ آسانی نہیں کر سکتا۔ یعنی علمی و عملی قابلیت کے مقابلہ میں میری تنقیدی اہلیت بڑھی ہوئی ہے اس لئے میری غلطیاں میرے ہی دل میں کانٹوں کی طرح چبھا کرتی ہیں۔ قطعات و رباعیات اکبر پر حاشیئے لکھتے وقت اگرچہ میں نے اپنی تنقیدی آنکھوں پر اندھیری عینک لگا رکھی تھی تاکہ میری غلطیاں مجھ کو کم از کم ایسی بھیانک نہ نظر آئیں جس سے میری ہمت ٹوٹ جائے اور یہ کام بھی میرے ہاتھ سے انجام کو نہ پہنچ سکے۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضرت اکبر کے کلام پر حاشیئے لکھنے میں میرے دماغ نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں اور میرے قلم نے بھی۔ اور ان معلوم و محسوس غلطیوں کے علاوہ یقیناً ایسی بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی مجھ سے ہوئی ہوں گی جن تک میری تنقیدی نظر بھی نہیں پہنچ سکی ہے۔ ایسی سب غلطیوں اور کوتاہیوں کے لئے میں اپنی نااہلیت کا عذر پیش کر کے تمام بالغ نظر قارئینِ کتاب سے مستدعی ہوں کہ جو غلطی بھی ان کے علم میں آئے یا جس اصلاحی ضرورت کو وہ محسوس کریں اس سے کارکنان بزم اکبر کو مطلع کرتے رہیں تاکہ آئندہ اشاعتوں میں اُن کے مفید مشوروں سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

کسی وقیع مصنف کے کلام پر حاشیئے لکھنے والے کا ایک فرض عام طور پر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مصنف کے حالات زندگی پر بھی کچھ روشنی ڈالے اور اس کے کلام کی خصوصیات پر تبصرہ و تنقید بھی کرے مگر میں نے اپنے لئے ان دونوں باتوں کو اس لئے ضروری نہیں سمجھا کہ یہ کتاب بزم اکبر کی طرف سے شائع ہو رہی ہے اور بزم اکبر ملا واحدی صاحب کی تالیف کردہ حضرت اکبر کی ایک کافی مفصل و دلچسپ سوانح عمری "حیات اکبر" کے نام سے شائع کر چکی ہے اور حضرت اکبر کے اصلاحی و تبلیغی مقاصد اور اُن کے کلام

کی شاعرانہ اور ادبی خصوصیات پر ۲۶ کافی مشہور شعراء و ادباء کے بصیرت افروز تنقیدی و تقریظی مضامین نثر کا ایک دل آویز مجموعہ جناب اختر انصاری صاحب اکبر آبادی کا مرتب کردہ "اکبر اس دور میں" کے نام سے بزم اکبر ہی نے حال میں شائع کیا ہے اور غالباً مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے قلم سے نکلے ہوئے کچھ بلند پایہ مضامین جن کا تعلق بھی حضرت اکبر کے حالات زندگی اور ان کی خصوصیات کلام سے ہے عنقریب بزم اکبر ہی کی طرف سے کتابی شکل میں پیش کئے جانے والے ہیں۔ ان تینوں کتابوں کی موجودگی میں قطعات و رباعیات کے ساتھ سوانح اکبر و تبصرہ کلام اکبر کے شامل نہ ہونے کو امید ہے کہ زیادہ قابل اعتراض نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر کلام اکبر کا کوئی ایسا مکمل انتخاب کبھی شائع کیا گیا جو حضرت اکبر کی شاعری کی تمام اصناف اور تمام خصوصیات کا حامل ہو تو اس کے ساتھ سوانح اکبر و تبصرہ کلام اکبر کے شامل کرنے کی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

احسان الحق

کراچی۔
۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء

حمد و دعا

اور

نعت و منقبت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمال اُس کا۔ جلال اُس کا

وہی ہنسائے، وہی رُلائے، وہی جگائے، وہی سُلائے
وہی بگاڑے، وہی سنوارے، وہی نکالے، وہی بلائے
اُسی سے خوش رہ، اُسی کا غم کر، اُسی کو دیکھ اور اُسی[1] میں گُم ہو
دُعا اُسی سے، ثنا اُسی کی، جو گر تو چپ ہو، سنبھل جو قُم[2] ہو
جہانِ فانی کے کُل کوائف، اُسی کی قدرت کے ہیں لطائف
اُسی کی رحمت پہ کوئی غافل، اُسی کی عظمت سے کوئی خائف
دلوں کا مالک، نظر کا حاکم، سمجھ کا صانع، خِرد کا بانی
جمال اُسی کا، جلال اُسی کا، اُسی کو زیبا ہے لَن تَرانی[3]

---

[1] یعنی اپنی ہستی کو خدا کی ہستی اور خودی میں محو کر دے۔ [2] قُم عربی بمعنی "کھڑا ہو"۔ [3] لَن تَرَانِی۔ عربی بمعنی "تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا"۔ اشارہ ہے آیت قرآنی وَلَمَّا جَآءَ مُوسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ، قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ (ترجمہ) اور جب موسیٰؑ ہمارے وعدہ کے مطابق (کوہِ طور پر) حاضر ہوئے اور اُن کا پروردگار اُن سے ہمکلام ہوا، تو موسیٰؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار تو اپنے تئیں (مجھے دکھا کہ میں تیری طرف ایک نظر دیکھوں۔ خدا نے فرمایا تو مجھے ہرگز نہیں دیکھے گا۔

اسلامیات

اور

عرفانیات

3704

خدا کی سلطنت کی جوبلی

فلک پر شان و عظمت سے ستارے جگمگاتے ہیں
خدا کی سلطنت کی جوبلی[1] ہر شب مناتے ہیں

یہی نظارہ ہم کو محو رکھتا ہے سدا اکبر
فرشتے بے ٹکٹ[2] یہ منظرِ اعظم دکھاتے ہیں

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

حضرتؐ کی نبوت میں ہو کس طرح مجھے شک
ہر ذرہ کو ہے وردِ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ[3]

تھی شانِ جلالی کہ عدو رک گئے آخر
وہ نور تھا عالی کہ صنم جھک گئے آخر

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

احباب نے طویل مضامیں وہاں پڑھے
لیکن مری زبان کا نغمہ تھا مختصر

میں نے تو بزمِ نعت میں اتنا ہی پڑھ دیا
بعد[4] از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

---

[1] جوبلی انگریزی JUBILEE یعنی جشن یعنی خدا کی قدرت اور اسکی عظمت و شان کو آشکارا کرتے اور یاد دلاتے ہیں۔

[2] بے روک ٹوک اور بلا معاوضہ۔ [3] آیت قرآنی یعنی "اور ہم نے تمہارے ذکر (خیر) کا آوازہ بلند کیا۔"

[4] یہ فارسی مصرع شیخ سعدیؒ شیرازی کے شعر لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ - بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر - کا ہے۔

فرعون بھی ہیں اور محمدؐ و عون بھی

ایسے بھی ہیں خلق جن کو فرعون[1] کہے — ایسے بھی ہیں جنھیں محمدؐ[2] و عونؓ[2] کہے
میں نام بنام تم سے کہتا اکبرؔ — نازک ہے مگر معاملہ کون کہے

ترکِ موالات اور اسلام

ہو جو تقوٰے کے سوا ترکِ موالات[3] کچھ اور — تو وہ اسلام نہیں بلکہ ہوئی بات کچھ اور
علما خوش ہوئے سن کر یہ مرا شعر اکبرؔ — ہاں مخالف نے کہا، یکسئے خرافات کچھ اور

حمدِ خدا و نزاعِ حمید و حامد

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے — عجم نے واسطہ رکھا شراب و شاہد سے
اِدھر تھی حمدِ خدا ہی سے آشتی دل کو — اُدھر تھی بحث نزاعِ حمید[4] و حامد سے

---

[1] لقب بادشاہانِ مصر۔ مگر یہاں مخاص طور پر وہ سرکش و مغرور بادشاہ مراد ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں دعوائے خدائی کیا تھا۔ [2] محمدؐ اور عونؓ۔ یہ دونوں حضرت عبداللہؓ ابن حضرت جعفر طیار اور حضرت زینبؓ بنت حضرت علیؓ یعنی خواہر حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے تھے۔ جو اپنے ماموں حسین مظلوم کی طرف سے میدانِ کربلا میں یزید لعین کے لشکرِ جرار سے لڑکر شہید ہوئے تھے۔ فرعون نے خدا سے سرکشی کی تھی اور انہوں نے راہ خدا میں سرفروشی۔ [3] ترکِ موالات بمعنی ایک دوسرے کی امداد اور آپس کے میل جول کا ترک کرنا۔ گاندھی جی کی تحریک نان کوآپریشن کی انگریزی اصطلاح کا اردو ترجمہ [4] نزاعِ حمید و حامد سے مراد ہے معاملاتِ دین میں علماء ظاہر کی فضول لفظی کج بحثیاں۔ جب تک اسلام پر عجم یعنی فارس وغیرہ کا اثر نہیں پڑا تھا۔ اس وقت تک مسلمان اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات پر عامل تھے۔ عجمیت کا دخل ہونے پر دین میں بھی ایسی عقلی اور فلسفیانہ موشگافیاں ہونے لگیں کہ مسلمانوں کے دل روحِ اسلام سے ہٹ کر ان لفظی کج بحثیوں میں الجھ گئے۔

اثرِ قرآن اور راویوں کا لشکر

سررشتۂ اتحاد ہم سے چھوٹا — آپس ہی کی خانہ جنگیوں نے لوٹا
قرآن کے اثر کو روک دینے کے لئے — ہم لوگوں پہ راویوں[1] کا لشکر ٹوٹا

فہمِ قرآن مجید

حق نے جنہیں دی ہے فہمِ قرآن مجید — ہونے کے نہیں وہ پیرِ گردوں کے مرید
بدلے سو رنگ انقلابِ دنیا — ہر حال میں اُن کو ہے خدا ہی سے اُمید

عجم میں جم عرب میں رب کا جلوہ

گذرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ — سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جم[2] ہے موجود — کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

[1] راویوں کے لشکر سے مراد راویانِ حدیث کی کثرت اور ثقہ و غیر ثقہ ہونے کے مباحث ہیں۔ اس طعن سے حضرت اکبر کے اہل قرآن ہونے کا نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حدیثوں کی بحث میں پڑ کر مسلمانوں کی توجہ قرآن مجید کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ [2] جم نام ہے بادشاہ فارس جمشید کا جس کا جام جم مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جام پر ایسے نقوش تھے جن سے غیب کے حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل عجم کی پیروی سے دنیاوی شان و شوکت اور رسولِ عربی کی پیروی سے قربِ رب حاصل ہوتی ہے۔

پہلے خانہ، پھر خانہ داری

قرآن و حدیث میں ہے ڈو با واعظ — چھپاں ہو مگر یہ اس کا مضمون کہاں
گھر کے[1] پہلے بنا کے خانہ داری سکھلا — ملت ہی نہیں ہے جب تو قانون کہاں

اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ

ہے اُن کی جبیں اور بتوں کی درگاہ — ہیں شرکِ[2] خفی میں مبتلا شام و پگاہ
کس کو یہ خیال ہے کہ مومن کے لئے — قرآن میں ہے اَشَدُّ[3] حُبًّا لِلّٰہِ!

مومن کی دنیا

ہر ساعت رخت بستہ دنیا میں رہے — مغموم و ملول و خستہ دنیا میں رہے
عاشورہ ہے ہر روز پس از قتلِ حسینؑ — مومن[4] اب دل شکستہ دنیا میں رہے

[1] مطلب یہ ہے کہ احکام قرآنی کی تبلیغ مفید جب ہی ہو سکتی ہے کہ قوم و ملت میں اُن کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یعنی پہلے افراد قوم میں وہ بنیادی اہلیتیں پیدا ہو جائیں جن سے ملت کی تعریف اُن پر صادق آنے لگے [2] شرک خفی یہ ہے کہ کسی غیر خدا میں ایسی کسی صفت کے ہونے کا اعتقاد رکھا جائے جو خدائے واحد کے لئے مخصوص ہے۔ اور شرک جلی شرک ظاہر و صریح کو کہتے ہیں۔ جیسے بت پرستی، قبر پرستی وغیرہ [3] آیت قرآنی ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور جو ایمان والے ہیں اُن کو (تو سب سے) بڑھ کر خدا کی محبت ہوتی ہے۔" [4] حدیث ہے الدُّنیا سِجنُ المؤمن دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔

مراقبؔ اور دل کی توجہ

جو چاہے کفر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا　　بجا ہے تم کو اکبرؔ اپنا ملنا اُس سے کم کرنا
مراقبؔ[1] کو بہت آسان ہے گردن کو خم کرنا　　مگر مشکل ہے دل کو یادِ خالق سے بہم کرنا

صبر و صلوٰۃ سے مدد

تری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست　　خدا گواہ کہ سچی یہی ہے بات اے دوست
طلب مدد کی نہیں اُن سے جو ہیں خود محتاج　　طلب مدد کی ہے بالصّبر[2] والصّلوٰۃ ای دوست

انسان۔ ایمان اور مسلمان

اُلفت اور ادب نہیں تو انسان نہیں　　بے صبر و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں
جو غیرِ خدا کو مانتا ہو قادر　　اکبرؔ بخدا کہ وہ مسلمان نہیں

قرآن کو بغور پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت

ہر حال میں بہرِ روح انسب وہ ہے　　اللہ و رسول کا بھی مطلب وہ ہے

[1] مراقب یعنی مراقبہ کرنے والا۔ یعنی صوفیوں کے طریقوں کے مطابق گردن نیچی کر کے خدا کو یاد کرنے والا۔
[2] اشارہ ہے آیت قرآنی اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی طرف جس کا ترجمہ ہے "مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ سے"۔

قرآن کو غور سے پڑھو اور سمجھو　　اکبرؔ بخدا کہ جانِ مذہب وہ ہے

ایماں برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

دیکھا مناظروں کا بہت اُس نے رنگ ڈھنگ　　اکبرؔ کے دل میں اب نہ رہی بحث کی اُمنگ
کہتے بہت صحیح تھے یہ حضرتِ مذاقؔ[1]　　ایماںؔ[2] برائے طاعت و مذہب برائے جنگ

ھم ــ ھم

رکھو جو مقابل اس کے سارا عالم　　دنیا بخدا ہے اک ذرّے سے بھی کم
اُس اک ذرّے میں ہے ہماری کیا اصل　　نافہم ہیں کر رہے ہیں ناحق ہمؔ[3] ــ ہم

اللہ ــ اللہ

مسکین گدا ہو یا ہو شاہِ ذی جاہ　　بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں اِک وقت　　کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ ۔ اللہ

[1] خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب مذاقؔ تعلقہ دار پیاواں۔ یہ حضرت اکبر کے سمدھی تھے۔ [2] ایمان اور مذہب سے یہاں مذہب کا باطن اور ظاہر مراد ہے۔ جیسے مولانا رومیؒ نے اپنے شعر "من ز قرآں مغز را برداشتم　استخواں پیشِ سگاں انداختم" میں مغز اور استخواں سے تعبیر کیا ہے۔ [3] ہم۔ ہم کرنے سے مراد ہے خود پرستی و خودنمائی۔

حسن کی دل کشی اور بُت پرستی

تاثیر ہوائے باغ ہستی نہ گئی　　صورت کی ادا، نظر کی مستی نہ گئی
ہوتے ہی رہے جمال دل کش پیدا　　طبعِ انساں سے بُت پرستی نہ گئی

مشرق کی غزل اور مغرب کی رفل

وجد آجاتا ہے مشرق کی غزل کو دیکھ کر　　ہوش اُڑ جاتا ہے مغرب کی رفل[1] کو دیکھ کر
دُور رہا ہوں ضعف سے ایمان کے اس عہد میں　　دیکھئے کیا حال ہوتا ہے اجل کو دیکھ کر

رنگ نبیؐ ـــــ بوئے علیؑ

بے بصیرت ہے مگر تو منکرِ شیخ و ولی　　ناشگفتہ (کھلی) رہ گئی بے شک ترے دل کی کلی
چشم[2] پیدا کن کہ بینی آشکارو ہم نہاں　　در قبائے گل رُخاں رنگِ نبیؐ بوئے علیؑ

اللہ سے لگاؤ

پڑتا[3] ہے بتوں سے ساعتِ چند کا کام　　تمہید میں اس کی دولت و عمر تمام
اللہ سے ہر نفس (سانس) کا رہتا ہے لگاؤ　　دشوار ہے نفس (طبیعت دل) پر عبادت کا نام

[1] رفل مہند ہے انگریزی لفظ رائیفل یعنی گولی مار بندوق کا۔ [2] یعنی ایسی آنکھ پیدا کر کہ گل رخوں (حسینوں) کے ظاہر و باطن میں تجھ کو رنگ نبیؐ اور بوئے علیؑ نظر آنے لگے۔ [3] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کی محتاجی کا تعلق اگرچہ ایک ایسا تعلق ہے جس سے کسی آن میں بھی انسان مستغنی نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود اللہ کی عبادت انسان کو بہت شاق گزرتی ہے اور جن غیر اللہوں سے انسان کی محتاجی کا واسطہ بہت تھوڑے عرصہ کے لئے پڑتا ہے اُن کی دل جوئی و خوشنودی کے لئے وہ اپنی ساری زندگی اور دولت و مال کو قربان کر دیتا ہے۔

تائیدِ ملت و دین

تائیدِ[1] وضعِ ملت دیں کی کروں گا میں　　اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر
ہوتا نہیں طبیب مداوا (علاج) سے دست کش　　سچ ہے اجل تو ہنستی ہی سعئ طبیب پر

فیضِ حضرت سے غم غلط

فیضِ[2] حضرت بہرہ مند (بہرہ ور) ہوتا ہے!　　دل کو مرے حظ (خوشی) ہیں فقط ہوتا ہے
ہر آہ غلط کی ہوتی ہے یاں تصحیح　　اور لطف یہ ہے کہ غم غلط ہوتا ہے

اسلام بخیر ـــ انجام بخیر

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر　　لکھیں یارب ملک (فرشتے) میرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی (یعنی انحراف) کی ہے　　پایا نہیں میں نے اس کا انجام بخیر

خزانۂ غیب کا انکار و اعتقاد

طلبِ[3] زر رہے جن کو اے اکبر　　وہ رہیں منکرِ خزانۂ غیب

[1] یعنی اہل زمانہ جو موت اور ہلاکت کی طرف جا رہے ہیں وہ میری تائیدِ وضع ملت و دین کا خواہ کتنا ہی مذاق اڑائیں مگر میں تو ایک طبیب مخلص کی طرح مرض قوم کے علاج سے دستکش نہیں ہوں گا۔ [2] مطلب یہ ہے کہ فیاض حقیقی یعنی خدا تعالیٰ سے سچا تعلق رکھنے والوں کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچتا ہے اور اُن کے دلوں کو سچی خوشی بھی صرف اسی تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ غلطیوں اور غلط رَیوں کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور دل کو غم و فکر سے نجات ملتی ہے۔ [3] مطلب یہ ہے کہ طالبانِ زر اگر غیب سے دولت نہ ملنے پر خزانۂ غیب کا انکار کریں تو کریں، میرے دل میں تو غیب سے میری معنوی دولت یعنی مضامین کا القا ہوتا ہے اس لئے میں خزانۂ غیب کا منکر نہیں ہو سکتا۔

ہم تو مضموں دہیں سے پاتے ہیں　　معتقد ہم تو اس کے ہیں لاریب

گردن افرازی کی نہیں، جبینِ نیاز کی ضرورت

فتحِ عرب پہ گو ہے تمہیں شوقِ نماز کا　　بہتر ہے اس سے ذوقِ درود و نماز کا
گردن اٹھائیے نہ بہت پالیٹکس میں　　مسجد میں اب ہے کام جبینِ نیاز کا

جلوۂ قدرت و صوتِ سرمد

جلوۂ قدرتِ باری ہے سراپیشِ نگاہ　　نہ حکومت کا ہے ماتم نہ غمِ مال سے کام
کوئی ماضی میں ہے اُلجھا کوئی مستقبل میں　　صوتِ سرمد[۲] پہ مجھے تو ہے فقط حال[۳] سے کام

طاعتِ حق کے بغیر یک جہتی ناممکن

کمیٹیوں میں ہے رونے کا خوب شوق اُنہیں　　مگر نماز و دعا کا نہیں ہے ذوق اُنہیں
بغیر طاعتِ حق ہے محال یک جہتی　　خدا کرے کہ نظر آئے تحت و فوق اُنہیں

---

[۱] لفظ انگریزی "POLITICS" بمعنی سیاسیات۔ [۲] صوتِ سرمد کے لفظی معنی ہیں وجودِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی آواز۔ سالک راہِ طریقت پر کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ صوتِ سرمد کی شنید میں سرشار رہتا ہے۔ [۳] حال سے مراد یہاں سرشاری و بے خودی ہے جس میں نہ ماضی کا ہوش رہے نہ مستقبل کا۔ اور حال زمانۂ موجود کو بھی کہتے ہیں۔

اللہ تو ہے

ہے جلوۂ سحر پہ تو ماہ تو ہے　　سینے میں تمہارے قلبِ آگاہ تو ہے
ظاہر جو نہیں ہے حامیٔ دیں کوئی　　بے دل کیوں ہو رہے ہو اللہ تو ہے

روٹی ملتی ہے تو طاعتِ حق بھی تو ہو

کالج[۱] و ٹیچر و حکام ہمہ در کارند　　تا تو پلئے بکف آری و کنی عہدہ پُری
طاعتِ حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے　　شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

ہر حال میں الحمد

گردوں کا نہ کر شکوہ اچھی نہیں خود غرضی　　ہر حال میں پڑھ الحمد، اللہ کی جو مرضی
اکبر نے کہا واپس لیتا ہوں میں خواہش　　الحمد[۲] رہے قائم منظور ہو یہ عرضی

---

[۱] ان اشعار میں شیخ سعدی شیرازیؒ کے اس شعر میں حسبِ حال لفظی اور معنوی تصرف کیا گیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

مطلب اشعارِ اکبر کا یہ ہے کہ کالج۔ اساتذہ اور حکام سب اسی کوشش میں ہیں کہ تم میں سرکاری نوکریوں کی اہلیت و قابلیت پیدا ہو لیکن نوکری ملنے اور شکم پُری کا انتظام ہو جانے پر اس کی بھی ضرورت ہے کہ تم رزّاقِ حقیقی سے غافل نہ ہو اور خدا کی عبادت بھی کرو۔ [۲] الحمد قائم رہے، یعنی ہر حال میں شاکر رہ کر خدا کی حمد و ثنا کرتا رہوں۔

قرآن کو دل میں اُتاریئے

قرآن[1] کو زبان سے دل میں اتاریئے　　علمی نمود چھوڑ عمل کو سنواریئے
چشم و زباں میں کیجیئے پیدا اثر جناب　　بعد اس کے بندگان خدا کو پکاریئے

مومن و کافر —— نجس و طاہر

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں　　جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں بُرے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لوگ ہے جنکی خالق سے　　نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں[2]

دل کی کرید کو عشق ہی مٹاتا ہے

مذہب[3] کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل　　بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کرید کو
دینِ خدا کے نور کا جلوہ نصیب ہو　　دل کی نگاہ پائے جو وحدت کے بھید کو

[1] مطلب یہ ہے کہ قرآنی تبلیغ کا اثر دوسروں پر جب ہی پڑتا ہے کہ تبلیغ کرنے والا خود بھی قرآن پر عمل کرے اور اس عمل سے اُس کی آنکھ اور زبان میں ایسا اثر پیدا ہو جائے کہ دوسرے اس سے متاثر ہو سکیں. محض زبان سے قرآنی آیات کا پڑھ لینا اور دوسروں کو سنا دینا صرف ایک علمی نمود و نمائش ہے جس کا کوئی مفید تبلیغی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ [2] مطلب یہ ہے کہ انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ باطن کو دیکھنا چاہیئے جن کا باطن اچھا ہو اور جن کو خدائے برحق اور اپنے خالق سے سچا تعلق ہو ان کو مومن اور طاہر سمجھنا چاہیئے اور جن کا باطن برا اور شرک کی نجاست میں آلودہ ہو اُن کو کافر و نجس سمجھنا چاہیئے اس لیے کہ قرآن میں مشرکوں کو نجس کہا گیا ہے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ [3] مذہب سے یہاں مراد شریعت ہے اور عشق سے طریقت. مطلب یہ ہے کہ انسانی عقل جو رازہائے کائنات کی کرید یا جستجو میں رہتی ہے اور انسان کو دولت اطمینان سے

(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۵۷ پر)

پاسِ انفاس

پاس[1] انفاس ہو اگر ملحوظ　　ہر نفس راہ کامرانی ہے
سانس لینے کا ورنہ کیا حاصل　　صرف اِک شغلِ زندگانی ہے

ذوقِ تصوف

مادہ سب میں یہ ہو، اک خیالِ خام ہے　　اک مذاقِ طبع ہے جس کا تصوف نام ہے
وہ تو ہے معذور جس کے دل میں اس کا ذوق ہے　　اس سے خالی ہیں کا دل ہو اُس پہ کیا الزام ہے[2]

جھاڑو کی بجائے تنکے

پوچھتے کیا ہو مسلمانوں کا حال　　منتشر اجزا سب اِن کے ہو گئے

(صفحہ ۵۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) محروم رکھتی ہے، وہ پابندی شریعت سے دب تو جاتی ہے لیکن کبھی کبھی ابھر بھی آتی اور ایمان بالغیب میں رخنہ اندازی کرتی ہے. عقل کی اس راز جوئی اور ایمان میں رخنہ اندازی کا پورا انسداد جب ہی ہوتا ہے جبکہ عشق الہٰی کا سچا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے خدا کے نور کا جلوہ انسان کو نظر آنے لگے اور اس کے دل کی نگاہ وحدت کے بھید کو معلوم کر لے. یعنی عقل کو جن رازہائے کائنات کی تلاش رہتی ہے. انسان اپنی چشم حقیقت و معرفت سے ان کا مشاہدہ کرنے لگے۔ [1] پاس انفاس کے لفظی معنی ہیں سانسوں کی حفاظت کرنا سلوک میں یہ ایک شغل ہے جس میں سانس خدا کی یاد میں روک روک کر لیا جاتا ہے. مطلب یہ ہے کہ جس زندگی میں خدا کی یاد سے کسی وقت غافل نہ ہوا جائے، وہی زندگی بامرادی و کامرانی کی زندگی ہے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ نہ تو صوفیوں کو ملاؤں پر طعن کرنا چاہیئے اور نہ ملاؤں کو صوفیوں پر۔ ذوق تصوف ایک وجدانی چیز ہے۔ جن میں یہ ذوق ہے ان کو بعض ایسی باتوں میں جو اہل ظاہر کے نزدیک قابل اعتراض ہیں معذور سمجھنا چاہیئے۔ اور جن میں یہ ذوق نہیں ہے اُن کو اس کے نہ ہونے پر الزام نہیں دینا چاہیئے۔

معتصمؔ[1] کب ہیں یہ حبلُ اللہ[2] سے   دیکھ لو جھاڑو سے تنکے[3] ہو گئے

ماہ رمضان اور نورِ چراغ سحری

صد حیف کہ ماہ رمضاں ختم ہوا آج   پھر رات کو عالم ہے وہی بے خبری کا
اُٹھتے تھے سحر کھانے کو اور جلتی تھیں شمعیں   افسوس گیا نورِ چراغ سحری[4] آج

شریعت اور طریقت

قرآں[5] رہے پیش نظر یہ ہے شریعت   اللہ رہے پیش نظر یہ ہے تصوف
مقصود تو واحد ہے اگر غور سے دیکھو   عامل نہ رہے اِس کے، اِسی کا ہے تاسف

---

[1] و [2] معتصم یعنی مضبوطی سے پکڑنے والا۔ اشارہ ہے آیت قرآنی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کی طرف جس کا ترجمہ ہے اور سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑے رہو۔ [3] یعنی تنکے ایک جگہ بندھ جانے سے جھاڑو ہو گئے تھے۔ بندش کھلتے ہی پھر تنکے کے تنکے رہ گئے۔ [4] ختم رمضان کے ساتھ نورِ چراغ سحری چلے جانے میں کیسا بلیغ ادبی لطف ہے۔ [5] یعنی خدا کے قانون یا احکام قرآنی کی پابندی کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام شریعت ہے۔ اور اگر پابندیٔ احکام خداوندی میں رضائے الٰہی پیش نظر ہو تو یہ طریقت یا تصوف ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ نہ تو لوگ شریعت پر عامل ہیں نہ طریقت پر۔ پابندیٔ احکام کو مقصود سمجھ کر جائز و ناجائز کی فضول بحثوں میں الجھ گئے ہیں یا رضاجوئی الٰہی کے لئے پابندی احکام سے اپنے آپ کو آزاد و مستغنی سمجھنے لگے ہیں۔

خود تابع نفس، دوسروں پر نکتہ چینی

اللہ نے کہا ہے تم زیرِ امتحاں ہو   ہم جانتے ہیں بس ہم دنیا کے ممتحن[1] ہیں
خود نفس کے ہیں تابع تقویٰ سے بے تعلق   اوروں پہ نکتہ چینی میں غرق رات دن ہیں

ارادے پورے نہ ہونے سے رب کی پہچان

کچھ اپنا سوچا نہ کام آیا وہی ہوا جو خدا نے چاہا   عجب ہے تسلیم و صبر کی خو اگر نہ پیدا ہو دل میں اب بھی
خدا سے بیگانہ تھی طبیعت۔ دلی ارادوں پہ تھا بھروسا   عزیمتیں فسخ ہو گئیں جب عَرَفْتُ رَبِّي[2] عَرَفْتُ رَبِّي

عالمِ وجد کی موت

ہر ایک کو ایک دن اجل آنی ہے   دنیا گذراں ہے۔ ہیچ ہے۔ فانی ہے
لیکن مرنا جو عالمِ وجد[3] میں ہو   گویا کہ شعاع نورِ یزدانی[4] ہے

دل کی آنکھ کا آپریشن

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس   کارِ دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اُداس

---

[1] اشارہ ہے آیت قرآنی وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ الخ کی طرف یعنی یقیناً ہم امتحان لیں گے تمہارا خوف وغیرہ کے ذریعے۔
[2] اشارہ ہے حضرت علیؓ کے اس مقولہ کی طرف عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہونے سے پہچانا۔
[3] حالت بے خودی و شیفتگی خصوصاً وہ جو عشق الٰہی میں طاری ہو۔ [4] یزداں موجودہ فارسی اور اُردو میں خدا کو کہتے ہیں۔ آتش پرست فاعل خیر کو یزداں اور فاعل شر کو اہرمن کہتے ہیں۔

جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر — آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ[1] — میری چشمِ طبع کو عارض ہے غربی کیٹریکٹ[2]
میرے حق میں کوئی فکرِ سالویشن[3] کیجیے — ہو سکے تو مذہبی اک آپریشن[4] کیجیے
کی توجہ حضرتِ مرشد نے میرے حال پر — اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشمِ باطن میں دیا نشتر نگاہِ تیز کا — کٹ گیا وہ زنگ محسوساتِ کفر انگیز کا

پھر درِ دل پر مرے تقوے کی ٹٹی باندھ دی
آنکھ پر شوقِ لقائے حق کی پٹی باندھ دی

باخبروں کی خاموشی

انوری سے کہا میں نے کہ خاموش اتنے ہو کیوں تم — نہ تقریر، نہ تحریر، نہ غصہ، نہ خوشامد
بابو کے نہ دمساز، نہ یاروں کے ہم آواز — ماہی ہیں نہ ممتاز، نہ اشتر ہیں سرآمد
کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے — کاں[5] را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

---

[1] انگریزی لفظ FACT بمعنی حقیقت [2] انگریزی لفظ CATARACT بمعنی موتیابند [3] انگریزی لفظ SALVATION بمعنی نجات۔
[4] انگریزی لفظ OPERATION بمعنی عمل جراحی [5] یہ مصرع سعدی شیرازی کے اس قطعہ کا ہے ؂

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز — کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند — کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

ترجمہ: اے صبح کے پرندے مرغِ عشق پروانے سے سیکھ کہ جل کر جان دے دیتا ہے پر کبھی اس کی آواز نہیں نکلتی۔ جن کو طلبِ حق کا دعویٰ ہے وہ راہِ حق سے بے خبر ہیں جن کو راہِ حق کا پتہ مل جاتا ہے۔ وہ خود لاپتہ ہو جاتے ہیں۔

ننانوے ناموں کا ورد اور ننانوے کا پھیر

ترقی خواہ ہے تو صحنِ مسجد چھوڑ اے اکبر — کہا اس نے ترقی ہے تو خود پہنچے گی مسجد تک
نود و نہ[1] نام اِدھر۔ ننانوے[2] کا پھیر اُدھر۔ یعنی — انہیں سو تک پہنچنا ہے مجھے اللہ واحد تک

مُلّا اور صوفی

گو کہ دونوں ہی نظر آتے ہیں نیک — ایک ظاہر۔ ایک میں باطن کی ٹیک[3]
میں نے پوچھا ایک اور اک کے ہوئے — دے جواب اس کا تمہاری طبع نیک
بے تکلف کہہ دیا مُلّا نے دو — حضرتِ صوفی یہ بولے پھر بھی ایک[4]

خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

عجیب معنیٔ نازک ہیں اس مقولے میں — نظر وسیع جو ہو بندگی میں شاہی ہے
خدا[5] کے ساتھ نہیں ہو تو کچھ نہیں ہو تم — خدا کے ساتھ اگر ہو تو پھر خدا ہی ہے

---

[1] نود و نہ بمعنی ننانوے۔ باری تعالیٰ کے اسمائے صفات ننانوے ہیں جو صوفیائے کرام کے ورد میں رہتے ہیں اور ان ننانوے اسمائے صفات کے بعد اللہ اسم ذات ہے جو خدائے واحد کا مختص نام ہے۔ مرتبۂ ذات تک پہنچنے کے لئے مراتبِ صفات کو طے کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ننانوے اسمائے صفات کی سیڑھی سے اللہ واحد تک رسائی ہوتی ہے [2] ننانوے کے پھیر میں پڑنا اردو زبان کا محاورہ ہے جس سے مراد ہے روپیہ جوڑنے کی فکر میں رہنا یعنی ننانوے روپے جمع ہو جانے کے بعد اُن کو پورے سو کرنے کی کوشش کرنا۔ [3] ٹیک لفظ ہندی ہے بمعنی سہارا [4] یعنی مُلّا کی نظر ظاہر پر پڑتی ہے اور صوفی کی نظر باطن پر۔ اعداد کی ظاہری کثرت میں ایک کی وحدت مضمر ہوتی ہے۔ ایک اور ایک بظاہر دو ہوتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ ایک ہی کے دوچند کا نام ہے۔ [5] مطلب یہ ہے کہ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

اِسلام
سے
بیگانگی

بس خدا سے کام رکھو

لاتؔ[1] و عزیٰ سے چھُٹے تو زیدؔ و خالدؔ[2] میں پھنسے — فائدہ کیا خلق کو پہنچا درِ اسلام سے
انتظامِ دہر کہتا ہے کہ یہ اک بھید ہے — کام رکھ تو اپنے دل میں بس خدا کے نام سے

آغاز وہ تھا۔ انجام یہ ہے

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا
جو بُت تھا نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہے کہ مر رہے ہیں
اللہ اللہ کر رہے ہیں

(صفحہ ۶۱ کا بقیہ) جب تک انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں محو و مدغم نہیں کر دیتا اور اپنے آپ کو خدا کا خلیفہ اور قائم مقام نہیں سمجھتا اُس وقت تک اس کی ہستی ایک خیالی ہستی سے زیادہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ لیکن جب انسان اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں گم کر کے خدا کا ہو جاتا ہے تو اس کی ہستی میں خدا کی خودی سما جاتی ہے اور مخلوق ہونے کے باوجود وہ خلیفۂ الٰہی کی حیثیت سے خدائی اختیارات کا حامل ہو جاتا ہے۔

[1] لات خانۂ کعبہ میں ایک بُت تھا اور عزیٰ ایک درخت، جنھیں مشرکین عرب پوجا کرتے تھے۔ اور جن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نیست و نابود کر دیا۔ [2] زید و خالد سے مراد وہ سب غیر خدا ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں نے خدا کا سا تعلق پیدا کر لیا ہے۔

شیخ بھی توحید کا کلمہ بھولے

تان اُس بت نے اُڑائی ہمیں بلما[1] بھولے — ہم تو کیا شیخ بھی توحید کا کلما بھولے
صنم ہند کو ہم یاد رہیں اے اکبر — غم نہیں ہے جو عرب میں ہمیں سلما[2] بھولے

حرص وحسد کی آگ

موقعے نکل آئے ہیں بہت کفر کی گوں[3] کے — افسوس مسلمان بہت دیر میں چوں[4] کے
ہے نفس بشر میں حسد و حرص کی آگ — شیطان ہی کا کام ہے اس آگ کو دھوں[5] کے

مسجد میں عالم خاموشی

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا — مکتب میں سر سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر — لیکن اک عالم خموشی[6] پایا

---

[1] بلما یا بالم لفظ ہندی۔ بمعنی خاوند۔ عاشق۔ معشوق۔

[2] سلما اصل میں سلمیٰ ہے۔ عرب میں ایک حسین عورت کا نام تھا۔ مجازاً ہر محبوبہ کو کہتے ہیں۔

[3] گوں لفظ ہندی بمعنی مطلب۔ خواہش۔ ضرورت۔

[4] و [5] چوں اور دھوں کے قافیوں کو گوں کی رعایت سے کے کی ردیف سے الگ کر کے لکھا گیا ہے۔ صحیح املا چونکے اور دھونکے ہے۔

[6] عالم خموشی سے مراد بے حسی ہے۔

گور پرستی و زور پرستی

بندوں نے بھلا دیا ہے وہ عہدِ الست[1] — نافہمی و حرص میں ہیں اکثر بدمست
کیا زید و بکر پہ معترض ہوتا ہے — اک گور پرست ہے تو اک زور پرست

ضعفِ مذہب کے ساتھ دولت و جاہ کی کمزوری

بھولے جاتے ہیں سڑی[2] بھی اپنی — مذہب کو بھی ضعیف پاتے ہیں ہم
ہے دولت و جاہ بھی کمی پہ ہر روز — ظاہر یہ ہے کہ مٹتے جاتے ہیں ہم

مذہبی عقیدوں میں کمزوری

اس بزم سے سب کے سب اُٹھے جاتے ہیں — تسکین کے جو تھے سبب اُٹھے جاتے ہیں
اک قوتِ مذہبی عقیدوں سے تھی — وہ بھی تو دلوں سے اب اُٹھے جاتے ہیں

مسلمان ہیں کہاں؟

وہ غیرتیں، وہ صبر، وہ ایمان ہیں کہاں — حُسنِ عمل کے دل میں وہ ارمان ہیں کہاں

[1] عہد الست سے بنی آدم کی تصدیق ربوبیت باری تعالیٰ کا وہ عہد مراد ہے جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی ج شَهِدْنَا یعنی خدا تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو پیدا کر کے اُن سے پوچھا تھا "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں اور سب نے جواب دیا تھا کہ بے شک تو ہمارا پروردگار ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں۔ [2] انگریزی لفظ "HISTORY" بھی تاریخ۔

اک غل مچا ہوا ہے کہ مسلم ہیں خستہ حال — پوچھے ذرا کوئی کہ مسلمان ہیں کہاں

غیرتِ دینی کا فقدان

توحید اُن کے دلوں میں محفوظ نہیں — اللہ کے ذکر سے یہ محظوظ نہیں
اس فرقۂ نو کو میں نے دیکھا اکبر — اِسلام اُن کی نظر میں ملحوظ نہیں

نماز اور وظیفہ کے ساتھ خلیفہ بھی رخصت

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت — کالج سے امام ابو حنیفہ[1] رخصت
صاحب سے سُنی ہے اب قیامت کی خبر — قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ[2] رخصت

یہ خودسری ہے یا خودکشی

جاتی رہی وعظ مذہبی کی قوت — ہر سر میں سمائی خودسری کی قوت
اطفال کو ناز ہے۔ مگر قومی آنکھ — روتی ہے کہ ہے یہ خودکشی کی قوت

[1] امام اعظم ابو حنیفہ کوفی رح جن کا اسم گرامی نعمان تھا اور جن کی طرف فقہ حنفی اور مسلک حنفی منسوب ہے۔

[2] ترکی سلطنت حضرت اکبر کے زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور ترکی کے بادشاہ کو خلیفۃ المسلمین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ سلطان عبد المجید خاں ترکی کے رجس کا دار الحکومت قسطنطنیہ تھا) آخری بادشاہ اور خلیفہ تھے جن کو ۱۹۰۹ء میں خود اُن کی رعایا نے معزول کر دیا تھا۔ اُن کی معزولی کے بعد سے خلافت ترکی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شیخ پر لاحول

شیطان کا سنا جو شیخ صاحب نے یہ قول — بولے فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول
میں خود ہوں بدل گیا زمانہ کے ساتھ — پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول[1]

اللہ کے نام کی تجارت

تحریک ضرورتِ معیشت ہے بہت — خرقے[2] کو بھی اب خیالِ خلعت[3] ہی بہت
خالق کے جمال کا تو سودا[4] کم ہے — اللہ[5] کے نام کی تجارت ہے بہت

از دست خویشتن فریاد

مذہب نے کہا کہ جان سے عاری ہیں — آپس ہی کے لوگ باعث خواری ہیں

[1] لاحول مخفف ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ جس کے معنی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی میں نہ قوت ہے نہ قدرت۔ یہ فقرہ مسلمان شیطانی وساوس و ترغیبات سے بچنے کے لئے بولا کرتے ہیں اور مجازاً کسی پر لاحول پڑھنے سے اس کا شیطانی اوصاف سے متصف ہونا مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب شیطان کو لاحول سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جو لاحول پڑھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں ان کے اندر زمانہ کے اثر سے ایسی شیطانی صفتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ دنیا خود ان پر اب لاحول پڑھنے لگی ہے۔ [2] [3] خرقہ بمعنی گدڑی مجازاً جامہ درویشی۔ خلعت بمعنی۔ بادشاہوں یا امیروں کی طرف سے انعام میں عطا کیا ہوا لباس۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے مذہبی پیشوا بھی زیادہ تر ارباب اقتدار کی خوشنودی اور دولتمندوں سے مالی منفعت حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں [4] سودا کے معنی عشق و محبت کے بھی ہیں اور خرید و فروخت کے بھی۔ یہاں مراد عشق و محبت ہے [5] یعنی ذکر خدا و رسول اور تقویٰ و تقدس کو زر اندوزی کا ذریعہ بنلایا جا رہا ہے۔

گویا قزاق تھے ہوئے ہیں اب اسیر — اپنوں ہی میں کچھ گواہ سرکاری[1] ہیں

صلح و محبت کم ہونے کی وجہ

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اٹھ گئی — ہر دل سے ہر گروہ سے ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ — یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے

آئین دین چھوڑنے کا نتیجہ

سوچا نہیں خود غرض کو آئین تو اب — جتنا چھوڑو گے ہم کو تم ہو گے خراب
واللہ یہی نتیجہ ہو گا پیدا — دنیا میں حقارت اور عقبیٰ میں عذاب

مصروفیات دنیا اور مذہب

شیخ صاحب کا نکل سکتا ہے مطلب کیونکر — نظر آسکتی ہے اب رونق مذہب کیونکر
کارِ دنیا سے فراغت ہی عزیزوں کو نہیں — پھر کہیں ان سے اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ[2] کیونکر

[1] گواہ سرکاری سے مراد ایسے گواہ ہیں جو معافی دیئے جانے کے وعدہ پر اقبال جرم کرنے اور دوسرے شریک کار مجرم کے خلاف شہادت دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ مذہبی طبقہ ہی میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو پیروانِ مذہب کو اس کا قصوروار ثابت کر رہے ہیں کہ رہبری کی بجائے قوم کی رہزنی کرتے ہیں [2] تلمیح ہے آیات قرآنی فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ترجمہ (دنیاوی تردداتسے) کسی قدر فراغت ہو تو (عبادت کی) ریاضت کرو اور اپنے رب کی طرف (پورے پورے) متوجہ ہو جاؤ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ رب کی طرف متوجہ ہونے کی تلقین ان مسلمانوں سے کیونکر کی جائے جن کو دنیا کمانے سے مہلت ہی نہیں ملتی۔

دین و دانش

قبلہ و کعبہ[1] کی دیر نشینی

مجھے سنائے یہ کہتا تھا ایک طفلِ ذہین
یہ سچ ہے ہم میں وفا و ادب کی بو بھی نہیں
سبب ہے اِس کا مگر صرف ضعفِ ملّت و دیں
جنابِ قبلہ[1] و کعبہ ہیں خود ہی دیر نشیں

نوجوانوں کی تعلیم اور رہائش

پڑھے اُس جا جہاں تاثیرِ ملّت جا نہیں سکتی
بسے اُس جا کہ آوازِ اذاں بھی آ نہیں سکتی
تمہیں کو ناز ہو اے نوجوانو اس طریقے پر
مری امید تو نغمہ خوشی کا گا نہیں سکتی

نہ وہ صورت ہے نہ وہ سیرت
نہ رنگ انجمن وہ ہے نہ وہ میکش نہ وہ ساقی
یہ دعوت کیا ہے بس ہے اک ادائے فرض اخلاقی
نہ وہ مکتب نہ وہ مُلّا نہ وہ صورت نہ وہ سیرت
سوا نام خدا کے اب رہا کیا قوم میں باقی

[1] قبلہ و کعبہ سے مراد ہادیانِ دین ہیں۔ یعنی جب ہمارے ہادیانِ دین خود ہی دین کے ساتھ وفاداری اور اس کا احترام نہیں کرتے تو بچوں سے ادب و وفا کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

بیلُون میں خدا سے باتیں

کیوں کرنے لگے وہ مجھ گدا سے باتیں — زوروں پہ ہیں کرتے ہیں ہوا سے باتیں
میں سجدے میں کہہ رہا ہوں سُبحان اللہ[1] — بیلُون[2] میں وہ کریں خدا سے باتیں

فہم اور وہم

حواس[3] و فہم میں اُلجھے ہوئے ہیں — برات[4] و سہم میں اُلجھے ہوئے ہیں
خدا تک ہے رسائی سخت دشوار — سب اپنے وہم میں اُلجھے ہوئے ہیں

اللہ کی یاد سے اطمینانِ قلب

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد — افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی — عقبیٰ کا تصوّر اور اللہ کی یاد[5]

---

[1] سُبحان اللہ کہنے کے معنی ہیں، عیوب و نقائص سے اللہ کے پاک و مبرا ہونے کا اظہار کرنا؛ اور یہ کلمۂ مدح و تعجب بھی ہے۔ یعنی کسی اچھی اور عجیب چیز کو دیکھ کر اس کی تعریف میں بولا جاتا ہے۔

[2] انگریزی لفظ BALLOON بمعنی غبارہ۔ بیلُون میں اُڑ کر خدا سے باتیں کرنے کا مطلب ہے کہ چند رازہائے قدرت و خلقت کائنات سے واقف ہو کر خدا کی ہمسری کی ڈینگیں مارنا۔

[3] حواس و فہم سے مراد سائنس و فلسفہ ہے۔

[4] برات و سہم کے معنی تحلیل و تجزی؛ سائنس اور فلسفہ دونوں تحلیل و تجزی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ عقل کی معراج ترقی یہی علوم ہیں اور خود ان علوم کا یہ حال ہے کہ اوہام سے آگے نہیں۔ (عبدالماجد دریابادی)

[5] بمصداق آیۂ کریمہ "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (یاد رکھو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے)

عظمتِ دنیا کے احساس کا مقابلہ

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو — لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو — خالق کا کرو خیال تکبیر[1] پڑھو

تدبیر جزوِ تقدیر

ہے عقلِ بشر بھی تابعِ حکمِ خدا — بے فائدہ سب میں بحث و تقریر ہے یہ
تدبیر کے باب میں ہے اُن کو شبہ — کہدو اکبر کہ جزوِ تقدیر[2] ہے یہ

سب کچھ خدا کا ہے

رُکتا نہیں انقلاب چارا کیا ہے — حیراں ہیں ملک بشر بچارا کیا ہے
تسکیں کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال — جو کچھ ہے خدا کا ہے ہمارا کیا ہے

۱؎ تکبیر پڑھنے کے معنی ہیں خدا کی بڑائی کا بیان کرنا۔ یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا۔

۲؎ تقدیر سے مراد وہ اندازہ ہے جو خدا تعالےٰ نے کائنات کے متعلق پہلے سے کر رکھا ہے۔ خدا نے انسانی عقل کو پیدا کرکے اس کا بھی اندازہ کر لیا تھا کہ انسان اس کی پیدا کی ہوئی عقل کو بھی کام میں لایا۔ یعنی تدبیر سے بھی کام لیا کرے گا۔ اس لئے تدبیر بھی تقدیر میں شامل اور تقدیر ہی کا ایک جزو ہے۔

خدا کا قرآن اور شیطان کا فلسفہ

قرآن[1] میں ہمیں خدا نے سمجھایا ہے — شیطان نے فلسفے[2] میں اُلجھایا ہے
قسمت اب دیکھئے ہے دل کی اکبر — معلوم نہیں کہ یہ کدھر آیا ہے

یہ سب ہے ایک ہستی کا ظہور

ایمان و حواس و حق پرستی کیا ہے — یہ غفلت و کفر و جوشِ مستی کیا ہے
لاریب یہ سب ہے ایک ہستی[3] کا ظہور — یہ مجھ سے نہ پوچھ پھر وہ ہستی[4] کیا ہے

رنج و راحت قابلِ وقعت نہیں

ہر قدم[5] در منزل ہستی مرا رنج و غمے است — حمد رب العالمین فرض است و ایں ہم عالمے است
رنج و راحت را دریں دنیا نباشد وقعتے — ایں جہاں یک روزہ ہست و عمر ما ہم یک دمے است

۱؎ و ۲؎ یعنی قرآن میں تو خدا نے ہم کو یہ سمجھایا ہے کہ ہدایت یاب ہونا چاہتے ہو تو غیب پر ایمان لے آؤ اور شیطان سائنس و فلسفہ کے چکر میں ڈال کر ہم سے یہ کہہ رہا ہے کہ جو بات تمہاری عقل میں نہ آئے اُس کو نہ مانو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا دل ہدایت قرآنی کو قبول کرتا ہے یا تلقین شیطانی کو۔ یعنی اس میں ایمان بالغیب کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ ۳؎ و ۴؎ یعنی یہ امر کہ تمام کائنات و مظاہر کائنات ایک ہی ہستی یا وجود مطلق کا ظہور ہے، نقلاً بھی ثابت ہے اور عقلاً بھی۔ رہا یہ سوال کہ وہ ایک ہستی کیا ہے اور کیسی ہے؟ اس کا جواب نہ تو انسان کی محدود عقل میں آ سکتا ہے اور نہ محدود زبان و اشارات سے دیا جا سکتا ہے۔ جلیل القدر انبیا نے بھی حقیقت ذات باری کا ادراک نہ کر سکنے میں اپنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ بقول عارف شیراز[6] "کہ خاصاں دریں رہ فرس رانده اند — بہ لا اُحصی از تگ فرو مانده اند" اور "دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار" ۵؎ ترجمہ ان اشعار کا یہ ہے۔ منزل ہستی میں ہر ہر قدم پر رنج و غم (باقی پر)

ذاتِ باری میں بحث بے سود ہے

جلوۂ ارض و سما دکھلا کے ہے نیچر بھی چپ / لا اِلٰہ اور قُل ہُوَ اللہ کہہ کے پیغمبر بھی چپ
بحث اُس کی ذات میں کیوں کر رہا ہے فلسفی / ایسے ایسے چپ ہیں یہ ہوتا نہیں اس پر بھی چپ

نیچر کے مُرید

اللہ کا صدق دل سے جو طالب ہو / حیرت نہیں گر ملک[1] کا ہم قالب ہو
ہرگز نہ بڑھیں گے اس سے نیچر کے مرید / ممکن نہیں جسم روح پر غالب ہو

(صفحہ ٧٥ کا بقیہ فٹ نوٹ) والے رنج و غم سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب عالموں کے پروردگار کی حمد فرض ہے اور دنیا دی زندگی کا عالم بھی ایک عالم ہے۔ اس دنیا میں نہ راحت کوئی قابلِ وقعت چیز ہے اور نہ رنج و مصیبت۔ اس لئے کہ یہ جہان بھی چند روزہ ہے اور ہماری زندگی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی رنج و مصیبت پر بھی ہمیں خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ اور یہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ دنیا اور اس کی تکلیفیں عارضی ہیں، دائمی راحت ہمیں دوسرے جہان میں ملنے والی ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جب نیچر یعنی مظاہرِ کائنات سے بھی اس کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ ایک ہستی ہے جس کا ارض و سما میں یہ سارا ظہور ہے اور پیغمبر بھی ذاتِ باری کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا کوئی دوسری ہستی اللہ بننے اور کہے جانے کے قابل نہیں ہے تو تعجب ہے کہ نیچر اور پیغمبر جیسے رہنمایانِ عقل و نقل کی خاموشی کی صورت میں فلسفہ کی کتابوں میں وجودِ باری کے متعلق یہ فضول بحثیں کیوں کی جاتی ہیں۔ حالانکہ بقول حکیم شیرازنہ تو ہماری عقل و حس اس کی ذات کی تہ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ ہمارا غور و فکر اُس کی صفات کی گہرائیوں تک ؎

نہ ادراک تا کنہ ذاتش رسد
نہ فکرت بغور صفاتش رسد

[3] مطلب یہ ہے کہ صدق دل سے اللہ کے طلب کرنے والوں کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ اُن کے خاکی جسم بھی فرشتوں کی طرح نوری ہو جائیں لیکن جو لوگ نیچر کو خدا بنائے ہوئے ہیں اُن کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی مادی ترقیات سے روح کو مغلوب کر لیں

یورپ کا آسمانی باپ اور برق اور بھاپ

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی[1] باپ کو / بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق[2] کو اور بھاپ کو
برق[3] گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائے گی بھاپ / دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

وہ سیانے ہم کالے

سیکھی[4] ولی دیر کے چراغ کی ساخت / کفر آلود تھی دماغ کی ساخت
وہ سیانے ہیں اور ہم کالے / دونوں میں مشترک ہے زاغ کی ساخت
کوا

نفس اور نیچر کو مخلوط نہ کرو

مخلوط کرو نہ نفس[5] و نیچر کو بہم / گو نفس نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم
جو بھوک لگے زبان کو وہ ٹھیک نہیں / نافع وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

[1] عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس لئے وہ خدا کو بھی آسمانی باپ کہا کرتے ہیں [2] برق اور بھاپ سے مراد برقی اور دخانی ایجادیں یعنی مشینیں وغیرہ ہیں۔ [3] یعنی یہی برقی اور دخانی ایجادیں جن کو یورپ نے اپنا خدا بنا رکھا ہے ایک دن سب کو تباہ کر کے رکھ دینگی۔ ایٹم بم وغیرہ تباہ کن آلات جنگ کی ایجادوں سے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ [4] مطلب یہ ہے کہ مغرب میں سائنس و حکمت کی جو روشنی ہو رہی ہے ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس روشنی کے موجدوں کے دماغ کفر آلود ہیں۔ مغرب کے لوگ سیانے یعنی عیار و چالاک سہی مگر ہم بھی سیانے کوّے کی ایک صفت اپنے اندر رکھتے ہیں یعنی کالے ہیں اس لئے دماغ کی کفر آلودگی کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ [5] نفس سے مراد یہاں شہوات و لذات ہیں۔ اور نیچر سے مراد خلق یا وجود۔ جن خواہشات طبعی کا پورا کرنا وجود یا زندگی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے وہ خلقی یا نیچرل خواہشات ہیں اور جن خواہشات سے حصول لذت مقصود ہوتی ہے وہ خواہشاتِ نفس، یا نفسانی خواہشات ہیں۔ خواہشات نفس بھی اگرچہ طبیعت یعنی نیچر ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ خلقی خواہشات پوری کئے بغیر زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ اور خواہشات نفس کا (باقی صفحہ ٧٨ پر)

علم و خرد کے بُت کی پرستش

اُس بت[1] نے کہا کہ تو ہے بے علم و خرد — کھول آنکھ زمانے کے موافق ہو جا
آخر میں کُھلا کہ اُس کا مطلب یہ تھا — اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہو جا

شیطان کا کوئی ممنون نہیں

سمجھے جو کوئی بُرا یہ مضمون نہیں — کوئی پہلو خلاف قانون نہیں
ہر چند کہ یہ مزے چکھاتا ہے بہت — شیطان کا کوئی شخص ممنون[2] نہیں

(صفحہ، کا بقیہ فٹ نوٹ) پورا کرنا بقار زندگی کے لئے ہمیشہ ضروری نہیں ہوتا۔ حضرت اکبر نے خلقی اور نفسی خواہشات کے فرق کو دوسرے شعر میں شکم اور زبان کی بھوک کے لطیف و بلیغ پیرایہ سے ظاہر کیا ہے۔ پیٹ کی بھوک میں کھانا کھانا ایک خواہش خلقی کا پورا کرنا ہے اِس لئے ایسا کھانا عموماً نافع بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ برخلاف اُس کھانے کے جو زبان کی بھوک رفع کرنے یعنی محض حصول لذت اور زبان کے چٹخارے کے لئے کھلیا جائے کیونکہ یہ محض خواہش نفس کو پورا کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے۔

[1] بُت سے مراد مغربی اقتدار کا بُت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ جس علم و خرد کی طرف لئے جا رہا ہے وہ ہمیں خدا سے برگشتہ کرنے والا اور مغرب کا پرستار بنانے والا ہے۔

[2] یعنی شیطانی خواہشات سے لذت اندوز ہونے کے باوجود کوئی شیطان کا احسان نہیں مانتا۔ سب اُس پر لعن طعن ہی کرتے ہیں۔

زندگی کس کی مرضی پر ہے

دیکھے[1] جو حوادث سماوی ارضی — قائم کر لی ہیں تو نے باتیں فرضی
بھولا ہے خدا کو تو ذرا غور تو کر — زندہ رکھتی ہے تجھ کو کس کی مرضی[2]

ہم کو کس نے چلا رکھا ہے

تو نے دل دہر سے ملا رکھا ہے — قایم غفلت کا سلسلہ رکھا ہے
کیا خود زندہ ہے اپنی طاقت سے تو — آخر کس نے تجھے جِلا[3] رکھا ہے

انجام موت ہے

جہانِ فانی کے حادثوں کا خیال کب تک کیا کرے گا
جو ہو رہا تھا وہ ہو رہا ہے جو ہو رہا ہے ہوا کرے گا
کہاں تک اخبار ہوں گے شائع نہ کر عبادت کا وقت ضائع
کمیٹیاں[4] قبر میں نہ ہوں گی نہ تو ہمیشہ جیا کرے گا

[1] و [2] یعنی حوادث ارضی و سماوی سے لوگوں کو مرتا دیکھ کر ممکن ہے تو نے یہ خیال کیا ہو کہ مرنے والوں کو مارنے والا خدا نہیں بلکہ وہ حوادث ہیں لیکن ذرا اس پر بھی تو غور کر کہ تو زندہ کیا اپنی مرضی سے ہے یا کسی اور کی مرضی سے اور وہ اگر خدا نہیں تو کون ہے [3] دیکھئے حاشیہ ۲۰ و ۲۱ [4] جمع بہت انگریزی لفظ کمیٹی COMMITTEE یعنی جلسہ۔

مرنا ہے ضرور اور قیامت برحق

دنیا میں جو ہو چکا ہے، کافی ہے سبق — کیا ہوگا قیاس[1] کیوں اُلٹتا ہے ورق
فتنوں کی جگہ یہ ہے سمجھ تو اتنا — مرنا ہے ضرور، اور قیامت برحق

فلسفہ اور دین کی دشمنی

فلسفہ حریف کا دین کا ہے عدو بنا — اُس طرف سے ہے کید سخت اور تیرا چھپنا
صبح و شام صدق سے کر دعا کہ ربنا[2] — لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا

دعوئے خدائی نہ کرو

نیکی کے حق میں کچھ ادائی نہ کرو — اللہ کے ساتھ بے وفائی نہ کرو
نیٹو[3] بھی رہو گے اور مرو گے بھی ضرور — کہتا ہوں کہ دعوئے[4] خدائی نہ کرو

[1] یعنی ماضی کے واقعات سامنے ہوتے ہوئے آیندہ کے متعلق قیاس آرائیوں کی کیا ضرورت ہے۔

[2] ربنا کے لفظ سے تیسرے مصرع کے آخر تک آیتِ قرآنی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو راہ راست پر لائے پیچھے ہمارے دلوں کو ڈانواڈول نہ کر۔

[3] لفظ انگریزی NATIVE بمعنی باشندۂ ملک۔ دیسی۔ انگریز ہندوستانیوں کو تحقیراً نیٹو کہا کرتے تھے۔

[4] دعوئے خدائی سے مراد خدا سے سرکشی کرنا ہے۔

مذہب کے قبول میں زیادہ دخل کس کو ہے؟

اکبر اس باب میں نہ کر فکر بہت — منطق[1] کے گھر میں کچھ نہیں اس کا علاج
مذہب کے قبول میں زیادہ ہیں دخیل — سوشل[2] افراد اور افتادِ مزاج

مادّے میں شعور کیسے پیدا ہوا؟

منکر ہیں روح کے جو یہ اہلِ غرور — اک امر ہے پوچھنا ہمیں اُن سے ضرور
بے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو — پیدا[3] ہوا مادّے میں کیونکر یہ شعور

عقل رازِ ازل تک نہ پہنچ سکی

عشق میں بے خود نہ تھا ابتر رہا مضطر رہا — دل دلیلوں کا تھا ساقی ہر طرف[4] ششدر رہا
گو ترقی کی خرد نے پھر بھی پستی میں رہی — جس جگہ پہنچی سمجھ رازِ[5] ازل برتر رہا

[1] منطق سے علوم حکمت مراد ہیں [2] Social بمعنی معاشرتی و تمدنی یعنی کسی مذہب کے قبول کرنے نہ کرنے میں آدمی کی اُفتادِ طبع اور اُن لوگوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جن کے ساتھ ہم رہتے سہتے ہیں [3] یعنی بے جان مادّے میں عقل و شعور کا پیدا ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل آج تک حکمائے مادّی پیش نہیں کر سکے۔ [4] یعنی اپنی محدود عقل پر بھروسہ کرنے والوں کو کبھی یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ اُن کے دل ہمیشہ غیر مطمئن اور پراگندہ رہتے ہیں۔ [5] علم و عقل میں جتنی ترقی ہوتی ہے اتنا ہی اپنی لاعلمی و بے عقلی کا احساس ہوتا ہے اور علم کی ہر سیڑھی پر چڑھنے کے بعد اُس سے اوپر کی سیڑھی پر چلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی اوپر کی سیڑھی رازِ ازل کی سیڑھی ہے جو طے کردہ منازل علمی سے ہمیشہ بلند تر ہوتی ہے۔

لامذہبی

ہستی سے قطع تعلّق نہیں کیا جا سکتا

پھری بھی رُت[1] تو میں نشو و نما کو کیا کرتا — نہ تھی وہ نکہت گل پھر صبا کو کیا کرتا
ارادہ تھا کہ میں ہستی سے کر لوں قطع نظر — نہ ہو سکا مگر ایسا خدا[2] کو کیا کرتا

جوش طاقت دلیل درازیٔ عمر نہیں

عمومی ہے خلقت نوازیٔ عمر — ہر اک کھیل لیتا ہے بازیٔ عمر
مگر یاد رکھ جوشِ طاقت فقط — نہیں ہے دلیلِ[3] درازیٔ عمر

خیال عقبےٰ اور نار و جنّت

اِس طرف تُو نے ہسٹری رٹ لی — اُس طرف جا کے فلسفہ پھانکا
لیکن اکبر خیال عقبےٰ سے — نار و جنّت کو بھی کبھی جھانکا

---

[1] و [2] رُت لفظ ہندی بمعنی فصل و موسم۔ مطلب غالباً یہ ہے کہ موسم نشو و نما کا یعنی زمانہ ترقیات کا آیا بھی تو میرے لئے بے کار تھا۔ اس لئے کہ اس نکہتِ گل کی یعنی میری روح دینی کی نشو و نما نہیں ہوتی تھی اس لئے میں اپنی ہستی ہی سے ایسا بیزار ہو گیا تھا کہ چاہتا تھا کہ اس کا خیال بھی نہ کروں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں بلکہ خدا کے اختیار میں تھا اور خدا کی مرضی یہ نہیں تھی کہ ایسا کروں۔ یا یہ کہ میری ہستی میں خدا کی ہستی سمائی ہوئی تھی اور اپنی ہستی سے منہ موڑنا گویا خدا سے منہ موڑنا تھا۔

[3] یعنی محض طاقت کا جوش ہونے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ عمر بھی طویل ہو گی۔ پہلوانوں کی عمریں عموماً زیادہ نہیں ہوا کرتیں،

پونی اور خرِ بے دُم

مذہب جس کی نظر سے بالکل گم ہے ۔۔۔ کیوں کر میں کہوں وہ داخلِ مردُم ہے
شائستہ جو ہو تو اس کو پونی[1] سمجھو ۔۔۔ ایسا جو نہ ہو تو اک خرِ بے دُم ہے

منکرِ خدا کے فہم کا قصور

منکر کے خیال میں پریشانی ہے ۔۔۔ اُس کا منشا فقط ہوس رانی ہے
دنیا فانی ہے وہ بھی ہے اِس کا مُقِر ۔۔۔ لیکن نہ سمجھ سکا کہ کیوں[2] فانی ہے

سرکار، پھٹکار اور بے رونقیٔ دربار

مذہب کے جو ہو رہیں تو سرکار کا خوف ۔۔۔ مذہب سے اگر پھریں تو پھٹکار کا خوف
دونوں سے اگر بچیں تو احباب کو ہے ۔۔۔ بے رونقیٔ دوکان و دربار[3] کا خوف

[1] لفظ انگریزی - PONY - بمعنی ٹٹو۔ یعنی چھوٹے قد کا گھوڑا: مطلب یہ ہے کہ لامذہب آدمی کو آدمی تو کہا نہیں جاسکتا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو اُسے اُچھلنے کودنے والا ٹٹو کہہ سکتے ہو۔ ورنہ وہ بے دم کا گدھا یعنی بالکل ہی کودن ہے۔

[2] یعنی منکرِ مذہب دنیا کے ذاتی ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکا کہ جو چیز فانی ہے اُس کا وجود اس کے اختیار میں نہیں، کسی دوسرے کے اختیار میں ہے

[3] یعنی جو شخص نہ مذہبی ہو نہ لامذہب اُس کے لئے آج کل دنیا دی کامیابیوں کا حاصل کرنا بہت مشتبہ ہے۔

فتح مذہب کی ہو گی

سائنس سے زیادہ ہے مذہب کی جڑ بڑی — توپوں کی مار سے بھی خدا کی پکڑ بڑی
بابو یہ کہتے ہیں کہ دھرم جیت جائے گا — اِس وقت گو ملکش[1] نے ڈالی ہے گڑبڑی

اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم — ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بُت نکال دیئے تھے رسولؐ نے — اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

توحید نہیں ہو گی تو الحاد ہو گا

باوجود علم رہ سکتا نہیں راحت میں ہند — وجہ یہ ہے مبتلا ہے شرک کی شامت میں ہند
جب نہ ہو توحید[2] تو الحاد غالب آئے گا — بُت پرستی کے سبب رہ جائے گا آفت میں ہند

---

[1] لفظ ہندی یعنی ملحد اور ناستک۔ یہاں مراد انگریز ہیں۔

[2] موحدوں کو خدائے واحد کا پورا یقین اور اس کی قدرت کاملہ پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ اور مشرکوں کے دل بہت سے معبودوں کی طرف متوجہ ہونے سے ڈانواڈول رہتے ہیں۔ اس لئے شرک کا مذہبی قلعہ توحید کے قلعہ کے مقابلہ میں کمزور ہوتا ہے اور اُس پر الحاد (بے دینی) کا قبضہ زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔

دھرم نہیں رہا تو ذات بھی نہیں رہے گی

دل دھرم سے اُٹھا ہے تو اب ذات بھی توڑو — ویراں ہوئی کھیتی تو عمارات بھی توڑو
برباد کرو خوبیِ منوجی[1] کے چمن کو — باقی نہ رہے پھول تو اب پات بھی توڑو

مست ہونے سے بے ہوش رہنا اچھا

شیطاں واعظ ہے پند[3] در گوش رہو — غالب ہے اسی کی بات خاموش رہو
بدلا پاتا ہوں مجلسِ دہر کا رنگ — مستی کی ہوس نہ ہو تو بے ہوش[4] رہو

دنیا نے دین کو بھلا رکھا ہے

دنیا نے دین کو بھلا رکھا ہے — غفلت کی نیند میں سُلا رکھا ہے
اِس دور میں خوش نصیب وہ ہے اکبرؔ — جس نے قرآن کو کھُلا رکھا ہے

---

[1] منوجی ہندوؤں کے دھرم شاستر کے بانی یعنی واضع قوانین ہوئے ہیں۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تفریقیں اور بندشیں ان ہی کی عائد کی ہوئی ہیں مطلب یہ ہے کہ جب ہندو مذہب ہی نہیں رہے گا تو ذات پات کی تفریق جسے پرانے خیال کے ہندو اب تک بہت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی نہیں رہے گی اور مذہب کا سا انتظام بگڑ جائے گا۔

[2] کانوں میں روئی ٹھونسنے رہو یعنی کان بند رکھو۔

[3] یعنی شیطانی تلقینوں سے بے خبر و بے ہوش رہنا اس سے اچھا ہے کہ تم شیطان کے ورغلانے میں آکر مست اور آپے سے باہر ہو جاؤ۔

شیعہ سُنّی

دنیا طلبی کا ہنگامہ

اللہ کا حق اگر تلف ہوتا ہے — اس کے لئے کون سربکفؑ ہوتا ہے
دنیا طلبی میں ہے یہ ہنگامہ و شور — حاصل پھر اس سے کیا شرف ہوتا ہے

شیطانی فلاسفی کی دی ہوئی آزادی

انساں چاہے جو بات اچھی چاہے — بدیوں سے محترز ہو۔ نیکی چاہے
شیطاںؑ سے وہ فلاسفی ہے منسوب — جس کا مطلب ہے۔ کر وہ جو جیؑ چاہے

دین میں دل کو چھپا لیا

زاہد کی طبع دیکھ کے اُس بت کو چلؑ گئی — وہ کیا تمام ملک میں اک دھوم مچ گئی
اکبر ہی تھا کہ دینؑ میں دل کو چھپا لیا — وہ بھی کہاں بچا یہ کہو جانؑ بچ گئی

ؑ سربکف ہونے کے معنی ہیں ہتھیلی پر سر رکھنا۔ یعنی جان دینے پر آمادہ ہونا۔

ؑ شیطانی فلسفہ یہ ہے Eat, drink and be happy for thouse shalt not come again
یعنی کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔ کیونکہ دوبارہ تمہیں یہاں آنا نہیں ہے۔ اس فلسفہ کا خلاصہ یہی ہے کہ جو جی چاہے کرو۔ مرنے کے بعد کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

ؑ چلنا۔ یعنی جھکنا۔ گرویدہ ہونا۔ بُت سے مراد نئی روشنی کا بت ہے۔

ؑ دین میں دل کو چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مذہبی عقیدوں کو اتنا مضبوط رکھا کہ دل پر نئی روشنی کا اثر نہیں ہو سکا۔

ؑ یعنی نئی روشنی کے اثرات سے بالکل محفوظ رہنا تو اکبر کے لئے ممکن نہیں تھا۔ مگر یہ غنیمت ہوا کہ اس کے دل پر لا مذہبی کا اثر نہیں ہوا اور وہ ہلاکت سے بچ گیا۔

شیعہ سُنی کی تفریق

بھائی مجھے کل یہ بات بی مُنّی[1] کی — تفریق اُڑا دو شیعہ[2] و سُنی کی
جیسا موقع ہو بس بٹھا دو وہ نگیں — ہیرے کی نہ شرط ہو نہ ضد حُبّی کی

(مشہور قیمتی جوہر) — (سرخ لعل کا چھوٹا)

چار یار اور پنج تن کی نیک نامی

شیعہ و سنی میں جنگ اک دھوم دھامی ہو گئی — چار یار[3] اور پنج تن[4] کی نیک نامی ہو گئی
کیا شرف بخشیں گی تم کو عرش پر یہ کاوشیں — جب زمیں پر تم کو غیروں کی غلامی ہو گئی
ایک قرآں ایک قبلہ ایک اللہ اک رسولؐ — بدنصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہو گئی

---

[1] بی مُنّی سے مراد متوسط طبقہ کی بھولی بھالی دین دار مسلمان عورت ہے۔

[2] شیعہ مسلمانوں کے اُس مذہبی فرقہ کو کہتے ہیں جو خلفائے اربعہ میں سے صرف حضرت علیؑ کی خلافت کا قائل ہے اور سنی اُن مسلمانوں کو جو چاروں خلفاء کو مانتے ہیں۔

[3] و [4] چار یار سے حضرت محمدؐ رسول اللہ کے چار رفیق و خلفاء مراد ہیں۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت عثمان غنیؓ۔ اور حضرت علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہم۔ اور پنج تن سے مراد اہل بیت ہیں۔ یعنی حضرت محمد رسول اللہؐ۔ آپ کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ۔ آپ کے چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی مرتضیٰؑ اور آپ کے دو نواسے حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ۔ نیک نامی کا لفظ یہاں طنزاً لکھا گیا ہے۔ مقصد بدنامی ہے۔ یعنی شیعہ سنی آپس میں لڑ کر خلفاء کو بھی بدنام کر رہے ہیں اور اہل بیت کو بھی۔ کیونکہ فرقہ وارانہ تعصب کے جوش میں اکابر بزرگان دین کو دونوں طرف سے برا بھلا کہا جا رہا ہے اور بدنام کیا جا رہا ہے۔

مومنانِ امن جُو[1]، کو دیر کی سوجھے گی اب — جب حرم کے صحن میں بدانتظامی ہوگئی
اشتعالِ[2] آتشِ افسردہ اس طوفان میں — پختہ طبعوں سے الٰہی کیوں یہ خامی ہوگئی

جس نے کھولی بہرِ صلح و آشتی اپنی زباں
پیشِ حق مقبول اس کی خوش کلامی ہوگئی

بناءِ شیعہ کالج

مرے عزیز ہیں شیعہ میں کس طرح یہ کہوں — کہ میں ہوں خوش جو ہوئی اُن کی درسگاہ[3] جُدا
دلی دعا ہے مگر یہ کہ رکنِ قوم رہیں — گریجویٹ[4] وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جُدا
بناءِ کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا — وہی ہے منزلِ مقصود گو ہے راہ جُدا
برائے دولت و آبرو ہے ایک ہی مرکز — نہیں ہے اب بھی طریقِ حصولِ جاہ جُدا
یہ دونوں سایۂ الطاف مغربی میں ہیں — نہیں ہے فضلِ الٰہی سے بادشاہ جُدا
یعنی زیرِ اثرِ تہذیبِ مغرب

[1] یعنی اسلام میں شیعہ سنی کے ان تفرقوں اور جھگڑوں کو دیکھ کر امن پسند مسلمانوں کے دل غیر مسلموں کی طرف مائل ہونے لگیں گے۔
[2] یعنی پکے دیندار مسلمانوں میں یہ خامی اور کمزوری خبر نہیں کیسے پیدا ہوگئی کہ انہوں نے مغربی لادینی کی شورش کے اس طوفان میں شیعہ سنی کے اختلافات کی دبی ہوئی آگ کو پھر بھڑکا دیا۔
[3] شیعہ حضرات نے فرقہ پرستی کے جوش میں علی گڑھ کالج میں سنیوں کا زیادہ دخل پاکر لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج اپنا الگ قائم کیا تھا۔ مگر مقاصد اس کے بھی تقریباً وہی تھے جو علی گڑھ کالج کے تھے، یہ قطعہ اسی شیعہ کالج کے قائم ہونے پر لکھا گیا۔
[4] گریجویٹ Graduate یعنی کسی علمی یا فنی درسگاہ کا سند یافتہ۔ عام طور پر بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کے لئے بولا جاتا ہے۔

جو نسخہ تھا رزولیشن کا ہے اِدھر بھی وہی — نہ کوئی حصین[1] جدا ہے نہ ہے سپاہ جدا
یہ دونوں اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں — نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ[2] جدا
زدین ایک ہے پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہوں — کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج — نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جُدا
شبِ وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت — جنہیں ہے ہجر وہ کرلیں گے اپنی آہ[1] جُدا
عجب نہیں جو بلندیٔ اتحاد بڑھے — دکھائے رنگ جو دنیا کا انتباہ[2] جدا
ہزار دور ہوں، اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں — کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا
مگن ہیں ٹیچر و انجینیر، رہے ذاکر[3] — وہ کر ہی لیں گے کسی طور سے نباہ جدا

ثوابِ نیک خیالی بھی پائے گا اکبر
سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جدا

[1] مطلب یہ ہے کہ سنیوں نے علی گڑھ میں اور شیعوں نے لکھنؤ میں اپنے اپنے کالج قائم کر کے معشوق مغربی سے وصال کے ذریعے نکال لئے اور وہ اپنی ان کامیابیوں پر نازاں اور مگن ہیں۔ مگر اکبر جیسے لوگ اپنے ہم قوموں کے اس وصال تہذیب مغربی کو دین وملت سے ہجر سمجھ کر اس پر افسوس کر رہے ہیں۔
[2] یعنی ممکن ہے کہ دنیا کوئی ایسا رنگ بدلے جس سے متنبہ ہو کر ان فرقہ وارانہ درسگاہوں کے قائم کرنے والوں کے خیالات بلند ہو جائیں اور ان میں اتحاد بڑھ جائے۔
[3] ذاکر یعنی ذکر کرنے والے یعنی خدا کی دل سے یاد کرنے اور اس سے بندگی کا سچا تعلق رکھنے والے۔ شیعوں میں شہادت امام حسینؑ کا ذکر کرنے والے بھی ذاکر کہلاتے ہیں۔

شیعہ سُنی کے جھگڑے پر فیصلے

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے جھگڑے کو شیعہ سُنی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش تم بھی ملکش وہ بھی
بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انہیں فرنگی کے پاس پہنچا
وہ بولا بس دور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو[۱] ہو وہ بھی نیٹو
فلک[۲] نے آخر ہر اک کی سُن کر کہا کہ تم سب ہو مست غفلت
سمجھ لو اس کو کہ تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

---

[۱] Native " دیسی۔ تحقیراً کالے آدمی۔

[۲] فلک سے مراد قدرت ہے۔

پند
و
موعظت

شراب شیطان کی پرائیویٹ سکریٹری

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن مے ہے — انسان کو خراب کرنیوالی شے ہے

شیطان کی ہے پرائیویٹ سکریٹری[1] — مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

سعیٔ بازو اور حسن تدبیر

باپ سے مانگو نہ عشرت نہ چچا سے مانگو — سعی بازو پہ کرو تکیہ خدا سے مانگو

حسن تدبیر بڑی چیز ہے اس دنیا میں — مدد اس کام میں تم عقلِ رسا سے مانگو

ناصح بہت، عامل مفقود

اس عہد میں یہی ہے بس دخل نکوئی — مذہب پہ نکتہ چینی ملت کی عیب جوئی

شوقِ عمل نہیں ہے فکرِ اجل نہیں ہے — ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہے کوئی

بال سفید عمل سیاہ

افسوس سفید ہو گئے بال ترے — لیکن ہیں سیاہ اب بھی اعمال ترے

[1] انگریزی لفظ Private Secretary یعنی پیشکار نجی۔ شیطان کی پرائیویٹ سکریٹری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بھی وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو شیطان میں ہیں۔ مگر ذرا دبکی اور چھپی ہوئی۔ یعنی شراب کو منہ لگانے اور اس کا عادی ہو جانے سے شرابی کے اندر بھی رفتہ رفتہ تمام شیطانی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

تو زلفِ بتاں بنا ہوا ہے اب تک　　دنیا پہ ہنوز پڑتے ہیں جال[1] ترے

پتلون کو لنگوٹی کر دینے والی شراب

جو عقل کھری تھی، کی وہ کھوٹی اِس نے　　اچھے اچھوں سے چھینی روٹی اِس نے
مستوں پہ شراب فاقہ مستی لائی　　پتلون کو کر دیا لنگوٹی[2] اِس نے

کینہ پروری بڑی بری چیز ہے

اونچانیت کا اپنی زینہ رکھنا　　احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل[3] ہے اکبر　　لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

ذلت کے جینے سے مرنا اچھا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا　　افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی　　جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

---

[1] یعنی تیرے سفید بال بھی زلفِ بتاں کی طرح دنیا کو اپنے جال میں پھنسا رہے ہیں۔ [2] یعنی جو خوشحال و فارغ البال تھے شراب کے عادی ہو کر بھوکے ننگے ہو گئے۔ [3] لفظ انگریزی NATURAL یعنی طبعی یا اقتضاءِ طبع۔

رشوت، عیاشی، خوشامد، اور گستاخی

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھرا[1]　　عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دُھرا[2]
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری　　گستاخ[3] مگر خوشامدی[4] سے بُرا

بے حیا سے مکّار اچھا

آزاد سے دیں کا گرفتار اچھا　　شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہر چند کہ زُور بھی ہے اک خصلت بد　　واللہ کہ بے حیا[5] سے مکّار اچھا

وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا[6]

کرمِ حق پہ رکھ نظر اپنی　　جو عقیدہ ترا نہ ہو ڈھیلا
آسرا سب کا چھوڑ دے اکبر　　وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا

---

[1] یعنی رشوت لینے سے نیک نامی کے گلے پر چھری پھر جاتی اور آدمی بدنام ہو جاتا ہے۔
[2] دُھرا۔ لوہے کی اُس سلاخ یا ڈنڈے کو کہتے ہیں جس پر پہیہ پھرتا ہے۔ یعنی عیاشی سے بدچلنی کا رستہ کھل جاتا ہے۔
[3] و [4] یعنی گستاخ بے محل تعریف کرنے والے خوشامدی سے بھی بُرا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ گستاخی کا محرک جذبہ سرکشی ہوتا ہے اور خوشامد کا محرک احساس کم تری و فروتنی۔
[5] بے حیا سے مکّار کو اس لئے اچھا کہا گیا ہے کہ بے حیا میں احساس ندامت و شرمندگی باقی نہیں رہتا اور مکّار میں یہ احساس موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے مکّار اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کیا کرتا ہے۔
[6] یہ آیت قرآنی ہے جس کا مفہوم ہے۔ ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

ہم رنگ سے ارتباط، بے میل سے احتراز

مذموم ہے رمز و طعنہ و کبر و حسد — رکھو یہ روش کرے جو اللہ مدد
ہم رنگ[۱] سے ارتباط با صدق و صفا — بے میل[۲] سے احتراز بے کینہ و کد

مرنے کے بعد

فرمانِ اجل کا آگیا وقتِ صدور — ہوں گے کوئی دم میں شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر[۳] کیا کہتے ہیں — یاں سب مجھے کہتے ہیں خداوند حضور

حاسد کا احساسِ پستی

حاسد تجھ پر اگر حسد[۴] کرتا ہے — کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس — اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

---

۱ ہم رنگ بمعنی ہم خیال و ہم مذاق و ہم مشرب۔ ایسے شخص سے تعلقات بڑھانے چاہئیں مگر سچائی اور خلوص کے ساتھ۔

۲ بے میل۔ یعنی جو ہم مذاق و ہم مشرب نہ ہو اُس سے میل جول نہیں بڑھانا چاہیے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے کینہ و پرخاش رکھا جائے۔

۳ منکر نکیر۔ جن کو نکیرین بھی کہتے ہیں۔ اُن دو فرشتوں کا نام ہے جو مرنے کے بعد مردہ سے اُس کے ایمان و عقائد کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں تو سب مجھے خداوند حضور کہہ کر مخاطب کرتے ہیں یعنی بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آتے ہیں مگر خبر نہیں کہ مرنے کے بعد منکر نکیر میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ کیونکہ مرنے کے بعد تو دنیاوی عزت کی نہیں بلکہ نیک اعمال ہی کی پرسش ہوتی ہے۔

۴ حسد کسی کی ترقی و خوشحالی سے جلنے اور اس کے زوال کی آرزو کرنے کو کہتے ہیں۔ حسد کا مرض حاسد میں اپنی پستی کے احساس اور محسود (جس سے حسد کیا جائے) کی ترقی کو دیکھ کر کڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ حاسد اپنی کم ہمتی سے خود تو ترقی نہیں کر سکتا اور ہمیشہ محسود کی ترقی سے جلا کرتا ہے۔ اس لئے حسد کا نقصان محسود کے مقابلہ میں حاسد کو

رَبِّ یَسِّر اور تَمِّمْ بِالْخَیْر

بے سود ہے یہ شکوہ و لفاظی و سیر — افسوس ہے مخلصوں کو اور ہنستے ہیں غیر
چلیے ابجد سے رَبِّ یَسِّر[۱] کہہ کر — ہو سکتی ہے تب امید تَمِّمْ بِالْخَیْر[۲]

اثر انداز کہنا اور سننا

کہنے سننے کی گرم بازاری سے — مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں
ایسا سنئے کہ کہنے والا ابھرے — ایسی کہئے کہ بیٹھ جائے دل میں

اللہ پر بھروسہ رکھو

خاطر مضبوط دل توانا رکھو — امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں — اکبر اللہ پر بھروسا رکھو

اصلی دولت، زینت اور عزت

تحصیلِ علوم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت[۳] — محفوظ ہو معصیت سے عزت ہے یہی

---

۱ و ۲۔ رَبِّ یَسِّر اور تَمِّمْ بِالْخَیْر ماخوذ ہے دعاء قدسی رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ وَتَمِّمْ بِالْخَیْر سے جس کا ترجمہ ہے "اے رب میرے آسان کر دے اور مشکل نہ کر اور خیریت سے انجام کو پہنچا دے۔ تَمِّمْ بِالْخَیْر کے معنی ہیں ختم ہو گیا ساتھ خیریت کے۔

۳ سید عشرت حسین مرحوم حضرت اکبر کے بڑے صاحبزادے تھے۔

خوشی سے مرنا سیکھو

اعمال کے حُسن سے سنورنا سیکھو — اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر — بہتر ہے[1] یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اللہ کو دل میں بساؤ

دنیائے دنی کی یہ ہوس جانے دو — گلچیں ہو اگر تو خار و خس[2] جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ — اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

ایمان کو مضبوط رکھو

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ — تا دمِ مرگ رہے یادِ خدا جان کے ساتھ
میں نے مانا کہ تمہاری نہیں سنتا کوئی — سر[3] ملانا تمہیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

---

[1] یعنی ایسی زندگی بسر کرو کہ مرنے کے خیال سے تم کو رنج نہیں بلکہ خوشی ہو۔

[2] یعنی اگر دنیا کے گلچیں ہونا یعنی دنیاوی زندگی سے عقبیٰ کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اس کے خار و خس یعنی ایسی چیزوں کے پیچھے نہ پڑو جن سے تکلیف پہنچے یا جو عقبیٰ میں کام نہ آئیں۔

[3] شیطان کے ساتھ سر ملانا بمعنی ہم نوا ہونا۔ یعنی شیطانی حرکتیں کرنا۔

خدا کی یاد میں دونوں جہان کا نفع

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی — اور ذکرِ خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اُس سے بڑھ کر — بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

صوفی اور مُلّا کا اختلاف

ہستی[1] نے جگایا ہے، کیونکر کہوں سو رہیئے — اتنی ہی نصیحت ہے اللہ کے ہو رہیئے
اے صوفی و اے مُلّا، اتنی ہی گذارش ہے — معنی میں رہے وحدت الفاظ میں دو رہیئے

تم کو خدا نے دیا ہے تو دوسروں کو بھی دو

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر — دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو — جو اہل ہیں اس کے اُن کی تعظیم بھی کر

نمودِ بے سود اور اچھل کود کو چھوڑ

یہ تھی غلطی وہ جو معبود کو چھوڑ — اصلاح یہ ہے، نمودِ بے سود[2] کو چھوڑ

---

[1] یعنی جب خدا نے زندگی دی ہے تو میں یہ کیونکر کہوں کہ مر جاؤ۔

[2] یعنی مقصد میں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ خواہ مسلک الگ الگ ہوں۔

اخلاق
و
معاشرت

بزم ملت کا عافیت جو ہے اگر (خواہاں) — اللہ کے آگے جھک اچھل[1] کود کو چھوڑ

ماں باپ کی رضا جوئی

کہہ دو کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ[2] کو خوش — بجلی[3] چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے — ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

قومی عزت نیکیوں سے ہے

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو — باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے نقل انگریز کرو

نفس حریص کی غلامی

دنیا طلبی میں عاجزی کی تو نے — دینی اکرام کیا کیا، کچھ نہ کیا
بس نفس حریص کا رہا تو خادم — اللہ کا کام کیا کیا، کچھ نہ کیا

---

[1] اچھل کود سے یہاں مراد روش بندگی کی بجائے روش آزادیِ جدید کا اختیار کرنا ہے۔

[2] آپ سے مراد پیروانِ مغرب ہیں۔

[3] یعنی برقی اور دخانی مشینوں سے کام لے کر اسباب راحت و عیش مہیا کروں۔

اصلی اور نقلی معاشرت

آگاہ ہوں معنیٔ خوش اقبالی سے — واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر — چلتا نہیں کام صرف نقالی[1] سے

معیارِ عزّت عمل نیک ہے

سمجھیں نہ حضور تھرڈ والوں کو حقیر — انجن تو وہی ہے جس کی ہم سب کو ہے آس
اسٹیشن گو رتک ہے یہ فسٹ و سکنڈ — بعد اس کے موافق عمل ہوگا کلاس

---

[1] یعنی محض بڑے لوگوں کے لباس یا چال ڈھال وغیرہ کی نقل کرنے سے کوئی بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔ بڑا اور معزز آدمی بننے کے لئے بڑے آدمیوں کی سی قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

[2] تھرڈ THIRD بمعنی تیسرا۔ فسٹ FIRST کا ہندی بمعنی پہلا۔ سیکنڈ Second بمعنی دوسرا۔ کلاس Class بمعنی درجہ۔ یہ سب انگریزی الفاظ ہیں۔ ریلوں میں مسافروں کی حیثیتوں کے لحاظ سے تین درجے ہوا کرتے ہیں۔ اعلیٰ حیثیت کے مسافر درجہ اول میں اُن سے کم حیثیت کے درجہ دوم میں اور سب سے کم حیثیت کے درجہ سوم میں سفر کرتے ہیں۔ مگر ریل کا چلانے والا انجن جس کے بغیر کوئی مسافر منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا ایک ہی ہوتا ہے۔ ان شعروں میں انسانی زندگی کو ریل سے اور اس کے چلانے والے، یعنی حکم خدا کو انجن سے تشبیہ دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ دنیاوی زندگی میں اعلیٰ۔ ادنیٰ اور بڑے چھوٹے کی جو تفریق ہم کو نظر آرہی ہے وہ اسی وقت تک ہے جب تک کہ زندگی کی ریل اپنے اسٹیشن یعنی قبر تک نہیں پہنچ جاتی یعنی جب تک کہ موت نہیں آجاتی۔ مرنے کے بعد مدارج و مراتب کی سب تفریقیں ختم ہوجاتی ہیں اور اس کے بعد جو درجہ انسان کو ملتا ہے وہ اس کے عمل کے مطابق ملتا ہے اور یہی درجہ خدا کے نزدیک معتبر ہوتا ہے حسب ارشاد۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ یعنی تم میں سب سے زیادہ ذی عزت وہ ہے جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ نیک عمل ہے۔

دولت و لذت، راحت و عزت

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے — لذت وہ ہے کہ جوشِ صحت[1] سے ملے
ایماں کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے — عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

ترقیِ باطن

انبساطِ نفس الگ ہے، روح کا وجد اور ہے — دشت[2] وحشت[3] اور ہے، اور وادیِ[4] نجد اور ہے
ہو جو باطن کی ترقی تجھ کو منظورِ نظر — یاد رکھ اکبر تکبر[5] اور ہے، تمجد[6] اور ہے

رذیل فطرت کثیف دل

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگِ دیں — دنیا کی جس کو شرم ہے مردِ شریف ہے

[1] جوشِ صحت سے صحت کا اتنا زیادہ اچھا ہونا مراد ہے کہ خود اپنی صحت ہی سے انسان کو لذت حاصل ہونے لگے۔

[2] و [3] و [4] اس شعر کے دوسرے مصرع میں صنعتِ لف و نشر غیر مرتب ہے۔ یعنی دشت وحشت جس کا مصرع دوم میں پہلے ذکر ہے اس کا تعلق پہلے مصرع میں روح کے وجد سے ہے اور وادیِ نجد جس کا ذکر دوسرے مصرع کے بعد میں ہے اس کا تعلق انبساطِ نفس سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبساطِ نفس یعنی نفس کی خوشی اور روح کا وجد ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ کیفیتیں ہیں۔ انبساطِ نفس کی کیفیت تو وہ تھی جو لیلیٰ کے عاشق قیس کو لیلیٰ کے مسکن وادیِ نجد میں حاصل ہوتی تھی اور جس میں قیس کو لذتِ عشق محسوس ہوتی اور اس کے ہوش و حواس بجا رہتے تھے۔ اور روح کے وجد کی کیفیت وہ تھی جو قیس کو وارفتہ و بے خود کر کے صحرا نوردی پر آمادہ کر دیتی تھی اور جس میں نہ تو لذتِ عشق کا احساس باقی رہتا تھا اور نہ خارِ مغیلاں اور دشت پیمائی کی تکلیف کا۔

[5] و [6] تکبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ گھمنڈ اور غرور کرنا۔ اور تمجد کے معنی ہیں بزرگوار ہونا۔ بڑا ہونا۔ ظاہر کی ترقی سے تکبر یعنی بزرگی کی نمایش کا احساس ہوتا ہے اور باطن کی ترقی سے تمجد یعنی اپنی خودی کی برتری و بزرگی کا۔

جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں — فطرتاً[1] ہیں وہ رذیل ہر دل کا کثیف ہے

علالتِ اخلاق

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے — بے غیرت و بے دلیل[2] ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو — اخلاق میں[3] وہ علیل ہو جاتی ہے

دولت و شہرت بڑھنے کا سودا

سب کو سودا ہے یہی دولت بڑھے شہرت بڑھے — اس کا کیا غم، چپکے ہی[4] چپکے اگر شامت بڑھے
اب کہاں اگلی لگاوٹ (محبت)، اور وہ اظہارِ نیاز — بات[5] یہ ہے، وقت بدلا، میں گھٹا، حضرت بڑھے

[1] یعنی جس کو نہ خدا کی شرم ہے نہ دنیا کی وہ فطرتاً ہی رذیل و بے شرم واقع ہوا ہے۔

[2] دلیل کے معنی رہبر کے بھی ہیں۔ یعنی جو قوم دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو جاتی ہے اس کا ضمیر بھی اس کی رہنمائی کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس میں شرم و غیرت کا احساس باقی نہیں رہتا۔

[3] یعنی اس میں اخلاقی بیماریاں اور بد اطواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

[4] یعنی غیر محسوس طور پر زندگی کو گھن لگتا رہے۔

[5] یعنی دوستوں میں پہلی سی محبت و نیازمندی نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ میری حالت گر گئی اور وہ بڑے آدمی ہو گئے۔

رنگین اور سادہ جھوٹ

تصدیق[1] ادھر بشوق اُدھر بالارادہ جھوٹ	اس سے زیادہ مکر نہ اس سے زیادہ جھوٹ
عارض[2] نہ ان کا گل ہے نہ دل میرا آئینہ	رنگین جھوٹ[3] وہ ہے اگر یہ ہے سادہ جھوٹ

حرص، قناعت اور محنت

حصہ حریص[4] کا ہے بے دینی و غلامی	قانع کے واسطے ہے اعزاز و نیک نامی
محنت ہی کے لئے ہے تفریح قلب و روزی	مقبول دوستاں ہے اکبر کی خوش کلامی

[1]۔[2]۔[3] یعنی اُدھر تو بالارادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔ اور ادھر نہایت شوق سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے ایسے جھوٹ سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں اور ایسی تصدیق سے بڑھ کر کوئی مکر نہیں۔

محبوب کے رخسار کو گل کہا جائے یا اپنے دل کو آئینہ، دونوں باتیں حقیقت سے بعید یعنی جھوٹی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلا جھوٹ (بہ رعایتِ گل) رنگین ہے اور دوسرا جھوٹ (بہ رعایت آئینہ) سادہ غرضیکہ ہم خواہ ان کی تعریف کریں یا اپنی صاف بیانی کا دعوے، دونوں غلط ہیں حضرت اکبر کا یہ قطعہ حسب معمول عاشقانہ الفاظ میں سیاسی طنز کا حامل ہے اور اُس طبقے کا ترجمان جو انگریز کی سہو دانستہ غلط بیانی کی پُرزور تائید پر آمادہ رہا کرتا تھا۔ اس "تصدیق" کی عادت کا مفہوم ایک اور شعر میں اس طرح ادا کیا ہے

جو کہا اُس نے، کیا منظور، کیسا حرف نفی
ہم سراپا اب تو اس محفل میں جی ہاں ہو گئے (رشید ملتانی)

[4]۔ حریص کے معنی ہیں بڑا لالچی۔ یعنی لالچ جب حد سے بڑھتا ہے تو آدمی اپنا دین بھی بیچ دیتا ہے اور اپنی آزادی بھی۔ برخلاف اس کے قانع یعنی وہ جو اپنی حالت پر راضی اور مطمئن ہوتا ہے اس کی عزت و نیک نامی برقرار رہتی ہے۔

لیاقت، وجاہت اور شرافت

انساں[1] میں معتبر لیاقت بھی ہے	محسوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
اندازِ[2] سخن سے بھی ہے اندازِ طبیع	ایک جزوِ قوی مگر شرافت بھی ہے

حد سے بڑھی ہوئی حرص اور خود بینی

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے	دشوار انسان کو ضبط[3] ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی	اکثر ہے یہی کہ خبط[4] ہو جاتا ہے

حرص و ہوس سے بے غیرتی پیدا ہوتی ہے

ہے حرص[5] و ہوس کے فن کی مجھ کو تکمیل	غیرت نہیں میری بزم دانش میں دخیل
ہیں نفس کی خواہشیں بہت مجھ کو عزیز	جب چاہیں کریں خوشی سے مجھ کو وہ ذلیل

[1] مطلب یہ ہے کہ اچھا انسان بننے کے لئے لیاقت کی بھی ضرورت ہے۔ وجاہت کی بھی۔ خوش کلامی کی بھی اور سب سے زیادہ شرافت کی۔

[2] یعنی بات کرنے کے طریقے سے بھی بات کرنے والے کی طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

[3] ضبط بمعنی روکنا۔ یعنی شیطان سے میل ہونے کے بعد پھر انسان اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

[4] یعنی حد سے بڑھے ہوئے لالچ اور غرور کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

[5] یعنی حرص و ہوس میری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ غیرت سے کام لینے کی ضرورت ہی میں نہیں سمجھتا۔ بس میری خواہشیں پوری ہو جانی چاہئیں خواہ مجھے کوئی کتنا ہی ذلیل کیوں نہ کرے۔

بصائر و حکم

بے شرم و سرد مہر حسین

دل کش نہیں وہ حسین جسے شرم نہیں — رونق نہیں اس کی جس کا دل گرم[1] نہیں
سختی[2] میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف — پگھلی ہے برف گو کہ وہ نرم نہیں

مذہب، ادب اور خاکساری

تہذیب وہ ہے کہ رنگ مذہب بھی ہو — آزاد وہ ہے کہ جو مؤدب بھی ہو
تزئین (زیب و زینت) وہ ہے کہ خاکساری بھی ہو ساتھ — اسپیچ (تقریر) وہ ہے کہ جس میں یارب بھی ہو

دِل داریٔ و طلب گاریٔ دنیا

دل وہ ہے، محو ہو ہر دم طلب باری میں — زندگی وہ، جو کٹے موت کی تیاری میں
حسن اخلاق ہے دل داریٔ[3] دنیا کرنا — خطرہ جو کچھ ہے، وہ دنیا کی طلب گاری[4] میں

---

[1] گرم دل سے مراد پسیجنے والا یعنی غیرت و ہمدردی کا احساس رکھنے والا دل ہے۔

[2] یعنی جس کی طینت صاف اور باطن کثافت سے پاک ہوتا ہے وہ برف کی طرح بظاہر سخت ہونے کے باوجود پگھلنے والا ہوتا ہے، یعنی دوسروں کے دکھ درد سے متاثر ہوتا ہے۔

[3] و [4] دل داری دنیا سے مراد ہے دنیا والوں کے دکھ درد میں شریک ہونا۔ اور طلبگاری دنیا سے مراد ہے دنیا کی الفت و محبت رکھنا جو خطرناک ہے۔

نورِ لاہوت اور بھوت

عبرت، عرفاں (معرفت خدا)، سوزِ (تڑپ) دل جس کا تھا شغل — روح اس کی نکل کے نورِ لاہوت[1] بنی
خوانِ برگڈ[2] پہ جو رہا شلِ مگس[4] — جان اس کی کسی گودام کی بھوت[3] بنی

فطری اور مصنوعی خوبی

فطری خوبی ہے مبتلا فالج[1] میں — بلبل داخل ہے میوزیکل[2] کالج میں
داخل میں نوائے (آواز) ساز کی کس کو ہے خبر — رعشہ[3] (لرزہ-حرکت) ہر سُر کو ہے مگر خارج میں

---

[1] لاہوت عالم ذاتِ الٰہی کو کہتے ہیں، جہاں پہنچنے پر سالک راہ طریقت کو مرتبۂ فنا فی اللہ (اللہ کی ذات میں فنا ہو جانا) حاصل ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا کے خاص بندے انقلابات جہاں سے عبرت حاصل کرتے اور معرفت الٰہی میں کوشاں اور حصول دیدار الٰہی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں مرنے کے بعد اُن کی روح فنا فی اللہ یعنی ذات حق سے واصل ہو جاتی ہے [2] لفظ انگریزی "BRIGADE" بمعنی پیدل اور رسالہ کی ملی جلی فوج جو ایک بریگیڈیر جنرل کی ماتحتی میں ہو۔ یہ لفظ کلام اکبر میں اکثر جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد غالباً انگریزوں کی فوجی چھاؤنیاں ہیں جن کی خوراکی اور دوسری ضروریات کے بہم پہنچانے پر بہت سے ہندوستانیوں کی معیشت کا دارومدار تھا [3] بھوت خبیث روح یا آسیب کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی دنیا میں اٹکی اور پھنسی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حصول دنیا میں جائز و ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے اور مکھیوں کی طرح ذرائع معیشت سے ساری عمر چمٹے رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی ان کی روحوں کو دنیا سے آزادی نہیں ملتی اور سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

[1] فالج ایک مشہور بیماری ہے جس میں انسان کا پورا جسم یا جسم کا کوئی حصہ بے حس و بے حرکت ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصنوعی ذرائع ترقی یعنی ایجادات و اختراعات کی وجہ سے انسان کی فطری قابلیتیں اور خوبیاں مفلوج یعنی شل ہو کر رہ گئی ہیں اور فطری کمالات کی قدر بہت کم ہو گئی ہے [2] لفظ انگریزی " Musical college " بمعنی درسگاہ موسیقی مطلب یہ ہے کہ بلبل جیسے خوش الحانوں کے بھی فطری گانوں کی قدر نہیں رہی اور ان کو بھی گانا سیکھنے کے لئے موسیقی کی درسگاہوں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آ گئی۔ (باقی صفحہ ۱۱۶ پر)

درعمل کوش ہرچہ خواہی پوش

بی شیخانی بھی ہیں بہت ذی ہوش — کہتی ہیں شیخ سے بجوش وخروش
خواہ لنگی[1] ہو خواہ ہو تہمد — درعمل[2] کوش ہرچہ خواہی پوش

مذہبی غول بندی

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے — کہنے لگے اس سے تیرا مطلب کیا ہے
میں نے یہ کہا کہ غول[3] بندی کے لئے — بولا کہ شکست کھا چکے اب کیا ہے

پیر فرنگ کی حکمت

رندی و شراب و بزم شاہد بھی ہے — منطق بھی ہے دلیل ملحد بھی ہے
لیکن قربان حکمت پیر[4] مغاں — دو مولوی بھی ہیں ایک مسجد بھی ہے

(صفحہ ۱۱۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) مطلب یہ ہے کہ فطری اور اندرونی قابلیتوں کو کوئی نہیں دیکھتا اس لئے سب اپنے خارجی اور مصنوعی کمالات کی نمائش کر رہے ہیں۔ [1] لنگی اور تہمد دونوں قریب قریب ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کپڑا جو عموماً پاجامہ کی بجائے ستر پوشی کے لئے کمر سے باندھا جاتا ہے۔ مگر یہاں لنگی سے مراد غالباً دھوتی ہے جو ہندوؤں کا پہناوا ہے۔ [2] یہ مصرع شیخ سعدیؒ کا ہے۔ مطلب یہ ہو کہ جو چاہے پہنو مگر نیک کردار بنو۔ [3] غول بندی بمعنی اپنی جماعت یا ٹولی بنانا۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا مقصد مذہبی بننے سے محض ایک ٹولی یا قومیت کو مضبوط کرنا تھا ان کو تو دوسری ٹولیوں نے شکست دیدی ہے۔ اب تو ضرورت دنیا کے لئے نہیں بلکہ دین کے لئے اور نمائشی نہیں بلکہ سچے مسلمان بننے کی ہے۔ [4] پیر مغاں کے لفظی معنی ہیں آتش پرستوں کا پیر۔ استعمال اس کا زیادہ تر رند مشرب اور چالاک پیروں کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد انگریز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریز ایسے عقلمند اور مدبر حکمران ہیں کہ ان کی حکومت میں رندی و عیاشی بھی ہوتی ہے اور سائنس و فلسفہ اور لامذہبی و آزاد منشی کی تبلیغ بھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی مسجدیں بھی موجود ہیں اور مولوی بھی اور ایک مسجد کے لئے ایک ہی نہیں بلکہ دو دو مولوی تاکہ وہ خدا پرستوں کو آپس میں لڑاتے بھی رہیں۔

کام میرا نام آپ کا

میں نے جو کہا کہ انتظام آپ کا ہے — ہے فائدہ آپ کا یہ کام آپ کا ہے
کہنے لگے مسکرا کے یہ سب ہے صحیح — لیکن خوش ہو جئے کہ نام[1] آپ کا ہے

مُردہ زندگی

انسان جو عمر ختم کر چکتا ہے — خوش ہو چکتا ہے آہ بھر چکتا ہے
فانی دنیا کا دیکھ لیتا ہے رنگ — زندہ جو رہا بھی وہ تو مر[2] چکتا ہے

ذلیل اور بے غیرت دنیا

دنیا کو بہت ذلیل پایا میں نے — بے غیرت و بے دلیل[3] پایا میں نے
اخلاقی پہلوؤں سے جانچا اکبر — شدت سے اسے علیل پایا میں نے

[1] مطلب یہ ہے کہ ہوم رول یا حکومت خود اختیاری مل جانے کے بعد بھی حکومتی پرزوں کے چلانے والے اور حکومت سے فائدہ اٹھانے والے تو انگریز ہی ہیں۔ نام البتہ ہندوستانیوں کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی حکومت آپ چلا رہے ہیں [2] یعنی پیر فانی یا ایسا شخص جو عمر طبعی کو پہنچ چکا ہو۔ اگر زندہ بھی رہے تو اس کی زندگی بیکار ہے اور وہ زندہ درگور کہلانے کا مستحق ہے [3] دلیل کے معنی رہنما کے بھی ہیں اور حجت و بحث کے بھی۔ بے دلیل سے یہاں مراد ایسے اکھڑوں سے ہے جو بلا کسی وجہ معقول کے دوسروں سے الجھتے اور اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ دنیا میں جہاں ذلیل و بے غیرت لوگ بہت ہیں وہاں اکھڑ اور کٹھ حجتی بھی کافی ہیں۔

جینا اور مرنا

جینا تھا جس قدر ہمیں دنیا میں جی لئے
ساغر کئی طرح کے ملے اور پی لئے

غم بھی رہا خوشی بھی تحیر بھی فکر بھی
جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم بس[1] اسی لئے

طاقت و عزت اور تعلیم و تربیت

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے
اُس جا ہے چمک جہاں زر افشانی[2] ہے

تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر
اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

حاضر و غائب خدا

یہ دربار ہے خالق دو جہاں کا
ادب اپنا سکہ بٹھلائے ہوئے ہے

نہ سمجھو کہ حاضر نہیں حق تعالیٰ
یہ عالم[3] خود آنکھیں جھکائے ہوئے ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ زندگی اسی کا نام ہے کہ آدمی زندگی کے ہر رنگ کو دیکھے۔ ہر دور میں سے گذرے اور عمر طبیعی کو پہنچ کر ختم ہو جائے

[2] زر افشانی سے مراد ہے دولت مندی و فیاضی یعنی عزت ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو دولت مند بھی ہوں اور فیاض بھی۔

[3] مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ موجود تو ہر شے میں اور ہر جگہ ہے۔ مگر اس کی ذات ایسی با عظمت و بارعب ہے کہ کسی کو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جسارت نہیں ہوتی۔ یعنی خود عظمت و جلال خداوندی ہی نے اس کو مخلوق کی نظروں سے چھپا رکھا ہے۔

عالم و عاقل

عالم نے یہاں قبول[1] درد کو جانا
دیکھا دنیا کو نیک و بد کو جانا

عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگام عمل
اپنی قوت[2] کو اپنی حد کو جانا

واقفیت کی آخری منزل

ہر اک سے سنا نیا فسانا ہم نے
دیکھا دنیا میں اک زمانا ہم نے

اول یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز
آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا[3] ہم نے

وہی غفلتیں اور وہی کلیلیں

یہ ہو سکا تو پھر کیا، وہ ہو گیا تو پھر کیا
خواب لحد میں انساں جب سو[4] گیا تو پھر کیا

---

[1] یعنی یہ معلوم کیا کہ کونسی چیزیں قابل قبول یعنی اختیار کر لینے کے قابل ہیں اور کون سی "رد" کر دینے یعنی چھوڑ دینے کے قابل۔

[2] یعنی جن چیزوں کے متعلق علم سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اختیار کی جا سکتی ہیں ان کے اختیار کرنے اور ان سے کام لینے میں بھی یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا ہماری قوت اور ہمارے حالات بھی ان کو اختیار کرنے کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں اور اجازت دیتے ہیں تو کس حد تک۔ یہ فیصلہ کرنا عقل کا کام ہے اور عالم و عاقل میں فرق یہی ہے کہ عالم کو صرف علم ہوتا ہے اور عاقل اسی علم سے کام لینے کے آداب اور موقع و محل کو بھی سمجھتا ہے۔ [3] یعنی جب تک آدمی کا علم ناقص اور عقل خام رہتی ہے وہ اپنی معلومات اور واقفیت پر فخر کیا کرتا ہے لیکن دنیا کے نشیب و فراز کو دیکھنے اور نئے نئے تجربے حاصل کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اُسے کچھ نہیں آتا۔ (باقی ۱۲۰ پر)

پھر غفلتیں وہی ہیں اور پھر وہی کلیلیں (اچھل کود) — مجلس میں آ کے دم بھر وہ رہ گیا تو پھر کیا

الفاظ سے غلط فہمی

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبرؔ — بڑی مایوسیوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے
یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اسکا عاشق صادق — مگر کہتی ہے خلقت شمع سے پروانہ[1] جلتا ہے

ظاہر اور باطن

دنیا[2] کی طمع میں وہ پھسلا اور میں نے خدا کا نام لیا — لغزش سے وہ خاک آلودہوا اور صبر نے مجھ کو تھام لیا
ظاہر کا ادب ملحوظ رہا، باطن بھی مگر محفوظ رہا — واعظ سے اِدھر اک بات سُنی، ساقی[3] سے اُدھر اک جام لیا

(صفحہ ۱۱۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) یعنی جتنا انسان کا علم اور تجربہ بڑھتا ہے اتنا ہی اس کو اپنی لاعلمی اور بے عقلی کا سبق حاصل ہوتا ہے اور سب سے بڑا درجہ اسی عالم کا ہوتا ہے جو بہت کچھ جاننے پر بھی یہ جانتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

[1] مطلب یہ ہے کہ الفاظ سے کبھی بڑی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں اور ان کا مطلب کچھ کا کچھ نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً پروانہ کے شمع پر قربان ہونے کو شمع سے پروانہ کا جلنا کہا جاتا ہے۔ جس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پروانہ شمع سے جلتا یعنی یا اُس سے حسد رکھتا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پروانہ شمع کا عاشق ہوتا ہے اس کا جلنا سوزِ عشق کا ہوتا ہے نہ کہ سوزِ حسد کا۔ [2] یعنی دنیاوی حرص و ہوس میں انسان راہِ مستقیم سے پھسل جاتا اور ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے مگر جو لوگ صبر و قناعت سے کام لیتے اور خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں دنیاوی حرص و طمع سے ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا ہوتی۔ [3] اس شعر کا پہلے شعر سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے۔ اس میں طنزاً ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ظاہر میں تو شرعی ادب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں لیکن در پردہ حظِ نفس کے لئے معصیتوں کا بھی ارتکاب کر لیتے ہیں۔

ماضی و حال

زبانِ خلق صرف داستاں بود — کہ در دنیا چنیں بود و چناں بود
نگاہم بود محوِ جلوہ[1] حال — بطبعم آنچہ آمد میہماں بود

حُسن کی طاقت سے مجبوری

شوق شہرت بھی بُرا زر کی بُری چاہ بھی ہے — نفرت انگیز نظر میں ہوس جاہ بھی ہے
ہاں مگر حسنِ بتاں زہرہ جبیں آفتِ دیں — اس سے مجبور تو یہ بندۂ[2] درگاہ بھی ہے

بے ہوش اور منہ سئے ہوئے باہوش

اکثر وہی بزرگ ہیں جو ہیں پیئے ہوئے — باہوش کم ہیں اُن کے بھی منہ ہیں سئے ہوئے

[1] مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی زبان پر عام طور پر گذشتہ زمانہ کے قصے رہتے ہیں کہ دنیا میں یہ ہوا تھا اور وہ ہوا تھا مگر میری آنکھیں تو حال کے جلوؤں یعنی اُن واقعات کے دیکھنے میں محو ہیں جو اِس وقت گزر رہے ہیں۔ واقعات حاضرہ کے علاوہ کسی پچھلی بات کا خیال دل میں آتا بھی ہے تو وہ ایک عارضی میہمان کی حیثیت سے آتا ہے یعنی اُس کا کوئی مستقل اثر دل قبول نہیں کرتا۔

[2] بندۂ درگاہ سے مراد غالباً وہ حضرات صوفیہ ہیں جو حسن پرستی کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ حضرت اکبر کہتے ہیں کہ ان کو دوسرے مذہبی پیشواؤں کی طرح جاہ و شہرت کی ہوس تو نہیں ہوتی اور نہ زر و مال کی محبت لیکن دل ربا مہ جبینوں اور حسین بتوں کے حسن پر وہ بھی مفتون و مدہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر نہ انہیں ننگ و ناموس کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ زہد و تقویٰ کی۔ بقول حضرت حافظ شیرازیؒ ؎
شیخ کنعاں خرقہ رہن خانۂ خمار داشت

ہرگز کوئی کہے گا نہ اس انجمنؔ کا راز
کیوں اپنے آپ کو ہے پریشاں کئے ہوئے

اچھا رنگ ڈھنگ

بھائے جو نگاہ کو وہی رنگ اچھا
لائے جو راہ پر وہی ڈھنگ اچھا
قرآن و نماز سے اگر دل نہ ہو گرم
ہنگامۂ رقص و مطرب و چنگ اچھاؔ

چشم بینا کا قحط

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

ؔ۱ اس انجمن سے مراد یہ کائنات یعنی ساری مخلوقات خدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کائنات اور اس کی خلقت اور اس کے خالق کا راز معلوم کرنے کے درپے ہیں وہ اس بے سود کوشش میں فضول پریشان ہوتے ہیں۔ یہ راز جن خدا رسیدہ بزرگوں کو معلوم ہے ان میں سے اکثر بیہوش یعنی عرفان الٰہی کی شراب سے مست و بے خود ہیں۔ اور بعض جو ہوش میں ہیں ان کے منہ سی دیئے گئے ہیں۔ یعنی ان کی زبان سے افشائے راز کی قدرت سلب کر لی گئی ہے۔ بقول حضرت سعدیؒ کے۔ ع کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

ؔ۲ مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی محبت و اطاعت کا جذبہ پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ سب سے بہتر ذریعہ تو اس کے لئے تلاوت قرآن اور پابندی نماز ہی کا ہے لیکن اگر ان ذریعوں سے کسی کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور ناچ و رنگ اور گانے بجانے ہی سے اس کے اندر ذوق محبت الٰہی پیدا ہوتا ہے تو پھر اسے حصول مطلوب کا ذریعہ رقص و سرود ہی کو بنانا چاہیئے۔ چنانچہ رہ و رسم پارسائی کی مشکلات سے گھبرا کر کبھی عراقیؔ جیسے طالبان خدا کو بھی رہ قلندری کا کوئی رہنما ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ جیسا کہ ان کے اس مشہور شعر سے ظاہر ہے۔
رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

کامل کم اہل ارشاد بہت

کامل کم ہیں اور اہل ارشاد بہت
ساحرؔ کم ہیں اور ملیں گے صیاد بہت
ہے بزم سخن کا حال یہ اے اکبر
شاعر کم ہیں مگر ہیں استادؔ بہت

انقلابات جہاں

انقلاب جہاں کو دیکھ لیا
حب دنیا سے قلب پاک ہوا
کل کلی کھل کے ہو گئی تھی پھول
پھول کمھلا کے آج خاک ہواؔ

سب خدا کے محتاج ہیں

کہنے کو تو شاہ سب ہیں مہراج ہیں سب
مالک دولت کے۔ مالک تاج ہیں سب
لیکن کھولو جو چشم تحقیق اکبر!
بے بس ہیں سب، خدا کے محتاج ہیں سب

ؔ۱ ساحر یعنی جادوگر، سے یہاں مراد ایسے لوگ ہیں جو اپنے علمی یا روحانی کمال سے دلوں کو مسخر اور اپنا تابع کر سکتے ہوں۔ اور صیاد شکاری کو کہتے ہیں خاص کر چڑیمار یا مچھلی کا شکار کرنے والوں کو جو چال بازی اور دھوکے سے پرندوں اور جانوروں کو پکڑتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صاحب کمال تو بہت کم ہیں جو اپنی قابلیت اور کمال سے لوگوں کو اپنا معتقد اور گرویدہ کر سکیں۔ زیادہ تر ایسے ہیں جنہوں نے مکاری و ریاکاری کا جال بچھا رکھا ہے اور چال بازی سے لوگوں کو اپنا معتقد بنا رہے ہیں۔ ؔ۲ استاد سے مراد شاعری کے وہ استاد ہیں جو خود تو شعر کہہ نہیں سکتے مگر دوسروں کے شعروں پر اصلاح دیا کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کامل اور قابل لوگ تو کم ہوتے جا رہے ہیں۔ خود نما، ریاکار اور دھوکہ باز بڑھ رہے ہیں ؔ۳ یعنی جس دنیا کی یہ کیفیت ہو کہ اس میں دن رات عروج و زوال اور پیدائش و موت کے انقلابات آتے رہتے ہوں۔ جہاں پھول آج کھلتا اور کل مرجھا جاتا ہو اس سے دل لگانا کسی اہل بصیرت اور عقلمند کا کام نہیں ہے۔

راحت، عزت اور آدمیت

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر رہے بے کار — مذہب جو نہیں تو آدمیت[1] بھی نہیں

غفلت اور عبرت

راحت کا سماں بندھا تو غفلت بھی ہوئی — حسرت کا کھنچا جو سین[2] عبرت بھی ہوئی
دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبر — بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

زینت دنیا

یہ زینت دنیا ہے کہ مٹی پہ[3] ہے پنی — بچوں کے سوا کون ہوا اس کا متمنی
گوش شنوا ہو تو سنو اس کے ترانے — اس بزم میں اکبر سا نہیں کوئی مغنی

[1] یعنی بغیر پیروی و پابندی مذہب کے انسان میں وہ خصائل حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے جو انسانیت اور آدمیت یعنی اشرف مخلوق ہونے کا امتیاز قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں [2] سین لفظ انگریزی Scene یعنی منظر۔ تماشا۔ تھیٹر کا پردہ۔ اس شعر میں مفہوم ہے اس آیہ کریمہ کا وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝ جب آدمی پر ہم اپنا فضل و کرم کرتے ہیں تو وہ ہماری طرف سے منہ پھیر لیتا اور ہم سے کنارہ کش ہو جاتا ہے (یعنی غفلت برتتا ہے) اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ یعنی عبرت و نصیحت حاصل کر کے پھر ہماری طرف متوجہ ہو جاتا ہے [3] یعنی زینت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے مٹی پر پنی (یعنی چمکدار، روپہلا یا سنہرا کاغذ) چڑھا دی ہو۔ ہے تو وہ مٹی ہی مگر جس طرح بچوں کو مٹی کے چمکدار کھلونوں سے بڑی دل چسپی ہوتی ہے اسی طرح ناسمجھ لوگ دنیا کی حقیقت کو بھول کر اس کے زیب و زینت یعنی عیش و راحت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

دورِ فنا میں ہر بات برائے نام

منظور اے دل ہماری عرضی ہوگی — اس وقت کہ جب خدا کی مرضی ہوگی
اس دورِ فنا میں ہو گی لیکن جو بات — وہ[1] صرف برائے نام و فرضی ہوگی

ہنسنے والے ہنستے ہیں رونے والا کوئی نہیں

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لئے — اور دکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت — مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

قدر شناس کی تحسین اور ناقدر شناس کی شاگردی

مبتلا ہو کر اگر دنیا کو پہچانا تو کیا — دام میں پھنس کر اگر صیاد کو جانا تو کیا
تھوڑی سی تحسین[2] بھی اہل نظر کی ہے بہت — بے بصیرت نے اگر استاد بھی مانا تو کیا

[1] مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کبھی دنیاوی راحت یا عزت کے لئے خدا سے دعا کرے گا۔ اگر خدا کی مرضی ہوئی تو وہ دعا قبول تو ہو جائے گی لیکن راحت یا عزت جو اس دار فنا میں حاصل ہو گی وہ محض نام کی اور فرضی راحت و عزت ہو گی۔ حقیقی راحت و عزت تو آخرت ہی میں ملے گی۔ [2] اس شعر کا پہلے شعر سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں اپنی کوئی قابلیت دکھاتا ہے۔ اگر کوئی اس قابلیت کو سمجھنے والا کام کی تھوڑی سی بھی تعریف کر دے تو اس سے کام کرنے والے کا دل بڑھتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا شخص جو قابلیت کو سمجھ ہی نہ سکتا ہو وہ قابلیت ظاہر کرنے والے کو اپنا استاد بھی بنا لے تو اس سے کام کرنے والے کو کوئی خوشی نہیں ہوتی۔

چمن دہر کو گلے کا ہار نہ بناؤ

حضور عرض کروں میں جو ناگوار نہ ہو — وہ یہ کہ موت ہی بہتر ہے جب وقار نہ ہو
الٰہی یہ چمن دہر مجھ پہ بار نہ ہو — دکھادے دور سے رنگت گلے کا ہار نہ ہو

عزم و عمل کی کمزوری

دقت میں ہیں سب، اک اک کا منہ تکتا ہے — خاموش کوئی ہے، اور کوئی بکتا ہے
ہونا بھی چاہیئے، کہوں یہ کیونکر — لیکن یہ کہوں گا، ہو بھی سکتا ہے

نہ دل پر میرا بس ہے نہ زبان پر

حالت پہلی سی کہاں اب میری ہے — حیرت انگیز داستاں میری ہے
سینہ میرا ہے دل نہیں ہے میرا — میری نہیں بات گو زباں میری ہے

لہ گلے کا ہار ہو جانا محاورہ ہے بمعنی پیچھا نہ چھوڑنا۔ وبال جان ہو جانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں کو جو مجھے حاصل ہوں میں گلے کا ہار بنانا نہیں چاہتا کہ وہ میرے لئے وبال جان ہو جائیں۔ اس لئے خدا مجھے ایسی توفیق دے کہ میں صرف دنیاوی ضرورتیں ان سے پوری کروں۔ دل میں اُن کی محبت نہ رکھوں۔

ٮه و ٮه مطلب یہ ہے کہ ہمارا عزم و عمل اور قوت فیصلہ اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ ہم خاموش رہ کر یا فضول بحثیں کر کے صرف یہ سوچا کرتے ہیں کہ جو بات ہم چاہتے ہیں کہ ہو وہ ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہی ہونا چاہیئے کہ جو ہم چاہتے ہیں۔ ٮه یعنی دل میرے سینے میں ضرور ہے مگر میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ جو جذبات میں اس میں پیدا کرنا چاہتا ہوں وہ اس میں پیدا نہیں ہوتے (باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

گرم جوشی ختم سودائے خودفروشی رخصت

باقی نہیں رہی وہ دنیا سے گرم جوشی — اب میں ہوں اور عزلت اور عالم خموشی
اپنے ہی دل کے ہاتھ اب بک گیا ہوں اکبر — سر میں نہیں رہا وہ سودا لئے خود فروشی

آبادی پر طاعون کا ٹیکس

افسوس ہے بدگماں کی آزادی پر — خالق کبھی خوش نہ ہو گا بربادی پر
طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر — یہ تو اک ٹیکس ہے اس آبادی پر

تغیرات و انقلابات

جہاں نے ساز بدلا ساز نے نغموں کی گت بدلی — گتوں نے رنگ بدلا رنگ نے یاروں کی مت بدلی
فلک نے دور بدلا دور نے انسان کو بدلا — گئے سہم تم بدل قانون بدلا سلطنت بدلی

چکر۔ زمانہ

(صفحہ ۱۲۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) یعنی دل دماغ کا ساتھ نہیں دیتا اور زبان بھی اگرچہ تو میری لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ زبان سے نہیں نکلتی بلکہ وقت اور حالات کی مصلحتوں کو دیکھ کر ایسی باتیں زبان سے کہنی پڑتی ہیں جو میرے دل و دماغ کی ترجمانی نہیں کرتیں۔

لہ یعنی جب تک دل زندہ تھا اور اس میں گرم جوشی موجود تھی۔ اسی وقت تک تو دنیا کی خارجی دلچسپیوں میں اپنے آپ کو محو کر دینے کا مجھے جنون ہوا کرتا تھا لیکن اب ایسی افسردگی طاری ہوئی ہے کہ میں کسی اور کے ہاتھ بکنے کی بجائے خود اپنے دل کے ہاتھ بک گیا ہوں یعنی سوائے اپنے دل کے بجھے اور کسی چیز سے دل بستگی و دلچسپی نہیں ہوتی۔ ٮه غالباً ان اشعار میں مصنف نے عام لوگوں کے اس خیال کو کہ طاعون (گلٹی کی وبائی بیماری) ایک عذاب الٰہی ہے اور اس کے نازل کرنے سے خدا کا مقصد اپنی مخلوق کو تباہ کرنا ہے۔ غلط فہمی اور بدگمانی سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہہ کر اس خیال کی تردید کی ہے کہ کوئی بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کے مٹانے اور برباد کرنے سے خوش نہیں ہوتا۔ طاعون کے متعلق یہ دلچسپ شاعرانہ بات کہی ہے کہ وہ آبادی پر ایک ٹیکس ہے۔ یعنی جس طرح بقدر نصاب مال محذر رکھنے پر اس کا کچھ حصہ (باقی ۱۲۸ پر)

(اس صفحہ کا نوٹ نمبر ۳ صفحہ ۱۲۸ پر ہے)

سچی دوستی قابل قدر

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب — اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثل نسیم وہ گلے سے لگ جائے — مانند[1] کلی کے پھول جانا اچھا

کہتا ہے کم آل جس کو حاصل ہی کمال

دل ہو جو وسیع اور روشن ہو خیال — ہر رنگ دکھلائے تجھ کو خالق کا جمال
ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر — کہتا ہے کم آل[2] جس کو حاصل ہی کمال

لغزش بے ارادہ

خواہان علم نہ طالب گنج ہیں ہم — بے کینہ و بے ریا و بے رنج ہیں ہم

(صفحہ ۱۲۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) خدا کے نام پر دنیا پر تا ہے۔ جس کو زکوٰۃ یا مال کا خدائی ٹیکس کہتے ہیں۔ اسی طرح جب آبادی بڑھ جاتی ہے تو اس میں سے بھی خدا اپنا حصہ طاعون وغیرہ وبائی بیماریوں کے ذریعہ سے لیتا ہے۔ عقلی توجیہہ اس شاعرانہ خیال کی یہ کی جا سکتی ہے کہ وبائی بیماریاں عموماً آبادی کی کثرت کی وجہ سے ہوتی ہیں یعنی جب کسی شہر یا قصبہ وغیرہ کی آبادی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس میں لوگ حفظان صحت کی پابندی کر کے نہیں رہ سکتے تو وہ طاعون وغیرہ وبائی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۷ کا فوٹ نمبر ۳ یعنی زمانہ کا رنگ بدلا تو ہمارے اطوار و اخلاق بھی بدل گئے اور ہماری عقل و فہم بھی۔ اور جب ہمارے اندر یہ اہم تبدیلیاں ہو گئیں تو ضروری تھا کہ قانون اور حکومت بھی بدلے۔

[1] یعنی جس طرح بہار کی خوشگوار ہوا کے ہم آغوش ہونے سے کلیاں کھل کھل کر پھول ہو جاتی ہیں [2] کم آل۔ دو انگریزی لفظ ہیں All come جن کے معنی ہیں آجاؤ سب۔ مطلب یہ ہے کہ حصول کمال سے جن کے دل وسیع اور باطنی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں ان کو اچھے اور برے ہر رنگ میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ موافق و مخالف سب سے یہی کہتے ہیں کہ تم سب ہمارے ہو آؤ اور ہم سے ملو۔ کسی سے پرہیز اور نفرت نہیں کرتے۔ کمال میں کم آل کی لفظی ہی نہیں بلکہ روحانی تجنیس کا پیدا کرنا ایک اکبری کمال ہے۔

لغزش ہو کوئی تو دوست فرمائیں معاف — آزاد ہیں مست ہیں سخن سنج ہیں ہم

چرب زبانی اور خلوص

انوار اس دور کے دل افروز ہیں کم — گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب[1] زباں نہیں ہے شمع اخلاص — جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

نیکی اور بدی، زندگی اور موت

بارہا[2] جوش جنوں میں مجھے آیا ہے خیال — کہ تماشا ہے یہ ہنگامۂ نیکی و بدی
نظر[3] عشق میں ہے زندگی و موت اکبر — اضطراب نفس چند و سکون ابدی

راز دہر نہ کھلنے کا شکوہ

ہنگامۂ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم — لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے

[1] چرب زبان یعنی چکنی چپڑی باتیں کرنے والا۔ یعنی زبان سے ہمدردی کرنے والے تو اس زمانہ میں سب ہی جو یہ دکھلاتے ہیں کہ وہ تمہاری تکلیف اور مصیبت سے کڑھ رہے اور جل رہے ہیں۔ مگر حقیقتاً ان میں دل سوزی یعنی تمہارے ساتھ دلی ہمدردی نہیں ہوتی۔
[2] یعنی جب عقل نیکی اور بدی کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت کو نہیں سمجھ سکی تو دماغ پر مایوسی سے ایک جنونی کیفیت طاری ہوئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ نیکی کوئی حقیقت رکھتی ہے اور نہ بدی بلکہ قدرت نے دنیا کے سٹیج پر نیکی اور بدی کے غیر حقیقی مناظر کا ایک تماشا دکھایا ہے۔
[3] یعنی جب زندگی اور موت کو ایک عاشق حق کی نظر سے دیکھا اور یہ کیفیت ہم پر طاری ہوئی کہ زندگی نے ہم کو ہماری اصل یعنی ذات باری سے چھڑا دیا اور دور کر دیا ہے اور موت پھر ہم کو اسی سے واصل کرنے والی ہے جس کے ہم ہیں ہمارے دل میں اپنی اصل یعنی ذات باری سے واصل ہونے کا ایک اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور فانی زندگی کے جو دن بھی گزرتے ہیں اسی اضطراب میں گزرتے ہیں کہ کب موت آئے اور کب سکون ابدی حاصل ہو۔

کھلتا[1] نہیں رازِ دہر شکوہ ہے تو یہ ۔۔۔ اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

کام کا عِلم

انساں[2] یا تو بہت سے دلوں کو ملا سکے ۔۔۔ یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو عِلم سمجھتے ہیں کام کا ۔۔۔ پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

تقدیر اور اتفاقات

لکچر[3] سے نہ ہے نہ کچھ خیالات سے ہے ۔۔۔ تہذیب سے ہے نہ ترکِ عادات سے ہے
اکبر بخدا یہ کامیابی ساری ۔۔۔ تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

---

[1] یعنی یوں تو دنیا میں سب کو تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں اور راحتیں بھی۔ لوگ خدا کی شکایتیں بھی کرتے ہیں اور خدا کا شکر بھی۔ لیکن مجھے تو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ رازِ دہر نہیں کھلتا یعنی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس دنیا کے پیدا کرنے سے خدا کا مقصد کیا ہے اور سب سے زیادہ قابلِ شکر یعنی دل کو راحت پہنچانے والی چیز مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان زندگی کی الجھنوں میں مبتلا رہنے کے لئے ہمیشہ زندہ نہیں رہتا اور مرنے کے بعد اس کو سکون ابدی حاصل ہو جاتا ہے۔ [2] یعنی کام کا علم یا تو وہ ہے جس پر عمل کر کے انسان میں ایسے خصائل حسنہ پیدا ہوں کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو جائیں یا جس کے ذریعہ سے وہ کوئی ایجاد و اختراع کر سکے جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔

[3] یعنی جن قومی اور سیاسی کامیابیوں کو ہم اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں وہ نہ تو جلسوں اور لکچروں کا نتیجہ ہیں اور نہ پرانی عادات چھوڑ کر نئی تہذیب اختیار کرنے کا۔ بلکہ یہ کامیابیاں محض اس وجہ سے ہو رہی ہیں کہ دنیا کے سیاسی حالات اتفاق سے ہمارے موافق ہو گئے ہیں یعنی ان کامیابیوں میں تدبیر کو نہیں بلکہ تقدیر کو دخل ہے۔

سلطان مسلمان اور شیطان

تھا سر میں کمال وہ تو سلطان بنا ۔۔۔ تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا ۔۔۔ تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

(مذہب سے آزادی)

منزلِ عدم کیلئے ریل بیکار

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں ۔۔۔ مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزلِ عدم اے اکبر ۔۔۔ اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

(یعنی موت) (یعنی مادی ذرائع)

موت کے بعد صرف اعمال کام آتے ہیں

کہا احباب نے یہ دفن کے وقت ۔۔۔ کہ ہم کیونکر وہاں کا حال جانیں
لحد تک آپ کی تعظیم کر دی ۔۔۔ اب آگے آپ کے اعمال جانیں

(قبر)

انسان، ایمان اور مسلمان

اُلفت اور ادب نہیں تو انسان نہیں ۔۔۔ بے صبر[1] و سکوں جو ہو تو ایمان نہیں

---

[1] یعنی اگر انسان بے صبر اور غیر مطمئن ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ایمان کمزور ہے۔ یعنی اُسے خدا پر پورا بھروسہ اور پورا یقین نہیں ہے۔

جو غیر خدا کو مانتا ہو قادر — اکبر بخدا کہ وہ مسلمان نہیں[۱]

شوق عزت، ذوق زینت، زور ملت

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم — دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم
مسجد[۲] سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا — مذہب جو مٹا تو زورِ ملت معدوم

دل، ایمان اور عاقبت

خبر[۳] دل کی ہوس دل خواہ جانے — خبر ایماں کی حبِ جاہ جانے
رہی اب عاقبت کی بحث اکبر — تو اس کا حال تو اللہ جانے

خلقِ خدا سے ملو مگر خدا کے واسطے

کچھ شک نہیں کہ خلق سے ملنا ضرور ہے — جو اس سے اختلاف کرے حق سے دور ہے
یعنی راہ حق۔

[۱] اس لئے کہ خدا کی یکتائی اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان ہی پر اسلام کی ساری بنیاد ہے اور خدا کے سوا کسی اور کو قادر ماننے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی قدرت کاملہ پر یقین نہیں ہے۔

[۲] مسجد سے صدا آنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجدوں کے آباد اور غیر آباد ہونے سے پتہ چل جاتا ہے کہ مذہب سے وابستگی بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے اور باجماعت نمازوں کی صفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملت اسلام میں کتنا زور اور کتنی قوت ہے۔

[۳] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کے دلوں میں تو خدا کی محبت کی بجائے لڑکیوں کا عشق بسا ہوا ہے اور ایمان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی بجائے دنیاوی اقتدار اور عزت ہی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

لیکن[۱] خدا کے واسطے خلق خدا سے مل — سمجھے گا اس کو وہ جو اہلِ شعور ہے

دل بہ یار - دست بہ کار

دولت بھی ہے فلسفہ بھی ہے جاہ بھی ہے — لطفِ حسنِ بتانِ دل خواہ بھی ہے
سب[۲] سے قطعِ نظر ہے مشکل لیکن — اتنا سمجھے رہو کہ اللہ بھی ہے

بڑے عمل کا مقصد بھی بڑا ہونا چاہیے

اعلیٰ مقصود چاہیے پیشِ نظر — کوشش تری گو ہو لطفِ ذاتی کیلئے
فرہاد[۳] پہاڑ پر عمل کرتا تھا — شیریں کے لئے کہ ناشپاتی کیلئے

[۱] مطلب یہ ہے کہ رہبانیت یعنی ترک دنیا تو اسلام کا شعار نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا خلق خدا سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ لیکن سچا اور باشعور مسلمان وہ ہے جو خلق خدا سے تعلق تو رکھتا ہے مگر اپنی ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے یعنی حسب ارشاد حدیث قدسی اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ خلق خدا کو خدا کا کنبہ سمجھتا اور اس کنبہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے دوسرے افراد خاندانی کے متعلق اپنی مذہبی معاشری ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔

[۲] یعنی دنیا میں رہ کر عام انسانوں کے لئے یہ تو بہت مشکل ہے کہ وہ دولت و عزت، عشق و محبت اور علوم عقلیہ سے کوئی تعلق نہ رکھیں لیکن ان چیزوں سے تعلق رکھنے کے ساتھ اگر اس کا بھی احساس اور یقین رہے کہ خدا بھی ہے، یعنی دنیا کی دلچسپیوں میں خدا کو نہ بھلا دیا جائے تو یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

[۳] فرہاد جس کو کوہکن بھی کہتے ہیں فارس کا ایک سنگ تراش تھا جو بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ شیریں پر عاشق ہو گیا تھا۔ اور شیریں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر بذات خود ایک پہاڑ کو کھود کر اس میں سے شیریں کے محل میں نہر نکال لائے تو شیریں اس کی ہو جائے گی۔ فرہاد نے شیریں کی محبت میں پہاڑ کھود کر نہر تو نکال دی مگر شیریں کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اور سر میں تیشہ مار کر مر گیا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ انسان اپنے لطف و مذاق کے لئے بھی اگر کسی بڑے کام میں ہاتھ ڈالے تو اس کا مقصد بھی کام کی اہمیت کے لحاظ سے اہم اور بڑا ہونا چاہیے۔ فرہاد نے جو پہاڑ میں سے نہر کے کھودنے میں اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں وہ کسی معمولی مقصد مثلاً ناشپاتی حاصل کرنے کیلئے نہیں کیں بلکہ ایک ایسے مقصد کے لئے کیں جو فرہاد کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا اور جس کے حاصل نہ ہونے پر اس نے زندہ رہنے کی ضرورت نہیں سمجھی

خدا کا دفتر دیکھو

دینی پہلو کو اے برادر دیکھو — کانٹوں[1] سے ہو محترز گل تر دیکھو
نظم اکبر ہوئی ہے منقوش قلوب — آنکھیں ہوں اگر[2] خدا کا دفتر دیکھو

جو میسر ہے اس پر قانع رہو

اب[3] ان قصوں کا کیا حاصل اب ان باتوں کا کیا رونا
یہی مرضی خدا کی تھی یہی قسمت میں لکھا ہونا
کہاں کی دولت و ثروت کہاں کی عزت و حشمت
میسر ہیں تجھے دو روٹیاں بس گھر کا ہے کو نا

---

[1] یعنی جو لوگ حوادث دنیاوی کو دینی نظر سے دیکھتے ہیں ان کی نظریں حوادث کے کانٹوں یعنی تکلیف دہ پہلوؤں پر نہیں پڑتیں بلکہ وہ حوادث سے گل تر یعنی روح کو شاد و مسرور کرنے والے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں یعنی ان کی نظر انجام و عاقبت کی راحتوں پر رہتی ہے۔

[2] خدا کا دفتر سے مراد، مناظر قدرت خدا ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اکبر کی نصیحتیں تو تم نے دل میں بٹھالیں مگر اُن سے معرفت الٰہی کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے تمہیں اپنی بصیرت یعنی دل کی آنکھوں سے مناظر قدرت کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ بقول عارف شیرازؒ ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

[3] یعنی یہ رونا رونے سے اب کیا نتیجہ کہ ہم اور ہمارے بزرگ ایسے تھے ویسے تھے۔ قسمت کا لکھا پورا ہوا۔ خدا کی مرضی پر شاکر رہنا چاہیئے۔

خود سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت

اوروں کی کہی ہوئی جو دوہراتے ہیں — وہ فونوگراف[1] کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسب حال مضمون نکال — انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

اصلی طاقت و عزت اور صحیح تعلیم و تربیت

طاقت[2] وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے — اس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہنر — اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

فنا اور بقا کا راز

غنچہ[3] رہتا ہے دل گرفتہ پہلے — رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آکے راز فطرت — سنتے ہی پیام دوست کھل جاتا ہے

---

[1] فونوگراف phono Graph ایسے آلہ صوتی کو کہتے ہیں جس میں آوازیں خود بخود منقوش ہو جاتی اور پھر ویسی ہی اس میں سنی جا سکتی ہیں۔ یعنی جو لوگ اپنی عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے بلکہ جو دوسرے لکھ گئے یا کہہ گئے ہیں۔ وہی لکھتے یا کہتے ہیں ان کی مثال فونوگراف کی سی ہے جس میں سے وہی آوازیں نکلتی ہیں جو اس میں بھری جاتی ہیں۔ خود اس کی کوئی مستقل آواز نہیں ہوتی۔ ایسی میکانکی تقلید سے تو میں ترقی نہیں کیا کرتیں۔ قومی ترقی کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ اقتضاء زمانہ کے مطابق دماغ سے بھی کام لیا جائے اور مشین کی طرح دوسروں کے اشاروں پر نہ چلا جائے۔ [2] یعنی طاقت وہی کارگر ہوتی ہے جس کی پشت پر حکومت ہو اور ناموری و شہرت، ان ہی کی زیادہ ہوتی ہے جو فیاض اور سخی ہوں۔ اچھی تعلیم وہ ہے جس سے کوئی ہنر یعنی کوئی مفید کام کرنے کی

(باقی ۱۳۶ پر)

(اس صفحہ کا نوٹ نمبر ۳ صفحہ ۱۳۶ پر دیکھئے)

دنیائے دنی کی محبّت

دنیائے[1] دنی محلِّ آفات بھی ہے — فکرِ روزی مخلِ اوقات بھی ہے
طرّہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور — جیتا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

(صفحہ ۱۳۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) علمی قابلیت حاصل ہو اور اچھی تربیت یہ ہے کہ روح کی تربیت ہو یعنی انسان اخلاق حسنہ سے متصف اور اس کے دل میں خشیت الٰہی پیدا ہو۔

(صفحہ ۱۳۵ کا نوٹ نمبر۲) اس شعر میں استعارتاً فنا اور بقا کے راز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی جو بھی نئی ہستی دنیا میں آتی ہے وہ فنا کے جھونکوں کے ڈر سے غنچہ (کلی) کی طرح اپنی تمام خلقی قابلیتوں اور خوبیوں کو اپنے اندر چھپائے رکھتی ہے اور گویا یہ سوچ کر دل گرفتہ و مغموم رہتی ہے کہ ؎

کہ کشید دامنِ فطرت کہ بقیدِ ما و من آمدی — تو بہارِ عالمِ دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی

(تیرے دامنِ فطرت کو کس نے کھینچا کہ تو ہم اور میں کے پنجرے میں پھنس گئی۔ تو تو کسی اور ہی چمن کی بہار ہے۔ چمن دنیا میں کیسے پہنچ گئی) لیکن جب اسے اس دنیا کی ہوا لگتی ہے تو جس طرح نسیم سے غنچہ کھل کر پھول ہو جاتا ہے اسی طرح نو آمدہ ہستی کی وجودی قابلیتیں بھی نمایاں ہو جاتی ہیں گویا کوئی اس نو آمدہ ہستی کو اس رازِ فطرت سے آگاہ کر دیتا ہے کہ یہ عالم فانی بھی درحقیقت عالم باقی یعنی تجلیاتِ ذاتِ حق ہی کا ایک ظہور ہے اور خلق کی پیدائش سے مقصود ذاتِ خالق ہی کی صفاتی نمائش ہے۔ حسب مضمون حدیث قدسی كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ میں (یعنی ذات باری عزّ اسمہٗ) ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ معروف و مشہور ہوں تو میں نے مخلوقات (کائنات) کو پیدا کر دیا۔ یعنی جو وجود اس جہان میں فانی شکلوں کے روپ میں ظاہر اور نمایاں ہوا ہے وہ وہی کنزِ مخفی ہے جو بے صورتی کے پردہ میں چھپا ہوا تھا اور جو صورتوں کے فنا ہونے کے بعد پھر اسی بے صورتی سے واصل ہو جائے گا۔ بقول حضرت مولوی معنوی ؒ ؎ صورت از بے صورتی آمد بروں — باز شد انّا الیہ راجعون۔ یعنی صورت بے صورتی سے برآمد ہوئی اور پھر اسی بے صورتی کی طرف لوٹ گئی۔ [1] حاصل ان اشعار کا یہ ہے کہ یہ ذلیل دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔

حدِّ ادب

سنئے حکمت جو مری گفتار میں ہے — اک حدِّ ادب ہر ایک سرکار میں ہے
پروانے[1] نے شمع سے لپٹنا چاہا — پہلے تھا نور میں اب نار میں ہے

باپ دادا پر بے جا فخر

ڈارون[2] صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں[3] نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے
اپنی حالت کے مطابق چاہیئے طرزِ عمل — اس سے کیا ہوتا ہے دادا قیصر[4] و فغفور تھے
اس تقرّب پر ہمیں کچھ فخر کا موقع نہیں — پاس گو بیٹھے تھے لیکن اُنکے دل[5] سے دور تھے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ بیل ملّت میں فرق مراتب اور ادب و آداب کے اصول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو لوگ اپنی حیثیت و قابلیت کی حدود سے آگے بڑھ کر بڑے لوگوں کی ہمسری کی ہوس کرتے ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ دیکھو پروانہ اس عشق و وارفتگی کے باوجود جو اس کو شمع کے ساتھ ہے جب اپنی حیثیت کو بھول کر شمع سے لپٹنا چاہتا یعنی حدِ ادب سے تجاوز کرتا ہے تو شمع کی روشنی میں وصل کی جو لذت اسے حاصل ہوتی ہے اس سے بھی محروم ہو جاتا اور جل کر خاک ہو جاتا ہے [2] ڈارون صاحب کا پورا نام چارلس رابرٹ ڈارون (Charles Robert Darwin) پیدائش ۱۸۰۹ء وفات ۱۸۸۲ء) یہ انگلستان کے مشہور محقق سائنس داں تھے۔ جنہوں نے ارتقاء انواع کا نظریہ نکالا تھا اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ کوئی نوع اپنی نوعی شکل میں عدم سے وجود میں نہیں آئی ہے۔ بلکہ وہ کسی پہلے سے موجود اور ارتقا یافتہ نوع کی جدید ارتقائی شکل ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت ڈارون صاحب کی تحقیق میں نوعِ انسانی بھی کسی ارتقا یافتہ نوعِ حیوانی یعنی لنگور یا بندر کے ارتقا سے پیدا ہوئی ہے۔ [3] ڈارون کا نظریہ ارتقاء انواع اسلامی عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے حضرت اکبر یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اُن کے مورث لنگور تھے یعنی یہ کہ لنگور کے نوعی ارتقا سے انسان نمودار ہوا ہے [4] قیصر لقب تھا شاہانِ روما کا اور فغفور لقب تھا شاہانِ ملک چین کا۔ یہاں ان دونوں لفظوں سے بادشاہ اور حکمران مراد ہیں [5] یعنی ایسی عزت اور آؤ بھگت قابلِ فخر نہیں ہے کہ بڑے آدمی اپنے پاس تو بٹھائیں مگر دل میں نفرت رکھیں۔

شکوہ اور شکایت کا وقت ختم

نہ حرفِ شکوہ بہتر ہے نہ اچھا اشک بہنا — ہمارے دن یہی ہیں رنج سہنا اور چپ رہنا
خدا کے واسطے اکبرؔ کوئی ذکر اور ہی چھیڑو — سُنی[1] باتوں کا کیا سننا کہی باتوں کا کیا کہنا

ذہنی انقلاب نے بیجابات کو بجا کر دیا

عجب حیرت انگیں (تعجب خیز) ہے یہ انقلاب — ہماری سمجھ کیا سے کیا ہو گئی
سمجھتے تھے سب جس کو بیجا (نامناسب غلط) صریح (صاف طور، برا) — وہی بات بالکل[2] بجا (مناسب ٹھیک) ہو گئی

شراب اور خودکشی

قوم سے مے (شراب) کی سفارش کیا کروں — نیک کو شیطان کر دیتی ہے یہ
ایک جوہر (خاصیت) ہے فقط اس میں مفید — خود[3] کشی آسان کر دیتی ہے یہ

[1] یعنی حکومت سے جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں اس لئے ان کے متعلق داد ویلا کرنے اور بار بار ان کے کہنے اور سننے سے کیا نتیجہ
[2] یعنی انقلاب نے ہماری عقلوں نے بھی ایسا پلٹا کھایا ہے کہ جو باتیں ہم کو صریحًا بے جا اور نامناسب معلوم ہوا کرتی تھیں ان ہی کو اب ہم بالکل بجا اور ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔
[3] خودکشی آسان کر دینے، کے دو مطلب نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر انسان آسانی سے خودکشی کر لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیادتی شراب سے انسان عمرِ طبعی تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی مر جاتا ہے اور اس کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ شراب کا عادی ہو کر کوئی خودکشی کر رہا ہے۔

ابتدا سے رنجیدگی انتہا سے بے حسی

اس دورِ فلک میں کوئی کیا دیکھے گا — جو کچھ دکھلائے گا خدا، دیکھے گا
رنجیدہ ہے جس نے ابتدا دیکھی ہے — بے حس[1] ہو گا جو انتہا دیکھے گا

"ہم" کا تصور چھوڑو "میں" پر نظر رکھو

اثر سب پر پڑا ہے انقلابِ رنگِ عالم کا — نہ اب ہے طعن کا موقع نہ ہے اب وقت ماتم کا
بسر کر با قناعت زندگانی کنجِ عزلت (گوشۂ تنہائی) میں — نظر[2] "میں" پر مناسب ہے تصور چھوڑ دے "ہم" کا

فضول بحث اور دنیا پسندی

فضول بحث میں وقت اپنا کھو نہیں سکتا — زیادہ اب شبِ غفلت میں سو نہیں سکتا
گذر گیا دلِ دنیا پسند دنیا سے — اس[3] انجمن کا میں اب رکن ہو نہیں سکتا

[1] مطلب یہ ہے کہ جس بڑے انجام کی ابتدا یا آغاز دیکھ کر ہمیں اس وقت رنج ہو رہا ہے اُس انجام کے پیش آنے تک رنج کا یہ احساس بھی جاتا رہے گا۔ اور ہمیں یہ خیال بھی نہیں ہو گا کہ ہم کس انجام کو پہنچ گئے۔
[2] یعنی ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس پر انقلاب زمانہ کا بُرا اثر نہ پڑا ہو۔ اس لئے اب دوسروں کی حالت پر افسوس کرنا یا اُن پر طعن کرنا بیکار ہے۔ اب ہم سب کو "ہم" کا یعنی ابنائے قوم کی تباہ حالی کا خیال چھوڑ کر "میں" کا خیال یعنی اپنی ذاتی اصلاح و بہبود کی فکر کرنی چاہیئے۔
[3] یعنی دنیا کی تلخ کامیوں کا مجھے کافی تجربہ ہو چکا ہے اور غفلت کی نیند سے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ اب میں دنیا سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا۔

مغرب مغرب ہے، اور مشرق مشرق

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق — نیچر[1] تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات — مغرب[2] مغرب ہے اور مشرق مشرق

جب تھے تو خوب تھے

ممدوح[1] شرق و غرب و شمال و جنوب تھے — تعریف تھی ہنر کی بَری از عیوب تھے
اب کچھ نہیں تو کیا کہیں تم سے کہ کیسے ہیں — ہاں اس میں شک نہیں ہے کہ جب تھے تو خوب تھے

افسانہ گو خود افسانہ ہو گیا

اک بحرِ بے کراں ہے حوادث کا سلسلہ — الجھا جو ذہن اس میں وہ دیوانہ ہو گیا
اُٹھے مورخین زمانہ میں گم ہوئے — افسانہ[2] گو جو تھا وہ خود افسانہ ہو گیا

---

[1] یعنی یہ قدرت کا قاعدہ اور قانون ہے کہ ہر چیز اپنی اصلیت سے محبت رکھتی اور اسی کی طرف کھنچ کر جاتی ہے اَلْجِنْسُ یَمِیْلُ اِلَی الْجِنْس یعنی جنس اپنے جنس کی طرف جھکتی ہے۔ کسی فارسی شاعر کا مشہور مصرع ہے "کند ہم جنس باہم جنس پرواز"۔ [2] یہ قول کسی مغربی ہی کا ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب"۔ یعنی مغرب کے باشندوں کی فطرت کبھی مشرقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ مشرقی باشندوں کی فطرت مغربی۔ اس لئے مشرقیوں کی یہ کوشش کہ وہ مغربی رنگ میں رنگ جائیں۔ صرف ظاہری تقلیدی رنگ میں تو ممکن ہے کہ کامیاب ہو جائے۔ مگر ان میں اہلِ مغرب کی سی طبعی اور اخلاقی خصوصیات اور اہلِ مغرب کے دلوں میں ان کی وہ محبت اور قدر پیدا نہیں ہو سکتی جس کے وہ آرزو مند ہیں۔ [1] یعنی ساری دنیا ہماری قابلیتوں اور خوبیوں کی مداح تھی [2] مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اتنے بے شمار اور ایسے ایسے عظیم انقلابات آئے ہیں اور آتے رہتے ہیں (باقی صفحہ ۱۴۱)

عمر امروز و فردا ہی میں کٹتی ہے

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن — شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا
عمر یونہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ — عرصۂ[1] ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

لبِ خنداں زیادہ، دیدۂ تر کم

جینے والوں کی ترنگیں ہیں فقط پیشِ نظر — مرنے والوں کے مصائب کی بہت کم ہے خبر
یہی باعث ہے کہ غفلت میں پھنسی ہے دنیا — لبِ[2] خنداں کی ہے کثرت عوضِ دیدۂ تر

نگاہوں میں زمانے، زبانوں پر فسانے

خبر کیا انقلابِ دہر کی ان نوجوانوں کو — نئی حالت نئی آنکھیں نئے ان کے ترانے ہیں
بڑی عمریں ہیں جن کی اُن سے سنئے حالِ دنیا کا — نگاہوں[3] میں زمانے ہیں زبانوں پر فسانے ہیں

(صفحہ ۱۴۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) کہ جو مورخ اُن کی چھان بین اور اُن کے اسباب و نتائج کی تحقیق کے چکر میں پڑتا ہے خود اس کی عقل چکر کھانے لگتی ہے اور وہ اپنی اس فلسفیانہ تاریخی تحقیقات کی بھول بھلیاں میں ایسا چکراتا ہے کہ اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی تاریخ نگاری کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ بجائے اس کے کہ وہ دوسروں کے حالات و واقعات کے فسانے سنائے خود فسانہ بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی تاریخ نگاری کا واقعہ بھی ایک اہم تاریخی واقعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے [1] اس مضمون کا ایک اور مشہور اردو شعر ہے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے — عمر یونہی تمام ہوتی ہے

غور سے دیکھا جائے تو زندگی اسی کا نام ہے کہ صبح کو انسان شام کی سوچے اور شام کو آنے والی صبح کی اور آج اور کل کہتے ہی کہتے عمر ساری ختم ہو جائے [2] یعنی رونے والے کم ہیں اور ہنسنے والے زیادہ بمصداق ارشادِ خداوندی وَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا یعنی (مرنے کے بعد کے حالات اور قیامت کا ذکر کر کے) تم ہنستے ہو اور تم کو رونا نہیں آتا۔ [3] یعنی بڑی عمر کے لوگوں نے ہر قسم کا زمانہ اور بہت سے انقلابات دیکھے ہیں اور ان زمانوں اور انقلابوں کے ایسے حالات وہ سناتے رہتے ہیں جن کی نوجوانوں کو خبر نہیں۔ نوجوانوں کے سامنے صرف نیا زمانہ اور نئے حالات ہیں اور ان ہی کے رنگ میں وہ رنگے جا رہے ہیں۔

صبر و قناعت کا حظ

گوشۂ صبر و قناعت ہی میں اب محظوظ ہوں ۱ | شہد سے محروم ہوں تو زہر سے محفوظ ہوں
گو حریفوں کی نظر میں رنگ پھیکا ہو مرا | نرگس مستانۂ ساقی ۲ کا میں ملحوظ ہوں

(نگاہ چشم معشوق — یعنی منظور نظر)

ہم کچھ بھی نہیں ہیں

ہر خاک کے پتلے ۳ کو ابھارا ہے فلک نے | یکتائی کے اظہار میں مست اہل نہیں ہیں
(یعنی انسان)
ہر اک کو یہ دعوے ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز | اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

بحر ترقی میں خود ہی بہے جاتے ہیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں | داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں

(داد: تعریف واہ — ظلم۔ تکلیف)

۱ یعنی صبر و قناعت اور مرنجاں مرنج کی زندگی میں اگرچہ وہ شہد کی سی شیرینی یعنی وہ لذت و عزت نہیں ہے جس کے ہوس پرست دل دادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی زندگی زہر آلود بھی نہیں ہوتی یعنی اس زندگی میں ان تکالیف و مصائب اور بد انجامی کے خطرات کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جس کا ہوس پرستوں کو ہر وقت سامنا رہتا ہے۔

۲ ساقی سے مراد ہے مطلوب حقیقی حق تعالیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے سے دنیا والوں کی نظر میں گو میری کوئی عزت و قدر نہ ہو۔ لیکن میرا محبوب و مالک حقیقی میرے اس پر بھروسہ رکھنے کے اس رویہ کو نظر پسندیدگی سے دیکھتا اور اچھا سمجھتا ہے۔

۳ پتلا یعنی مجسمہ۔ مورت۔ انسان حسب ارشاد باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ (اس ذات پاک نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے) خاک کا پتلا یا خاک کی مورت ہے۔ مگر خاکی ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ میرا ہمسر کوئی نہیں ہے۔ لیکن جن انسانوں نے اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ ان کو اپنے کچھ ہونے پر نہیں بلکہ کچھ نہ ہونے پر ناز ہے۔ یعنی ان کو اس پر فخر ہے کہ ان کی ہستی ان کی نہیں بلکہ خدا کی ہے اور جس نے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دیا ہے وہ جانتا ہے کہ ساری خدائی اسی کی ہے۔ ع چوں از وگشتی ہمہ چیز از تو گشت

رزولیوشن ۱ ہی کے تختے کا سہارا ہے فقط | بحر تدبیر ترقی میں بہے جاتے ہیں
ملک الموت ۲ نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس | اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں
آپ ۳ فرماتے ہیں ہو لہر ترقی کی تو آ | موجیں کہتی ہیں کہ یہ خود ہی بہے جاتے ہیں

(موت کا فرشتہ — اطلاع — امنگ)

فلسفہ پرست بدھو

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب | بدھو ۴ فلاسفی کے کمرے میں ٹر رہے ہیں
خاک اُڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے | مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

۱ یعنی سوائے جلسوں میں رزولیوشن (تجویزیں) پاس کر دینے کے کوئی تعمیری کام ایسا نہیں کرتے جو قومی ترقی کے لئے مفید ہو۔ ترقی کی آرزو کے دریا میں کود تو پڑے ہیں مگر چونکہ سوائے رزولیوشنوں کے تختہ کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس لئے ترقی کی رو میں بہے جا رہے ہیں اور راہ سے بے راہ ہو رہے ہیں۔

۲ آج کل انجمنوں اور کمیٹیوں کے کام اسی طرح ہوتے ہیں کہ جلسہ میں جو کارروائیاں ہونے والی ہوتی ہیں اُن کی اطلاع ممبروں کو پہلے سے دیدی جاتی ہے مگر موت کے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اور کوئی اس کی پہلے سے تیاری نہیں کرتا۔ اس لئے بہت سے دنیاوی اور اخروی کام ادھورے اور ناتمام رہ جاتے ہیں۔ ۳ یعنی آج کل کے ترقی پسند جس کو ترقی سمجھ کر ابنائے قوم کو اس کی دعوت دے رہے ہیں وہ ترقی درحقیقت ترقی نہیں ہے بلکہ نئی تہذیب اور نئے زمانہ کی غلامی ہے۔ کہ زمانہ کی موجیں جس طرف بہائے لئے جا رہی ہیں اس طرف ہم بہے چلے جا رہے ہیں اگرچہ مرکز قومیت سے وابستہ نہیں رہے۔ ۴ بدھو سے مراد نئی روشنی کی اندھا دھند تقلید کرنے والے ناعاقبت اندیش مسلمان ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے انگریز حکام تو گرجاؤں میں اور سچے مسلمان مسجدوں میں خدا کی عبادت کر کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔ لیکن نئی روشنی کے ناعاقبت اندیش مسلمان فلسفہ کی ادھوری تعلیم حاصل کر کے مذہب کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور اپنی دنیا اور عاقبت کو خراب کر رہے ہیں۔ ان کے گھروں کے اندر تو ادبار و فلاکت چھائی ہوئی ہے مگر بھائیوں بھائیوں میں مذہب کی موافقت و مخالفت پر لڑائیاں ہو رہی ہیں۔

صبر و قناعت کا حظ

گوشۂ صبر و قناعت ہی میں اب محظوظ ہوں　　شہد[1] سے محروم ہوں تو زہر سے محفوظ ہوں

گو حریفوں کی نظر میں رنگ پھیکا ہو مرا　　نرگس[2] مستانۂ ساقی کا میں ملحوظ ہوں

(ہمسر، ہم — بناز، چشم معشوق — یعنی منظور نظر)

ہم کچھ بھی نہیں ہیں

ہر خاک[3] کے پتلے کو ابھارا ہے فلک نے　　یکتائی کے اظہار میں سب اہل نہیں ہیں

(یعنی انسان)

ہر اک کو یہ دعوے ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز　　اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

بحر ترقی میں خود ہی بہے جاتے ہیں

طعنے سنتے ہیں مگر شعر کہے جاتے ہیں　　داد کے شوق میں بیداد سہے جاتے ہیں

(تعریف واہ واہ — ظلم تکلیف)

[1] یعنی صبر و قناعت اور مرنجاں مرنج کی زندگی میں اگرچہ وہ شہد کی سی شیرینی یعنی وہ لذت و عزت نہیں ہے جس کے ہوس پرست دل دادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی زندگی زہر آلود بھی نہیں ہوتی یعنی اس زندگی میں ان تکالیف و مصائب اور بد انجامی کے خطرات کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جس کا ہوس پرستوں کو ہر وقت سامنا رہتا ہے۔

[2] ساقی سے مراد ہے مطلوب حقیقی حق تعالیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ صبر و قناعت کی زندگی بسر کرنے سے دنیا والوں کی نظر میں گو میری کوئی عزت و قدر نہ ہو۔ لیکن میرا محبوب و مالک حقیقی میرے اس پر بھروسہ رکھنے کے اس رویہ کو نظر پسندیدگی سے دیکھتا اور اچھا سمجھتا ہے۔

[3] پتلا یعنی مجسمہ۔ مورت۔ انسان حسب ارشاد باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ (اس ذات پاک نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے) خاک کا پتلا یا خاک کی مورت ہے۔ مگر خاکی ہونے کے باوجود اس کے دماغ میں یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ میرا ہمسر کوئی نہیں ہے۔ لیکن جن انسانوں نے اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ ان کو اپنے کچھ ہونے پر نہیں بلکہ کچھ نہ ہونے پر ناز ہے۔ یعنی ان کو اس پر فخر ہے کہ ان کی ہستی ان کی نہیں بلکہ خدا کی ہے اور جس نے اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا کر دیا ہے وہ جانتا ہے کہ ساری خدائی اسی کی ہے۔ ع چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

رزولیوشن[1] ہی کے تختے کا سہارا ہے فقط　　بحر تدبیر ترقی میں بہے جاتے ہیں

ملک[2] الموت نے نوٹس نہ دیا تھا افسوس　　اس کمیٹی کے بہت کام رہے جاتے ہیں

آپ[3] فرماتے ہیں ہو لہر ترقی کی تو آ　　موجیں کہتی ہیں کہ یہ خود ہی بہے جاتے ہیں

(موت کا فرشتہ — اطلاع — امنگ)

فلسفہ پرست بدھو

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب　　بدھو[4] فلاسوفی کے کمرے میں ٹر رہے ہیں

خاک اڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے　　مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

[1] یعنی سوائے جلسوں میں رزولیوشن (تجویزیں) پاس کر دینے کے کوئی تعمیری کام ایسا نہیں کرتے جو قومی ترقی کے لئے مفید ہو۔ ترقی کی آرزو کے دریا میں کود تو پڑے ہیں مگر چونکہ سوائے رزولیوشنوں کے تختہ کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس لئے ترقی کی رو میں بہے جا رہے ہیں اور راہ سے بے راہ ہو رہے ہیں۔

[2] آج کل انجمنوں اور کمیٹیوں کے کام اسی طرح ہوتے ہیں کہ جلسہ میں جو کارروائیاں ہونے والی ہوتی ہیں اُن کی اطلاع ممبروں کو پہلے سے دیدی جاتی ہے مگر موت کے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اور کوئی اس کی پہلے سے تیاری نہیں کرتا۔ اس لئے بہت سے دنیاوی اور اخروی کام ادھورے اور ناتمام رہ جاتے ہیں۔ [3] یعنی آج کل کے ترقی پسند جس کو ترقی سمجھ کر اپنا رہے ہیں قوم کو اس کی دعوت دے رہے ہیں وہ ترقی درحقیقت ترقی نہیں ہے بلکہ نئی تہذیب اور نئے زمانہ کی غلامی ہے۔ کہ زمانہ کی موجیں جس طرف بہائے لئے جا رہی ہیں اس طرف ہم بہے چلے جا رہے ہیں اگر مرکز قومیت سے وابستہ نہیں رہے۔ [4] بدھو سے مراد نئی روشنی کی اندھا دھند تقلید کرنے والے ناعاقبت اندیش مسلمان ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے انگریز حکام تو گرجاؤں میں اور سچے مسلمان مسجدوں میں خدا کی عبادت کر کے اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں۔ لیکن نئی روشنی کے ناعاقبت اندیش مسلمان فلسفہ کی ادھوری تعلیم حاصل کر کے مذہب کو خیرباد کہہ رہے ہیں اور اپنی دنیا اور عاقبت کو خراب کر رہے ہیں۔ ان کے گھروں کے اندر تو ادبار و فلاکت چھائی ہوئی ہے مگر بھائیوں بھائیوں میں مذہب کی موافقت و مخالفت پر لڑائیاں ہو رہی ہیں۔

تعلّی اور خاکساری

تعلّیوں کو طبیعت رجکٹ کرتی ہے	جو دل شکستہ ہیں اُن کو سلکٹ کرتی ہے
ملا ہوں خاک میں خود اس سبب سے میری نظر	گرا کے قصر بگولے ارکٹ کرتی ہے

عارف کو بیہوشی زیبا، عاقل کو خاموشی زیبا

آزادی کا شور مبارک	یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر	میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا	عاقل کو خاموشی زیبا

زبان زندہ دل مردہ

بے کار جگر ہے مضمحل گردہ ہے	جس دوست کو دیکھئے وہ افسردہ ہے

۱ رجکٹ لفظ انگریزی Reject بمعنی ناپسند کرنا۔ مسترد کرنا۔ سلیکٹ لفظ انگریزی Select بمعنی پسند کرنا انتخاب کرنا۔ ارکٹ ERECT بمعنی تعمیر کرنا۔ بنانا۔ بگولہ یعنی ہوا کا وہ حلقہ جو غبار آلود ہوا کے ایک ہی جگہ چکر لگانے سے بنتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دینے اور ہیچ سمجھنے سے میری طبیعت شیخی بازوں سے متنفر ہوگئی اور منکسر المزاجوں کو پسند کرنے لگی ہے اور محلوں کے خواب دیکھنے کی بجائے میرے ذہن میں بگولوں کے تصورات آتے ہیں کہ مٹی کے ذروں کو کس طرح ہوا چکر میں ڈال دیتی ہے۔ ۲ یعنی مغربی تقلید میں ہر طرف آزادی کا شور مچ رہا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ شور و غل کرنے والے نہ تو آشنایان حقیقت ہیں اور نہ صاحب عقل و فہم۔ کیونکہ حقیقت آشنا تو اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔ اور عقلمندوں کا شیوہ خاموشی ہوتا ہے۔

البتہ ان بناؤں سے جن کے لئے ہو سعی	کچھ جال چھوڑ جائیں گے صیاد کیلئے

بنگلہ نشینوں سے قدر شناسی کی امید نہیں

چھائی جاتی ہے مرے دل پہ اُداسی کیسی	ہم نشیں ہے یہ بڑی بات ذرا سی کیسی
کیا ملے دادِ سخن بنگلہ نشینوں سے مجھے	وہ سمجھتے ہی نہیں قدر شناسی کیسی

سرِّ ازل اور بادہ فروش

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس حضرت نے پڑھا	حافظ کا اک یہ شعر جو معنی کو تھا مفید

"سرِّ ازل کہ عارف سالک بکس نگفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

۱ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی تہذیب کی بنیادیں رکھ رہے ہیں اور نئی روشنی کے طریقوں پر قوم کو چلا رہے ہیں وہ اپنی اولاد کو خصائل حسنہ کے ورثے سے تو محروم کر ہی جائیں گے۔ لیکن کچھ خصلتیں ایسی بھی اُن میں پیدا کر جائیں گے جو مغربی شکاریوں کے واسطے اُن کے پھنسانے کے لئے جال کا کام دیں گی۔

۲ یعنی دل دادگان تہذیب مغرب جو مشرقی شاعری کے محاسن کو سمجھ بھی نہیں سکتے اُن سے قدر دانی اشعار و شعراء کی کیا امید کی جا سکتی ہے اور قومی کیرکٹر کی یہ تبدیلی کوئی معمولی نہیں بلکہ بڑی بات ہے جس سے قوم کی آئندہ فلاح و بہبود کی طرف سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔

۳ ترجمۂ شعر حافظ: جو راز ازل عارف سالک نے بھی کسی سے نہیں کہا۔ مجھے حیرت ہے کہ بادہ فروش (شراب بیچنے والے) نے کہاں سے سن لیا۔ عارف سالک سے مراد وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں جو راہ طریقت یعنی سلوک کے ذریعہ سے مرتبۂ عرفان حق تک پہنچے ہیں اور بادہ فروش سے مراد وہ وارفتگان عشق الٰہی ہیں جن کا مذہب رندی و عشق اور مسلک جوش و خروش ہے۔ عارفان سالک آداب طریقت و شریعت کے
(باقی [illegible])

نہ وہ نعرہ نہ وہ نالہ

کہاں اب وہ دل اور وہ طبع بلند — جنہیں کہہ گئے سعدیٔ ارجمند[1]
بیک[1] نعرہ کوہے زجا بر کنند — بیک نالہ ملکے بہم بر زنند

(ملک — آہ و فغاں — معنی ہم بیک زند / زیر و زبر کرنا)

غم اور خوشی کا سچا احساس

اصلی غم و شادی کا نہیں قوم میں اب حس — چشمِ عقلا سے یہ بصیرت ہوئی مفقود
پابند ہیں اُس کے رزولیوشن جو ہوا پاس — ہنسنے[2] پہ بھی تیار ہیں رونے کو بھی موجود

(قرار داد — دل کی بینائی — غائب، گم)

(صفحہ ۱۴۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) ملحوظ رکھنے کی وجہ سے رازہائے حقیقت کو زبان پر نہیں لاتے بلکہ ان رازوں کے انکشاف میں بھی وہ حدودِ شریعت سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتے بر خلاف عارفانِ رند مشرب کے کہ وہ وارفتگیٔ عشق میں سب کچھ جان لیتے اور سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ اکبر فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی میں بھی اپنے اشعار میں ایسے عارفانہ رموز بیان کر دیتا ہوں جن پر عارفانِ سالک دلدادگانِ راہِ طریقت کو تعجب ہوتا ہے کہ جو رازہائے حقیقت ہماری زبان سے آج تک نہیں نکلے وہ اکبر کو کہاں سے معلوم ہو گئے۔

[1] شیخ سعدیؒ کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے وہ ایک نعرہ سے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور اپنے ایک نالہ سے ملک کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صاحبِ دل اور بلند حوصلہ لوگ اب کہاں ہیں۔ [2] یعنی قوم کی جن باتوں پر ہم کو رونا یا خوش ہونا چاہیے اُن کی طرف تو ہمارے دلوں کو توجہ نہیں ہوتی۔ جلسہ کی تجویزوں ہی کے ہم پابند ہیں۔ اور جو تقریریں ان تجویزوں کے منظور کرانے کے لئے کی جاتی ہیں ان پر رونے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں اور ہنسنے کے لئے بھی یعنی اپنے احساسات حقیقت اور فہم و بصیرت سے کام نہیں لیتے محض دوسروں کی رایوں اور باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

گو نبض[1] زباں سے زندگی ہے ظاہر — دل کو جو ٹٹولئے تو وہ مردہ ہے

خضر نہیں غولِ بیابانی

خضر سمجھے ہو جسے غولِ[2] بیابانی ہے — غلط امید کے جنگل میں تھکا مارے گا
جانستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی — دل ستانی کے لئے لافِ وفا مارے گا

(رہنما — کسر — جان لینا — دل لینا — ڈینگ)

اقبال مندی کا طاعت کی طرف میلان

ہوئے جمع بہرِ دعا و سلام — کلیسا میں انگریز عالی مقام
کہا میں نے ہوں میں تو مسجد سے دور — تو گرجا میں اُن کا ہے کیوں اژدہام

(جمگھٹا)

[1] آج کل کے نوجوانوں کی جسمانی حالت کا نقشہ ہے کہ معاشری بے اعتدالیوں کی وجہ سے اُن کے جگر بے کار۔ گردے کمزور۔ دل مردہ اور امنگیں افسردہ ہیں۔ ساری علامتیں مردوں کی سی ہیں البتہ اُن کی زبانیں چل رہی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ زندگی ان میں باقی ہے۔ نبض رگ کی حرکت کو کہتے ہیں۔ جس سے زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

[2] غولِ بیابانی۔ جن اور دیو جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ ابنائے قوم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جن لیڈروں کو اپنا خضر یعنی خواجہ خضر جیسا مقدس رہنما سمجھ رہے ہیں وہ درحقیقت رہنما نہیں بلکہ جنگلی جن ہیں جو انسانیت اور مقاصدِ تخلیقِ انسانی سے نا آشنا ہیں۔ وہ اپنی خیر خواہی و وفاشعاری کی ڈینگیں مار کر نوجوانوں کے دلوں کو لبھانے کی تو بہت کوشش کریں گے لیکن غلط توقعات میں مبتلا کر کے اور غلط رستوں پر چلا کر اُن کو تھکا ماریں گے اور اُن کی روح کے فنا کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔

نہ وہ نعرہ نہ وہ نالہ

کہاں اب وہ دل اور وہ طبع بلند — جنہیں کہہ گئے سعدیٔ ارجمند
بیک[1] نعرہ کوہے زجابر کنند — بیک نالہ ملکے بہم بر زنند

(کہسار — آہ و فغاں — زیر و زبر کرنا)

غم اور خوشی کا سچا احساس

اصلی غم و شادی کا نہیں قوم میں اب حس — چشم عقلا سے یہ بصیرت ہوئی مفقود
پابند ہیں اُس کے رزولیوشن جو ہوا پاس — ہنسنے[2] پہ بھی تیار ہیں رونے کو بھی موجود

(دل کی بینائی — غائب، گم — قرارداد)

(صفحہ ۱۴۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) لحوظ رکھنے کی وجہ سے رازہائے حقیقت کو زبان پر نہیں لاتے بلکہ ان رازوں کے انکشاف میں بھی وہ حدود شریعت سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتے بر خلاف عارفان رند شرب کے کہ وہ وارفتگیٔ عشق میں سب کچھ جان لیتے اور سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ اکبر فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی میں بھی اپنے اشعار میں ایسے عارفانہ رموز بیان کر دیتا ہوں جن پر عارفان سالک رہادیان راہ طریقت کو تعجب ہوتا ہے کہ جو رازہائے حقیقت ہماری زبان سے آج تک نہیں نکلے وہ اکبر کو کہاں سے معلوم ہو گئے۔

[1] شیخ سعدیؒ کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے وہ ایک نعرہ سے پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور اپنے ایک نالہ سے ملک کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے صاحب دل اور بلند حوصلہ لوگ اب کہاں ہیں۔ [2] یعنی قوم کی جن باتوں پر ہم کو رونا یا خوش ہونا چاہیے اُن کی طرف تو ہمارے دلوں کو توجہ نہیں ہوتی۔ جلسہ کی تجویزوں ہی کے ہم پابند ہیں۔ اور جو تقریریں ان تجویزوں کے منظور کرانے کے لئے کی جاتی ہیں ان پر رونے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں اور ہنسنے کے لئے بھی یعنی اپنے احساسات حقیقت اور فہم و بصیرت سے کام نہیں لیتے محض دوسروں کی رایوں اور باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

گو نبض[1] زباں سے زندگی ہے ظاہر — دل کو جو ٹٹولیئے تو وہ مردہ ہے

خضر نہیں غول بیابانی

خضر سمجھے ہو جسے غول[2] بیابانی ہے — غلط امید کے جنگل میں تھکا مارے گا
جانستانی میں نہ چھوڑے گا دقیقہ باقی — دل ستانی کے لئے لاف وفا مارے گا

(رہنما — کسر — جان لینا — دل لینا — ڈینگ)

اقبال مندی کا طاعت کی طرف میلان

ہوئے جمع بہر دعا و سلام — کلیسا میں انگریز عالی مقام
کہا میں نے ہوں میں تو مسجد سے دور — تو گرجا میں اُن کا ہے کیوں اژدھام

(جمگھٹ)

[1] آج کل کے نوجوانوں کی جسمانی حالت کا نقشہ ہے کہ معاشری بے اعتدالیوں کی وجہ سے اُن کے جگر بے کار۔ گردے کمزور۔ دل مردہ اور امنگیں افسردہ ہیں۔ ساری علامتیں مردوں کی سی ہیں البتہ اُن کی زبانیں چل رہی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ زندگی ان میں باقی ہے۔ نبض رگ کی حرکت کو کہتے ہیں۔ جس سے زندگی کا پتہ چلتا ہے۔

[2] غول بیابانی۔ جن اور دیو جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ ابنائے قوم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جن لیڈروں کو اپنا خضر یعنی خواجہ خضر جیسا مقدس رہنما سمجھ رہے ہیں وہ دراصل رہنما نہیں بلکہ خبگی جن ہیں جو انسانیت اور مقاصد تخلیق انسانی سے نا آشنا ہیں۔ وہ اپنی خیر خواہی و وفا شعاری کی ڈینگیں مار کر نوجوانوں کے دلوں کو لبھانے کی تو بہت کوشش کریں گے لیکن غلط توقعات میں مبتلا کر کے اور غلط رستوں پر چلا کر اُن کو تھکا ماریں گے اور اُن کی روح کے فنا کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھیں گے۔

خدا جانے آئی کدھر سے صدا — کہ اے بے خرد مسلم ناتمام

کسے[1] را کہ اقبال باشد غلام — بود میلِ خاطر بہ طاعت مدام

(بے وقوف — ادھورے مسلمان — میلان طبع)

اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو

کیوں جلا رکھا ہے اس دور نے پیری میں مجھے — ستم غیر ضروری یہ فلک کا دیکھو

کہا گردوں نے نہیں غیر ضروری یہ بات — اپنے[2] مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو

(آسمان — آہستہ آہستہ، درجہ بدرجہ)

صیّاد کے لئے طرزِ نو کے جال

بانیٔ طرزِ نو کے طریقوں کے متبع — خلق نکو نہ چھوڑیں گے اولاد کے لئے

(موجد نئی تہذیب کے — پیرو — نیک خصائل)

[1] یہ شعر حضرت سعدی شیرازی کا ہے جس کا ترجمہ ہے "جس کسی کا اقبال (خوش نصیبی) غلام ہوتا ہے اس کا میلان طبع ہمیشہ خدا کی فرمانبرداری کی طرف ہوتا ہے" مطلب اشعار کا یہ ہے کہ عالی مرتبہ انگریزوں کا گرجا میں عبادت کرنا اُن کی اقبال مندی کی نشانی ہے۔ اور مسلمانوں کا مسجدوں سے دور رہنا اُن کی بد نصیبی اور ادبار کی علامت۔

[2] یعنی اس بڑھاپے میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں سہنے کے لئے قدرت نے مجھے زندہ رکھا ہے اس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے تدریجی زوال کے ساتھ اپنی قوم کے بھی آہستہ آہستہ فنا ہونے کا تماشا دیکھ لوں اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے کہ جس طرح افراد کی زندگیاں آہستہ آہستہ ختم ہوا کرتی ہیں اسی طرح اقوام کو بھی بتدریج فنا کی منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

زورِ حکومت کے بغیر مذہب محض ایک فلسفہ ہے

یہ شیخ اکبر سے اتنا کیوں خفا ہے — یہ کیوں غیظ و غضب جور و جفا ہے

نہیں ہے اس میں جھگڑے کی کوئی بات — یہ اک قولِ حکیم[1] باصفا ہے

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت — تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

اعتدال کی چال

نہ نرے اونٹ ہو نہ ہو بلڈاگ[2] — نہ تو مٹی ہی ہو نہ تم ہو آگ

چال ہے اعتدال کی اچھی — سازِ[3] حکمت کا جوڑ ہے یہ راگ

[1] حکیم باصفا سے غالباً علامہ اقبال مراد ہیں اور یہ مفہوم غالباً ان ہی کے کسی شعر سے ماخوذ ہے کہ اگر مذہب کی پشت پناہی پر حکومت نہ ہو تو مذہب اور ایک اخلاقی فلسفہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مذہب اور فلسفہ میں سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہوتی ہے اور فلسفہ کی بنیاد ایمان بالعقل پر یا ایمان بالمشاہدہ پر۔ ایمان بالغیب کو زورِ حکومت سے بہت تقویت پہنچتی ہے۔ کیونکہ عقل حکومت کے ڈر سے مرعوب اور دبی ہوئی رہتی ہے اور ایمان بالغیب میں مداخلت نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ بچے جب تک پابند مذہب والدین اور اساتذہ کے زیرِ اثر رہتے ہیں ان میں ایمان بالغیب کی صلاحیت زیادہ رہتی ہے اور اس زمانہ میں اگر ایمان بالغیب کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر عمرِ شعور کی آزاد خیالیوں سے بھی اس میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ مذہب میں زورِ حکومت نہ ہونے سے عقل کو پوری آزادی مل جاتی ہے اور وہ ایمان بالغیب کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ جو مذہبی باتیں عقلاً ٹھیک اور قابلِ اتباع ہوتی ہیں۔ صرف ان کو مانا جاتا اور ان ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور جو باتیں بعید از عقل یا خلافِ مصلحت نظر آتی ہیں ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گویا مذہب بھی ایک اخلاقی فلسفہ ہو کر رہ جاتا ہے اور مذہب سے روحانی تعلق باقی نہیں رہتا صرف عقلی تعلق رہ جاتا ہے اس لئے جو فوائد مذہب سے حاصل ہونے چاہئیں وہ حاصل نہیں ہوتے۔ [2] بل ڈاگ۔ لفظ انگریزی Bull dog ایک بڑے منہ کا طاقتور اور بہادر شکاری کتا۔ [3] حکمت کے ساز کے ساتھ میانہ روی کا راگ ہی اچھا ہوتا ہے۔ یعنی اعتدال کی روش ہی حکیمانہ اور عقلمندانہ روش ہے۔

بے ثباتیٔ دنیا سے عبرت

به چشمش بود رنگِ بے ثباتی — بہار آورد گلہا را، خزاں برد
به عبرت زندگانی کرد اکبر (ناپائیداری) — براں زاد و براں بود و براں مُرد

شخصی اور قومی زندگی

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں اگر عشوے دکھاتے ہیں — جو شخصی زندگی ہے اس کو یہ قومی بناتے ہیں
بجز الفاظ کے حاوی نہیں کلّی یہ کام اُن کے — یہ خود جزئی ہیں لیکن گیت کلّی کا سناتے ہیں

زورِ قلم کے سوا اور کوئی طاقت نہیں

کفر پر غصہ نہیں فطرت پہ کچھ حیرت نہیں — خانہ جنگی کے سوا بس اور کچھ رغبت نہیں
قوتِ انشا کو آخر صرف کرنا ہے ضرور — کیا کریں زورِ قلم ہے اور کچھ طاقت نہیں

ـلہ ترجمہ توضیحی: اکبر کی نظروں میں ہمیشہ ناپائیداری دنیا کا یہ منظر رہا کہ بہار نے پھولوں کو پیدا کیا اور خزاں نے اُن کو فنا کر دیا۔ ایسی ہی عبرت آموزی کی زندگی اکبر نے بسر کی۔ عبرت ہی کی فضا میں پیدا ہوا۔ اسی فضا میں جیا اور اسی فضا میں مرا۔ ـلہ۔ ـسہ کلّی اور جزئی علم منطق کی اصطلاحیں ہیں۔ کلّی اس مفہوم کو کہتے ہیں جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل جائز رکھے جیسے انسان، پہاڑ وغیرہ۔ اور جزئی وہ مفہوم ہے جس کا صرف ایک ہی ذات پر اطلاق ہو سکے جیسے زید، بکر وغیرہ۔ یہاں کلّی سے مراد قوم ہے اور جزئی سے مراد کوئی خاص فردِ قوم۔ مطلب یہ ہے کہ قومی تحریکوں کے نام سے جو تحریکیں ہمارے قومی لیڈر چلا رہے ہیں وہ دراصل کلّی تحریکیں یعنی ایسی تحریکیں نہیں ہیں جو قوم کے تمام افراد کی ضروریات و مفاد کو مدنظر رکھ کر شروع کی گئی ہیں بلکہ جزئی تحریکیں ہیں جنہیں لیڈروں نے خود اپنی ضروریات اور اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر قومی تحریکوں کے نام سے شروع کیا ہے ان تحریکوں کو چلانے کی ضرورت لیڈروں کو اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے پیش آتی ہے مگر نام ان کا قوم کو مغالطہ میں ڈالنے اور اپنے غمزے دکھانے کے لئے لیڈروں نے قومی تحریکیں رکھ دیا ہے۔ ـسہ یعنی مسلمانوں کو سوائے اس کے کہ آپس میں لڑیں اور کوئی کام نہیں نہ ان کو اس پر غصہ آتا ہے کہ بددینی اور کفر کیوں (باقی صفحہ ۱۵۱ پر)

بلبل اسپیچیں دیتی ہے اور پروانہ جان

بچشمِ غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت — وہ اسپیچیں دیا کرتی ہے اور یہ جان دیتا ہے
وہ (بلبل) پھنستی ہے قفس میں اور اس (پروانہ) کا نام روشن ہے — ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

عقلِ کثیر اور حسنِ تدبیر

کیا اس کی خوشی کہ تم کو ہے عقلِ کثیر — ہم کو تو اسی سے کر دیا تم نے فقیر
ہرگز یہ نہیں ہے حسنِ قانونِ خدا — کہتے ہیں حضور اس کو حسنِ تدبیر (نیچر کا قانون)

کفر کا علاج ممکن، نیٹویت جان کے ساتھ ہے

اکبر اس اندیشہ میں رہتا ہے غرق — کافر و نیٹو (ہندی) میں ہے تھوڑا ہی فرق
کافری کا ہے علاج ایماں سے — نیٹویت تو ہے لپٹی جان سے

ـلہ مطلب یہ ہے کہ جو لیڈر قوم کی محبت میں بلبل کی طرح محض تقریریں کیا کرتے ہیں وہ تو جیل میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جو پروانہ کی طرح شمعِ قوم پر فدا ہو جاتے اور جان قربان کر دیتے ہیں ان کا نام شہداء کے قوم میں لکھا جاتا اور ہمیشہ روشن رہتا ہے۔ چونکہ اس مضمون سے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور ملک و ملت کے لئے جان دینے کی ترغیب نکلتی تھی اس لئے حضرت اکبر نے اس کو بلبل و پروانہ کے استعارہ میں بیان کر کے چوتھے مصرع میں اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اکبر نے خیمۂ معنی کو ہوا پر تان دیا ہے یعنی اکبر کا اصل مقصود اور اشعار کا حقیقی مفہوم معلوم کرنے کے لئے لفظوں کی نشست سے اوپر دیکھنے کی ضرورت ہے جہاں ہوا۔ یعنی قانونی گرفت سے بچنے کے لئے معنی کا خیمہ تانا گیا یا کھڑا کیا گیا ہے۔ ـلہ مطلب یہ ہے کہ نئے علوم و فنون کے حاصل کرنے سے ممکن ہے کہ تمہاری عقل بڑھ گئی ہو۔ مگر عقل کی اس زیادتی سے قوم تو فقیر اور محتاج ہو گئی۔ فلاح قوم کی جن تدبیروں کو تم اچھا سمجھ رہے ہو وہ تمہاری عقل کے نزدیک اچھی ہوں تو ہوں۔ مگر خدا کا قانون تو انہیں اچھا نہیں بتاتا کیونکہ وہ اگر قانونِ قدرت کی رو سے بھی اچھی ہوتیں تو ان کے نتائج بھی اچھے نکلتے۔ ـسہ نیچو = Nature (باقی صـ۱۵۳ پر)

پہلی کتابیں ردّی صاحب کا قول سچا

انساں کا علم کامل سابق میں تھا نہ اب ہے — لیکن نئی طرح کا اک بحر بہہ رہا ہے
مرزا غریب چُپ ہیں اُن کی کتاب ردّی — بڈھوؔ اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

دوسروں کے عمل دیکھا کئے خود کچھ نہ کیا

یہی بحثیں رہیں سب میں وہ کیسے ہیں وہ کیسے تھے — یہی سنتے ہوئے گزری وہ ایسے ہیں وہ ایسے تھے
عمل اوروں ہی کے دیکھا کئے یہ نیک یہ بد ہیں — ترقیؔ خود نہ کی کچھ رہ گئے ویسے کہ جیسے تھے

اندھیرے میں پامال ہونے سے جل کر مر جانا اچھا

پوچھا پروانے سے کہ اے ناداں — آگ میں گر کے کیوں گنواتا ہے جاں
جل کے بولا کہ اے خرد دشمن — سن لے مجھ سے یہ معنیٔ روشن
شعلےؔ سے طالبِ وصال اچھا — یا اندھیرے میں پائمال اچھا

(صفحہ ۱۴۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) پھیل رہا ہے نہ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ہماری فطرت میں نئی روشنی کا تغیر کیسے ہو گیا ہے۔ سوائے زورِ قلم کے اُن میں اور کوئی طاقت نہیں رہی اور اس زورِ قلم یا قوتِ انشا کو کہیں نہ کہیں صرف کرنا ہے اس لئے اس کو آپس کی خانہ جنگی ہی میں صرف کیا جا رہا ہے۔
۱ مطلب یہ ہے کہ جس علم کی معاون و سرپرست حکومت ہو جاتی ہے وہی سب علموں سے فائق رہتا ہے اور باوجودیکہ علم نہ کبھی پہلے کامل تھا نہ اب ہے لیکن حکومت کی سرپرستی میں آجانے والے علم کو عقلِ کامل سمجھنے لگتے ہیں اور پہلے علوم کی کتابیں ردّی ہو جاتی ہیں۔ ۲ یعنی ہم ہمیشہ دوسروں ہی کی اچھائیوں اور برائیوں کو دیکھتے رہے اور اپنی حالت کی اصلاح کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ ۳ یعنی ان دونوں میں کون اچھا، وہ جو پروانہ کی طرح شعلہ سے وصال کی طلب میں جل جائے۔ یا وہ جو رینگنے والے کیڑے کی طرح اندھیرے میں پیروں سے روند دیا جائے۔ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ انسان کسی اہم اور محبوب مقصد کے حصول کی جدوجہد میں جان دے۔ یہ کیا کہ گھر میں دبک کر بیٹھ جائے اور امراض و آلام کا شکار ہو کر مر جائے۔

آپ بڑھے ہم گھٹے

گذرے مری نگاہ سے یاروں کے جمگھٹے — مطلب یہ تھا سرور بڑھے اور غم گھٹے
کھانے بھی خوب کھلائے اڑیں گلچھرّے بھی خوب — لیکن ہوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے
ہم تو اسی کو بات سمجھتے ہیں کام کی — عشقِ صمدؔ زیادہ ہو عشقِ صنمؔ گھٹے

قوم نیچرل ہے وہ بن نہیں سکتی

قوم اور سلطنت ہیں دو چیزیں — نیچرل وہ ہے یہ ہے مصنوعی
نیچرلؔ چیز بن نہیں سکتی — آئیں کیونکر صفاتِ مجموعی

(صفحہ ۱۵۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) کے معنی ہیں دیسی۔ یہاں مراد ہے غلام، محکوم اور محتاج۔ کافر اور نیٹو میں تھوڑا سا فرق اس لئے ہے کہ محکوم کو بھی رفتہ رفتہ وہی مذہب اختیار کرنا پڑتا ہے جو اس کے حاکم کا ہوتا ہے اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ (عوام الناس کا دین و مذہب بھی وہی ہوتا ہے جو ان کے بادشاہوں کا ہوتا ہے) اور فقر و محتاجی کا انجام عموماً کفر ہوا کرتا ہے حسبِ ارشادِ نبویؐ کاد الفقر ان یکون کفرا (قریب ہے کہ محتاجی اور ضرورت مندی کفر ہو جائے) نیٹویت یعنی دیس کا باشندہ ہونا بہتر ہے نیٹو کا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کفر ہماری نیٹویت یعنی محکومی و محتاجی کا تابع نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ کفر کی طرف میلان رکھنے والوں کے دلوں میں پھر ایمان کی روشنی پیدا کر دی جاتی۔ مگر جو کفر ہماری نیٹویت یعنی قومی محکومی کا نتیجہ ہے اس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ نیٹویت اور محکومیت تو ہماری جان کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس سے چھٹکارا جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ حکومت ہماری ہو۔
۱ گپ شپ یعنی بے تکلفانہ بحث مباحثے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو دوست بنانے ان کے ساتھ دعوتیں اڑانے اور بے تکلفانہ بات چیت اور بحث مباحثے کرنے کا نتیجہ بھی اس کے سوا کچھ نہ ہوا کہ بجائے راحت و خوشی حاصل ہونے کے ہماری تکلیفیں بڑھتی گئیں اور انگریز ترقی کرتے رہے اور ہم تنزل ۲ یعنی انگریزوں سے میل و محبت بڑھانے کے مذکورہ انجام کو دیکھ کر ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ غیر خدا کے بجائے خدا سے محبت کرنی چاہیئے۔ ۳ مطلب یہ ہے کہ قومیں بنانے سے نہیں بنا کرتیں۔ بلکہ اجتماعی اور قومی صفات افرادِ قوم میں مرکزِ قومیت کی طرف اُن کے طبعی اور فطرتی رجحانات سے پیدا ہوتی ہیں۔ برخلاف حکومتوں اور سلطنتوں کے کہ ان کے قیام و استحکام کے لئے ایسی قابلیتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو کسب و عمل اور جسمانی و دماغی کد و کاوش سے حاصل ہوتی ہیں۔

گربۂ زاہد کی نماز

بن گئی ہے خضرِ راہ دوستاں کید حریف — ہے نمازِ گربۂ زاہد سے خوش کبکِ نحیف
شہ کو یہ سجدہ ملایا چاہتا ہے خاک میں — کون سمجھے شاعروں کے یہ اشاراتِ لطیف

دسترس رکھنا چاہو تو بے بس نہ ہو

اونٹ نے گایوں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا — پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھنا چاہتے ہو باقی اپنی دسترس — منہ میں ہاتھی کے تم اے بھائی وہ گنّا نہ دو

ایشیا کی غفلت اور یورپ کی نظر

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے — کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی — نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

لہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مکار بلی کے پرہیزگاری و خدا ترسی کا جال بچھانے سے چکور دھوکہ میں آ کر بلی کا شکار ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے قومی لیڈروں کے مذہبی جامے پہن کر پبلک میں آنے اور نمائشی نمازیں پڑھنے سے قوم اُن کے پھندے میں پھنس رہی اور اپنی عاقبت خراب کر رہی ہے۔
ٹہ اونٹ سے مراد مسلمان ہیں۔ گایوں سے مراد ہندو، اور شیر سے مراد انگریز۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کو زک پہنچانے اور ان پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں نے انگریزوں سے دوستی گانٹھی۔ مگر نتیجہ اس دوستی کا یہ ہوا کہ انگریز مسلمانوں پر ایسے حاوی ہو گئے کہ مسلمانوں کی حیثیت انگریزوں ہی کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی نظر میں مینڈک سے بھی بدتر ہو گئی۔
تلہ یعنی جس چیز سے تم فائدہ اٹھانا اور اس پر اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہو اس پر کسی اپنے سے زیادہ بڑے اور طاقتور کا قابو اور اقتدار نہ ہونے دو، ورنہ وہ چیز اسی کے حصہ میں آئے گی جو تم سے زیادہ طاقتور ہے اور تم اُس سے محروم رہو گے۔ مسلمان ہندوؤں کو اپنا زیر دست رکھنا چاہتے تھے مگر انہوں نے یہ غلطی کی کہ اپنے سے زیادہ طاقتور انگریزوں سے دوستی کر کے ہندوؤں کو انگریزوں کی دسترس میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو انگریزوں کے ہو گئے اور مسلمان منہ تکتے رہ گئے۔ کلہ انجن سے مراد ہے تہذیبِ مغربی۔ مطلب یہ ہے کہ فضائے مشرق میں لامذہبی کی تاریکی پھیلنے سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مشرق پر بھی تہذیبِ مغربی کا تسلط ہو گیا ہے۔ ایشیا والے تو خوابِ غفلت میں پڑے سوتے رہے اور بیدار مغز اہلِ مغرب نے ایشیائی غفلت سے فائدہ اٹھا کر مشرق میں بھی اپنا تسلط جما لیا۔

تقلیدِ دہر

دانم کہ سادگی و خاموشی است اولیٰ — تقلیدِ دہر لیکن بربودہ است ہوشم
سودائے گفت در سر وضعِ صلیب در بر — دانم چرا نہ گویم دارم چرا نہ پوشم

آزادی غیروں کی اسیری کا نام نہیں ہے

میں بھی ہوں بہ دل مؤید آزادی کا — لیکن اک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر
آزاد ہو اس لئے کہ اغیار ہوں قید — مطلب یہ نہیں کہ خود ہوں غیروں کے اسیر

نورِ عرفاں کے لئے قرارِ دل ضروری

شتر روباہ سے کمتر ہیں بن میں محتبس ہو کر — بنے ہیں شیر کتے زینتِ آغوش میں ہو کر
قرارِ دل نہیں تو نورِ عرفاں کیا جگہ پکڑے — وہ شکلِ مہر و مہ موجوں میں کب ہے منعکس ہو کر

لہ صلیب یعنی سولی جس کی شکل پہلے زمانہ میں ایسی + یعنی چلیپائی ہوتی تھی اور جب پر سر اور دونوں ہاتھ پیروں میں میخیں ٹھونک کر آدمی کی جان لی جاتی تھی۔ عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی ہی صلیب پر سولی دی گئی تھی اس لئے صلیب کی شکل کی کوئی چیز اکثر عیسائی اپنے پاس رکھتے ہیں وضعِ صلیب سے مراد عیسائیوں کی وضع قطع ہے۔ ترجمہ اور مطلب اشعار کا یہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سادگی اور خاموشی اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن زمانہ کی تقلید نے میرے ہوش گم کر رکھے ہیں۔ دماغ میں بولنے کا جنون ہے اور شیوہ عیسائیوں کی وضع قطع اختیار کرنے کا۔ یعنی میرا مسلک یہ ہو گیا ہے کہ جو بات میں جانتا ہوں سے ضرور کہوں خواہ اس کا کہنا مناسب ہو یا نہ ہو۔ اور جب میں عیسائیوں کا لباس پہننے کی مقدرت رکھتا ہوں تو اسے ضرور پہنوں خواہ اس سے فائدہ ہو یا نقصان۔ یعنی میری عقل پر خواہشاتِ نفس اور تقلیدِ مغرب کے شوق کا پردہ پڑ گیا ہے۔ ٹہ یعنی آزادی اس کا نام نہیں ہے کہ تم غیروں کے محکوم و غلام ہو جاؤ اور ضروریاتِ زندگی کو اتنا بڑھا لو کہ بغیر دوسروں کی محتاجی کے زندگی بسر نہ کر سکو بلکہ سچی آزادی یہ ہے کہ دوسرے تمہارے محکوم و محتاج ہوں تلہ مطلب یہ ہے کہ عزت اور طاقت آزادی اور روش سے حاصل ہوتی ہے۔ اونٹ کو اگر کسی جنگل میں محبوس و مقید کر دیا جائے تو آزاد لومڑی بھی ایسے مقید اونٹ سے بہتر ہوتی ہے اور جن کتوں کو انگریزوں کی میم اپنی گود میں بٹھاتی ہیں وہ کتے ہونے کے باوجود اپنے آپ کو شیر سمجھنے لگتے ہیں کلہ خدا کی معرفت کا نور ایسے دل میں جو افکار دنیوی سے بے قرار اور مضطرب ہو کیسے برقرار رہ سکتا ہے بلکہ وہ چاند سورج کے اس عکس کی طرح لرزتا رہتا ہے جو دریا کی چلنے والی موجوں میں دکھائی دیتا ہے۔

قومیات
و
سیاسیات

ہم اور ہماری اولاد

پیش آئے ہمیں امور عادت کے خلاف ۔۔۔ پایا انہیں ہم نے اپنی راحت کے خلاف
اولاد[1] کو غالباً یہ تکلیف نہ ہو ۔۔۔ وہ خود ہی ہیں مورثوں کی خصلت کے خلاف

آبا و اجداد

جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی

بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور ۔۔۔ خیال تھا سوئے تشبیہ جستجوئیں تھیں
ہوا جو ٹائی ٹنک[2] غرق کہہ دیا میں نے ۔۔۔ کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزوئیں تھیں

[1] مطلب یہ ہے کہ ہماری تربیت تو پرانی تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیں نئی تہذیب کی باتیں اور عادتیں تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ آیندہ نسلوں کے لئے یہ نئی عادتیں غالباً تکلیف دہ نہیں ہوں گی۔ کیونکہ انہوں نے نئی تہذیب ہی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں وہ تربیت پا رہے ہیں۔

[2] ٹائی ٹینک انگریزوں کے ایک عظیم الشان جنگی جہاز کا نام تھا جسے بہت بڑی رقم خرچ کر کے کافی عرصہ کی محنت و کوشش کے بعد تیار کیا گیا تھا اور جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں ڈوب سکتا۔ مگر اتفاق سے وہ اپنے پہلے ہی سفر میں غرق ہو گیا اور اس کے غرق ہونے کو انگریزوں کی ایک بڑی قومی مصیبت سے تعبیر کیا گیا۔ اکبر فرماتے ہیں کہ میں اپنی مصیبت کے بیان کرنے کے لئے کسی ایسی تشبیہ کا متلاشی تھا جو اس مصیبت کا پورا نقشہ کھینچ سکے کہ جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی کی خبر ملی اور اس غمناک حادثہ کو میں نے اپنی مصیبت کا آئینہ پایا۔ جس طرح جہاز ٹائی ٹینک کے ڈوبنے سے انگریزوں کا دل اور اُن کی وہ آرزوئیں ڈوب گئیں جو جہاز مذکور کے ساتھ وابستہ تھیں اسی طرح مجھ پر پڑنے والی مصیبت نے بھی میرے دل کو مردہ اور میری آرزوؤں کو ختم کر دیا۔

ہم اور ہماری اولاد

پیش آئے ہمیں امور عادت کے خلاف — پایا انہیں ہم نے اپنی راحت کے خلاف
اولاد[1] کو غالباً یہ تکلیف نہ ہو — وہ خود ہی ہیں مورثوں (آباؤ اجداد) کی خصلت کے خلاف

جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی

بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور — خیال تھا سوئے تشبیہ جستجوئیں تھیں
ہوا جو ٹائی ٹنک[2] غرق کہہ دیا میں نے — کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزوئیں تھیں

[1] مطلب یہ ہے کہ ہماری تربیت تو پرانی تہذیب کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیں نئی تہذیب کی باتیں اور عادتیں تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ آئندہ نسلوں کے لئے یہ نئی عادتیں غالباً تکلیف دہ نہیں ہوں گی۔ کیونکہ انہوں نے نئی تہذیب ہی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی ماحول میں وہ تربیت پا رہے ہیں۔

[2] ٹائی ٹینک انگریزوں کے ایک عظیم الشان جنگی جہاز کا نام تھا جسے بہت بڑی رقم خرچ کر کے کافی عرصہ کی محنت و کوشش کے بعد تیار کیا گیا تھا اور جس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں ڈوب سکتا۔ مگر اتفاق سے وہ اپنے پہلے ہی سفر میں غرق ہو گیا اور اس کے غرق ہونے کو انگریزوں کی ایک بڑی قومی مصیبت سے تعبیر کیا گیا۔ اکبر فرماتے ہیں کہ میں اپنی مصیبت کے بیان کرنے کے لئے کسی ایسی تشبیہ کا متلاشی تھا جو اس مصیبت کا پورا نقشہ کھینچ سکے کہ جہاز ٹائی ٹینک کی غرقابی کی خبر ملی اور اس غمناک حادثہ کو میں نے اپنی مصیبت کا آئینہ پایا۔ جس طرح جہاز ٹائی ٹینک کے ڈوبنے سے انگریزوں کا دل اور اُن کی وہ آرزوئیں ڈوب گئیں جو جہاز مذکور کے ساتھ وابستہ تھیں اسی طرح مجھ پر پڑنے والی مصیبت نے بھی میرے دل کو مردہ اور میری آرزوؤں کو ختم کر دیا۔

قومیات
و
سیاسیات

دوالے۔ رسالے۔ مسجد اور شوالے

ملکی ترقیوں میں دوالے[1] نکالئے — پلٹن نہیں تو خیر رسالے[2] نکالئے
کافی ہے بہرِ شغل کلیسائے[3] فکرِ رزق — اب دل سے مسجد اور شوالے نکالئے

نیٹو ہونے کا رنج، ممبر ہونے کی خوشی

شیخ صاحب کو یہ صدمہ ہے کہ نیٹو[4] ہو گئے — میرزا خوش ہیں کہ سر پر آگیا کونسل کا تاج[5]
میرزا کا نام رہ سکتا ہے قائم سعی سے — شیخ جی کے رنج کا اللہ ہی جانے علاج[6]

---

[1] دوالے نکالنے سے مراد مفلس ہو جانا ہے۔

[2] پلٹن پیدل فوج کو کہتے ہیں اور رسالہ گھوڑے سوار فوج کو۔ رسالہ ماہوار یا ہفتہ وار شائع ہونے والے پرچہ کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رسالوں سے موقت الشیوع پرچے ہی مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ملک کی ایسی حیثیت اور اتنی طاقت تو ہے نہیں کہ وہ پلٹن بنا کر دشمنانِ ملک سے لڑیں۔ اس لئے ان کو بیکاری میں قومی ترقی کے مقاصد کے نام سے نئے نئے رسالے شائع کرنے کا ایک ایسا شغل مل گیا ہے جس سے ان کی رہی سہی پونجی بھی ضائع ہو جاتی ہے اور ان کے دوالے نکل رہے ہیں۔

[3] یعنی ذریعۂ حصول رزق چونکہ زیادہ تر انگریزوں کی ملازمت ہے اس لئے مسلمانوں کو مسجد اور ہندوؤں کو شوالے کا خیال دل سے نکال کر اب ذریعۂ رزق یعنی انگریزوں ہی کے معابد کلیساؤں کا دھیان کرنا چاہیئے۔ ویسے کلیسائے فکر رزق ایک نئی ترکیب اور زبان میں اچھا اضافہ ہے

[4] یعنی انگریز حقارت سے ان کو نیٹو یعنی کالا آدمی کہنے لگے [5] یعنی کونسل کی ممبری کو بڑی بھاری عزت اور قوت سمجھنے لگے۔ [6] یعنی کونسل کی ممبری کی عزت تو کوشش سے قائم رہ سکتی ہے لیکن نیٹو کہلائے جانے کا رنج تو تب ہی دور ہو سکتا ہے جب خدا انگریزوں کی حکومت کو ختم کر دے۔

انگریزوں کی بادشاہی میں مدّو اور ہندو

انگلش کو خدا نے بادشاہی دی ہے — رفتارِ زمانہ نے گواہی[1] دی ہے
مدّو[2] بھی لگاتے ہیں مدرّ[3] یا کا دم — ہندو کو چلم بھی لالہ[4] شاہی دی ہے

ہند میں شیخ جیسے گنگا میں اونٹ

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس — اونٹ[5] گنگا میں بہہ گیا افسوس
دیکھ کر ہم کو ایسی دلدل میں — راہ چلتا بھی کہہ گیا افسوس

شوقِ لیلائے سول سروس

شوقِ لیلائے سول[6] سروس نے مجھ مجنون کو — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون[7] کو

---

[1] یعنی رفتارِ زمانہ سے بھی اس کی تصدیق ہو رہی ہے کہ انگریز بادشاہی کے اہل ہیں۔ [2] مدّو سے مراد مسلمان چرسی اور بھنگڑ ہیں۔
[3] وہ چلم جس میں چرس بھر کر پی جائے۔ [4] یعنی ہندو چرسئے کی چلم میں بھی ہندوانہ پن ہے۔
[5] اونٹ کے گنگا میں بہنے سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سب خصوصیاتِ عرب ہند کی اقامت سے ختم ہو گئیں۔
[6] یعنی ہندوستانی مسلمان خصوصیاتِ عرب ختم ہونے کے بعد ایسی دلدل یا گہری کیچڑ میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا اور پھر اپنے اندر اسلامی خصوصیات کا پیدا کرنا ان کے لیے بیحد دشوار ہو رہا ہے۔
[7] Civil Service انگریزی الفاظ ہیں جن سے مراد بڑے بڑے انتظامی سرکاری عہدوں کی ملازمتیں ہیں۔
[8] یعنی بڑی سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے شوق میں لوگ کافی خرچ کر کے پتلونیں پہنتے ہیں لیکن عرصہ دراز کی دوڑ دھوپ اور صرفِ زر کے بعد نوکری حاصل کرنے میں ناکامی ہونے پر محتاج اور لنگوٹی بند ہو جاتے ہیں۔

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں — پھینکئے اب کوٹ کو تہہ کیجئے پتلون کو

خوش حالی سے بسر کرنے کیلئے بنگالی نکتہ

نکتہ یہ سنا ہے ایک بنگالی[1] سے — کرنا ہو بسر جو تم کو خوش حالی سے
خالی ہو جگہ تو اپنے بھائی کو دلاؤ — غصہ آئے تو کام لو گالی سے

مذہب کی کہو تو دل لگی، مطلب کی کہو تو پالیسی

مذہب کی کہو تو دل لگی میں اُڑ جائے — مطلب کی کہو تو پالیسی[2] میں اُڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ جوش — غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

جہاں تھے وہیں رہے بلکہ اور بدتر ہو گئے

چیخے، چلّائے، کودے، اچھلے، ٹہلے — ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے
حالت تو وہی ہے بلکہ اُس سے بدتر — یوں منہ سے جو جس کے دل میں آئے کہہ لے

---

[1] یعنی اب کہ کوٹ و پتلون کے شیدائیوں کی ہستی ہی خطرہ میں پڑ گئی اور جینا اتنا دوبھر ہو گیا ہے۔ انہیں کوٹ و پتلون کے شوق سے باز آجانا چاہئے۔
[2] انگریزوں کی ملازمت کا تجربہ بنگالیوں کو زیادہ تھا۔ [3] یعنی کسی مقصد کے لئے درخواست کرنے پر جواب یہ ملتا ہے کہ ایسی درخواستوں کا پورا کرنا ہماری پالیسی یعنی مصلحتِ حکومت کے خلاف ہے۔ [4] یعنی قومی ترقی کے لئے سب جتن کر کے مگر رہے وہیں کے وہیں۔

یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا

اور ہی تھی ساخت تیروں کی نشانہ اور تھا — یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا
تھی نہ یہ لیڈر کی رقاصی نہ یہ قانونِ غرب[۱] — سننے والے اور تھے اُس وقت گانا اور تھا

باہر جشن، گھر میں فاقہ

ہوٹلوں کو کنٹھا مبارک ہو — ریل کو یہ جتھا[۲] مبارک ہو
گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا کل رات — قوم کو یہ "نہ تھا"[۳] مبارک ہو

ارتقائے حال و خیال

غربی[۴] نسیم نفس کشا شاید آئے گی — مژدہ جواز نقلِ حکومت کا لائے گی
جن[۵] کے خیال و حال کو ہے ارتقا نصیب — سینوں میں ان کے غنچۂ دل کو کھلائے گی

۱ قانون ایک باجہ کا نام بھی ہے جو پیانو کی قسم کا ہوتا ہے۔ جہاں رقاصی (ناچ) کی رعایت سے یہی باجہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ کی ہر اک چیز یہاں تک کہ لوگوں کے مذاق بھی اس زمانہ میں بالکل بدل گئے ہیں اس وقت نہ آج کل کے سے اسلحہ تھے اور نہ آجکل کے سے سامان طرب بلکہ طریقہ رہنمائی بھی اس سے بالکل مختلف تھا جو اب ہے۔ ۲ جتھا یعنی گروہ۔ جماعت۔ غالباً مراد قومی کارکنوں کے اُن جتھوں سے ہے جو خلافت اور ترک موالات وغیرہ کی تحریکوں کے زمانہ میں سول نافرمانی کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ ۳ یعنی ہوٹلوں میں تو کنٹھائیں ہو رہی ہیں اور ریلوں پہ جتھے جا رہے ہیں۔ مگر گھروں کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔ ۴ مطلب یہ ہے کہ مغرب یعنی یورپ و امریکہ میں اس وقت جو انقلابات ہو رہے ہیں ان سے ممکن ہے کہ ایسے خوشگوار حالات پیدا ہو جائیں جن سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تبدیلی کی کوئی صورت نکل آئے یعنی شاید انگریزی حکومت خود اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے کہ اپنے اختیارات باشندگان ملک کو منتقل کر دے اور ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے۔ ۵ یعنی انتقال حکومت کی خوش خبری سے ان لوگوں کو بڑی مسرت ہو گی جو اپنی موجودہ غلامی سے تنگ آ کر آزادی و ترقی کے خواہشمند ہیں۔

بڑا وہ جو صاحب سے ڈرے

خاموش بڑائی کرنے والے ہیں کھڑے — اس وقت تو وہ بڑا جو صاحب سے ڈرے
کہتے[۱] ہیں ہمیں مصیبتوں میں پڑ جائیں — کب تک یہ ڈریں کوئی مصیبت نہ پڑے

سخن فہم کم، گزٹ فہم زیادہ

ہیں قوم[۲] کے دماغ میں مرے سہم بہت — سنئے یہ خیال جس میں ہے وہم بہت
قومی مجلس میں اب سخن فہم ہیں کم — دربار میں گو کہ ہیں گزٹ فہم بہت

دل کو سنبھالے رکھنا بھی غنیمت ہے

جو حسرتِ دل ہے وہ نکلنے کی نہیں — جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت دل کو سنبھالے رہئے — قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

۱ یعنی جو لوگ انگریزوں کی تعریف و توصیف اب تک اس ڈر سے کرتے رہے ہیں کہ کہیں انگریزوں کو ناراض کرنے سے ان پر کوئی آفت و مصیبت نہ نازل ہو۔ اب یہی لوگ پیہم ڈرتے رہنے سے تنگ آ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس خوف و دہشت سے اپنی جان گھلاتے رہنے کی بجائے ان آفات و مصائب ہی کا کیوں نہ مقابلہ کریں۔ جن کا خوف ان پر مسلط رہتا ہے تاکہ ایک دفعہ پوری مصیبتیں اٹھا کر ہمیشہ کیلئے خوف و دہشت کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیں۔ ۲ یعنی قوم کی موجودہ کمزوریوں اور گمراہیوں کے خلاف جو باتیں مجھ کو کہنی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سخن فہمی کا مادہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور گزٹ فہمی یعنی قانون دانی اور سرکاری اعلانات و بیانات کے سمجھنے کی قابلیتیں بڑھ رہی ہیں۔

یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا

اور ہی تھی ساخت تیروں کی نشانہ اور تھا — یہ زمانہ اور ہے اور وہ زمانہ اور تھا
تھی نہ یہ لیڈر گی رقاصی نہ یہ قانونِ غرب[1] — سننے والے اور تھے اُس وقت گانا اور تھا

باہر جشن، گھر میں فاقہ

ہوٹلوں کو کُتّا[2] مبارک ہو — ریل کو یہ جھٹکا[3] مبارک ہو
گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا کل رات — قوم کو یہ "نہ تھا"[4] مبارک ہو

ارتقائے حال و خیال

غربیؔ نسیم نفس کش شاید آئے گی — مژدہ جواز نقلِ حکومت کا لائے گی
جن کے خیال و حال کو ہے ارتقا نصیب — سینوں میں ان کے غنچۂ دل کو کھلائے گی

[1] قانون ایک باجہ کا نام بھی ہے جو پیانو کی قسم کا ہوتا ہے۔ جہاں رقاصی (ناچ) کی رعایت سے یہی باجہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ کی ہر اک چیز یہاں تک کہ لوگوں کے مذاق بھی اس زمانہ میں بالکل بدل گئے ہیں اس وقت نہ آج کل کے سے اسلحہ تھے اور نہ آجکل کے سے سامان حرب بلکہ طریقہ رہنمائی بھی اس سے بالکل مختلف تھا جو اب ہے۔ [2] جھٹکا بمعنی گردہ۔ جماعت۔ غالباً مراد قومی کارکنوں کے اُن جتھوں سے ہے جو خلافت اور ترک موالات وغیرہ کی تحریکوں کے زمانہ میں سول نافرمانی کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ [3] یعنی ہوٹلوں میں تو کتھائیں ہو رہی ہیں اور ریلوں پہ جتھے جا رہے ہیں۔ مگر گھروں کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں فاقوں کی نوبت آگئی ہے۔ [4] مطلب یہ ہے کہ مغرب یعنی یورپ و امریکہ میں اس وقت جو انقلابات ہو رہے ہیں ان سے ممکن ہے کہ ایسے خوشگوار حالات پیدا ہو جائیں جن سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تبدیلی کی کوئی صورت نکل آئے یعنی شاید انگریزی حکومت خود اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے کہ اپنے اختیارات باشندگان ملک کو منتقل کر دے اور ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل جائے۔ [5] یعنی انتقال حکومت کی خوش خبری سے ان لوگوں کو بڑی مسرت ہو گی جو اپنی موجودہ غلامی سے تنگ آکر آزادی و ترقی کے خواہشمند ہیں۔

بڑا وہ جو صاحب سے ڈرے

خاموش بڑائی کرنے والے ہیں کھڑے — اس وقت تو وہ بڑا جو صاحب سے ڈرے
کہتے[1] ہیں ہمیں مصیبتوں میں پڑ جائیں — کب تک یہ ڈریں کوئی مصیبت نہ پڑے

سخن فہم کم، گزٹ فہم زیادہ

ہیں قوسِ[2] دماغ میں مرے سہم بہت — سنئے یہ خیال جس میں ہے وہم بہت
قومی مجلس[3] میں اب سخن فہم ہیں کم — دربار میں گو کہ ہیں گزٹ فہم بہت

دل کو سنبھالے رکھنا بھی غنیمت ہے

جو حسرتِ دل ہے وہ نکلنے کی نہیں — جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت دل کو سنبھالے رہئے — قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

[1] یعنی جو لوگ انگریزوں کی تعریف و توصیف اب تک اس ڈر سے کرتے رہے ہیں کہ کہیں انگریزوں کو ناراض کرنے سے ان پر کوئی آفت و مصیبت نہ نازل ہو۔ اب یہی لوگ پیہم ڈرتے رہنے سے تنگ آگئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس خوف و دہشت سے اپنی جان گھلاتے رہنے کی بجائے ان آفات و مصائب ہی کا کیوں نہ مقابلہ کریں۔ جن کا خوف ان پر مسلط رہتا ہے تاکہ ایک دفعہ پوری مصیبتیں اٹھا کر ہمیشہ کیلئے خوف و دہشت کی مصیبت سے نجات حاصل کر لیں۔ [2] یعنی قوم کی موجودہ کمزوریوں اور گمراہیوں کے خلاف جو باتیں مجھ کو کہنی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سخن فہمی کا معیار روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور گزٹ فہمی یعنی قانون دانی اور سرکاری اعلانات و بیانات کے سمجھنے کی قابلیتیں بڑھ رہی ہیں۔

معنی نہ سہی صورت تو وہ ہو

مرشد[1] نے کہا اُٹھئے حضرت معنی[2] نہ سہی صورت تو وہ ہو — گھر چھوڑ کے بسیے بنگلے میں طاقت نہ سہی زینت تو وہ ہو
اب نقش[3] کی کردو خانہ پُری تقدیر رہے گی پھر نہ بُری — راس (موافق) آئے گی تم کو بادہ خوری (شراب نوشی) مجلس تو وہ ہو صحبت تو وہ ہو

بے ایمانوں سے تعرض نہ کرو

مصحف مُسلم نے کھولنا چھوڑ دیا — بنئے نے ٹھیک تولنا چھوڑ دیا
حاکم[4] نے کہا نہ بولو (تعرض نہ کرو) ان سے ہرگز — ہم نے بھی سب سے بولنا (باز پرس کرنا) چھوڑ دیا

نہ ملک اسلام، نہ ملک لچھمن و رام. یورپ کا گودام

یہ بات غلط مُلکِ اسلام ہے ہند — یہ جھوٹ مُلکِ لچھمن و رام (یعنی ہندو) ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام[5] ہے ہند

[1] مرشد سے مراد تہذیب مغربی ہے [2] معنی سے مراد مغربی کیرکٹر و سیرت کی بعض خوبیاں ہیں۔ [3] نقش کے معنی اس تعویذ کے بھی ہیں جس میں خانے ہوتے ہیں اور خانوں میں ہندسے وغیرہ لکھے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی نقش کا تعویذ باندھ لیجیے یعنی مغربی طرز بود و ماند کے اختیار کر لینے سے تم کو شراب نوشی بھی راس آنے لگے گی۔ یعنی تمہاری شراب نوشی بھی ان مقاصد کے حصول میں مدد دیگی جو مغربی تقلید سے تمہارے پیش نظر ہیں اور تمہیں تقدیر کے کھوٹی ہونے کی شکایت نہیں رہے گی۔

[4] مطلب یہ ہے کہ حکومت کا قانون ایسے لوگوں سے تعرض کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو مذہب سے روگردانی کرتے یا اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی اُن سے باز پرس کرنا چھوڑ دیا۔

[5] یعنی فراہمی غلہ و اشیاء خام کا ایک ذریعہ۔

قوم کے فاقے شبرات کے پڑاقے

پڑا ہے قحط بشر مر رہے ہیں فاقوں سے — خوشی ہو کیا مجھے شبرات میں پڑاقوں سے
بجھی ہوئی ہے طبیعت یہ روشنی ہے فضول — اتار لیجیے صاحب چراغ طاقوں سے

نہ بھرم رہے گا نہ دھرم

بگو بہ سیٹھ[1] کہ او را بھرم (ساکھ، اعتماد) نخواہد ماند — بگو بہ برہمن او را دھرم (مذہب) نخواہد ماند
من ارچہ در نظر یار شرمسار شدم — رقیب (مراد ہندو ہیں) نیز چنیں محترم نخواہد ماند

جوانی میں عشقِ بتاں پیری میں عشقِ قوم

مذہب نے کر دیا تھا ہر ایک کو غریقِ نوم (نیند) — تھے مبتلائے حج و صلوٰۃ و زکوٰۃ و صوم
دنیا[2] و دیں کا فیصلہ آخر کو یہ ہوا — عشقِ بتاں شباب میں پیری میں عشقِ قوم

[1] ترجمہ۔ سیٹھ سے کہو کہ اس کی ساکھ قائم نہیں رہے گی۔ برہمن سے کہو کہ اس کا مذہب باقی نہیں رہے گا۔ میں اگرچہ یار کی نظر میں شرمندہ ہوا ہوں۔ مگر رقیب کی بھی یہ عزت و وقعت باقی نہیں رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان اگرچہ انگریزوں کی نظر میں ذلیل ہو گئے ہیں مگر ہندو جو آجکل مسلمانوں کے رقیب بنے ہوئے ہیں اُن کی عزت و وقعت بھی چند روزہ ہے۔ وقت آ رہا ہے کہ نہ سیٹھوں کی ساکھ رہے گی اور نہ برہمنوں کا دین۔ [2] مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کو اسی دنیاوی زندگی تک محدود کر دیا گیا اور نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ کی بجائے جوانی میں بتوں کے عشق کو دنیا اور بڑھاپے میں قوم و عشق کو آخرت سمجھ لیا گیا ہے۔

آزادیٔ رندانہ اور اسیریٔ فکرِ خانہ

تھا تصور مالکِ آزادیِ رندانہ ہوں — لیکن اب بالکل اسیرِ انتظامِ خانہ ہوں
پہلے تھا اُس بت کے گرد اب ساتھ ہی بچوں کی فوج — عشق میں دیوانہ تھا اب فکر میں دیوانہ ہوں

پیٹ دوڑاتا ہے

مہمانِ فلک کہاں سکوں پاتا ہے — آسودہ جو ہیں اُنہیں بھی ٹہلاتا ہے
ہے ہضم کی فکر میں یہ نقل و حرکت — ظاہر ہے صریح پیٹ دوڑاتا ہے

پاس کی فکر دور سے بے فکری

دُھن نوکری کی ہے نہ پری ہے نہ حور ہے — اب فکرِ پاس کی ہے قیامت تو دور ہے
آئین بھی بدلتے ہیں نیت کے ساتھ روز — امیدِ بے اصول سے اب دل نفور ہے

۱؎ یعنی کام کاج کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ۲؎ یعنی ساری دوڑ دھوپ پیٹ کے لئے ہوتی ہے ۳؎ پاس لفظ اردو میں قریب اور لفظ انگریزی PASS یعنی امتحان پاس کرنا۔ یہاں پاس کے دونوں معنی لئے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کو تو دور ہونے کی وجہ سے لوگ بھولے ہوئے ہیں اور سب اپنی قریبی یعنی موجودہ ضرورتوں کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں یا یہ کہ نوکریاں حاصل کرنے کیلئے امتحانات پاس کرنے کی فکر میں ہیں۔ ۴؎ امیدِ بے اصول سے مراد ایسی امید ہے جو کسی معقول بنیاد پر قائم نہ ہو یعنی جہاں نیتیں اور قانون روزانہ بدلا کریں وہاں کوئی امید کیا قائم کی جا سکتی ہے۔

مذہبی بحث اور قومی اصلاح

مذہب[1] کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا — چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر — قسمت ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

ہر شخص بجائے خود ایک قوم

اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی — گذرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقیٔ قومی ہے — ہر شخص[2] بجائے خود بنا ہے اک قوم

ننانوے کا پھیر

اک روز بھی تارکِ تگ و دو نہ ہوئے — فارغ از بحثِ گندم و جو نہ ہوئے
جمعیتِ دل کہاں حریصوں کو نصیب — ننانوے ہی رہے کبھی سو[3] نہ ہوئے۔

۱؎ مطلب یہ ہے کہ ہم غیروں کا شکوہ کیا کریں۔ خود ہمارے ہی اندر ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جو ہماری تباہی و بربادی کا باعث ہو رہی ہیں۔ جب مذہب کی طرف جھکتے ہیں تو آپس ہی میں بحثیں کر کے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور جب اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو مذہب ہی کو خیرباد کہہ دیتے اور خدا کو بھول جاتے ہیں ۲؎ یعنی ہر شخص قومی نمائندگی اور لیڈری کا دم بھر رہا ہے اور اپنے ذاتی فائدہ ہی کو قومی نفع تصور کر رہا ہے۔ اسی لئے اصلاحی تحریکوں کو چلتے ہوئے کافی عرصہ ہو جانے کے باوجود قوم نہیں بنتی۔ ۳؎ حریص ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ اُن کے سو کبھی پورے نہیں ہوتے۔ سو روپے جمع کر لینے کے بعد ان کو دو سو پورے کرنے کی فکر ہوتی ہے اور دو سو کے بعد تین سو کی۔ وعلیٰ ہذا۔

نہ علمِ دیں، نہ علمِ زمیں بس فکرِ نانِ جویں

غرض اس سے نہیں مجھ کو بنی[1] ہے یہ زمیں کیونکر — یہ فرمائیں میسر آئے گی نانِ جویں کیونکر
یہی پرسش ہے ہر سو آپ بی[2] اے ہیں کہ ایف اے ہیں — یہ ہے جب رنگِ دنیا کا تو سیکھیں علمِ دیں کیونکر

دشمن کے ہاتھوں میں نہ کھیلو

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو — اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات — دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

مشغلۂ یونیورسٹی

دستِ فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی — جو کچھ تھی اس کی عظمت و وقعت وہ سب مٹی
اس کی دوا قناعت و نیکی ہے بس فقط — ہاں مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی[3]

---

[1] مطلب یہ ہے کہ زمین کی بناوٹ یعنی طبقات الارض پڑھ بھی لیا اور کھانے کو روٹی میسر نہ آئی تو ایسے علم سے کیا فائدہ پہنچا۔ ضرورت پہلے ایسے علوم سیکھنے کی ہے جن سے کم از کم پیٹ تو بھرتا رہے۔ جو کی روٹی ہی سے سہی۔ [2] بی اے اور ایف۔ اے انگریزی تعلیم کی دو ڈگریوں کے نام ہیں سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی انگریزی تعلیمی ڈگری کا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور دینی تعلیم کی اسناد کو ملازمت سرکاری میں کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم کو چھوڑ کر دینی تعلیم کی طرف کون توجہ کرے گا۔ [3] انگریزی لفظ University یعنی دارالعلوم مطلب یہ ہے کہ انقلابات زمانہ سے قوم کی جو عظمت و وقعت مٹ چکی ہے اس کا علاج تو بس اب یہی ہے کہ صبر و شکر سے کام لیا جائے اور نیکی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ رہی انگریزی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں اُن سے شاغل دنیاوی یعنی حصول معیشت میں مدد لی جا سکتی ہے۔

اپنے ہی نفس کی غلامی

ہوتی ہے نصیب تلخ کامی[1] تم کو — محسوس نہیں ہے اپنی خامی[2] تم کو
اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام — ہے[3] اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

وسعتِ مشرب کے لئے تبدیلیٔ وضع ضروری نہیں

رغبت جو دلائی وسعتِ[4] مشرب کی — شامل اس میں غرض تھی بے شک سب کی
لیکن تبدیل وضع و نقلِ فاتح — ہے بعض کی بات اور اپنے ہی مطلب کی

شان و شوکت کی نہیں راحت کی ضرورت ہے

روزی مل جائے مال و دولت نہ سہی — راحت ہو نصیب شان و شوکت نہ سہی
گھر بار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ — دربار[5] میں باہمی رقابت نہ سہی

---

[1] ناکامی و نامرادی [2] کوتاہی و کمزوری [3] یعنی تمہاری غلامی میں غیروں کے جبر کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ خود تمہاری اپنی اخلاقی کمزوریوں اور ناجائز خواہشوں کو دخل ہے۔ اس لئے دراصل تم دوسروں کے نہیں بلکہ خود اپنے ہی نفس کے غلام ہو [4] مطلب یہ ہے کہ نئے قومی لیڈروں نے جو وسعت مشرب یعنی مذہبی فراخ دلی و بے تعصبی سے کام لینے کی ترغیب دی اس کی ضرورت تو انگریزوں کی حکومت میں ساری قوم کے لئے تھی۔ لیکن لباس و طرز رہایش وغیرہ میں اپنی وضع چھوڑ کر انگریزوں کی جو تقلید کی جا رہی ہے اس سے اگر کچھ نفع پہنچ سکتا ہے تو صرف ان ہی معدودے چند لوگوں کو جن کا انگریزوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے یا جن کو انگریزی ملازمت وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ساری قوم کیوں اس خبط میں مبتلا ہو رہی ہے۔ [5] مطلب یہ ہے کہ دربار یعنی انگریزوں کی مصاحبی اور اُن کے دربار میں کرسیاں حاصل کرنے میں شان و شوکت تو ضرور ہے مگر اس سے وہ دلی راحت میسر نہیں ہوتی جو عزیزوں کے ساتھ گھر والوں میں رہنے سے ہوتی ہے اس لئے کہ درباراری اور مصاحبی میں ہر ایک دوسرے سے زیادہ عزت اور انگریزوں کا التفات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور رشک و رقابت کا یہ جذبہ سب کو غیر مطمئن اور آزردہ رکھتا ہے۔

میل کی ضرورت نہیں

اس قوم کو یک دلی کی رغبت ہی نہیں — جو ایک کرے اُدھر طبیعت ہی نہیں
اکبر کہتا ہے میل رکھو باہم — وہ کہتے ہیں کہ میل کی ضرورت ہی نہیں

رسالے والوں کے دوالے

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے — ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے
افسوس کہ مفلسی نے چھاپا مارا — آخر احباب کے دوالے[2] نکلے

خان بننا ہو تو انگریزی خواں بنو

اعزاز نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں — اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں
سید بننا ہو تو بنو سر[3] سید — ہونا[4] ہو خان تو تم ہو انگریزی خواں

[1] یعنی جو اتحاد و اتفاق کی تلقین کرے۔ [2] دوالے نکلنا ایسے مفلس ہو جانے کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے سب قرض خواہوں کے قرضوں کا بھگتان نہ کر سکے۔ [3] یعنی خالی سید ہونے کی آج کل کوئی قدر نہیں ہے جب تک کہ سید کے ساتھ سر کا بھی (جو انگریزی حکومت کا ایک بڑا خطاب ہے) اضافہ نہ ہو جائے۔ یعنی جب تک کہ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی طرح ایک نجیب الطرفین سید بھی انگریزی خطاب یافتہ نہ ہو جائے۔ [4] یعنی کسی پٹھان کی اپنے نام کے ساتھ خان لکھنے کی کوئی وقعت نہیں ہے جبکہ وہ انگریزی خواں یعنی انگریزی پڑھا ہوا نہ ہو۔ یا انگریزوں کی طرف سے اسے خان یا خان صاحب کا خطاب نہ مل جائے۔

غذا میسر نہ ہو تو ٹانک بیکار ہے

کمیٹیوں سے نہ ہو گا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہو گی
خیالِ ملت نہ ہو گا جب تک مفید ہرگز یہ بیک نہ ہو گی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی ہیں بھائی مانک[1]
غذا نہ ہو گی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک[2]

ایک دوسرے کی توہین جہالت ہے یا نفسانیت

مذہب قانونِ قوم کا بانی ہے — خالص طاعت عروجِ روحانی ہے
توہین[3] اک دوسرے کی کرتے ہیں جو لوگ — یہ جہل ہے یا ہوائے نفسانی ہے

[1] [illegible] نام ہے۔
[2] لفظ انگریزی TONIC بمعنی دوائے مقوی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی محض مقوی دواؤں سے قائم نہیں رہ سکتی جب تک مناسب غذا بھی کھانے کو نہ ملے۔ اسی طرح جب تک کہ بہبود ملت کے مقصد میں جو قوم کے لئے بمنزلہ غذا کے ہے سب متحد نہ ہوں اس وقت تک کمیٹیوں میں بحث مباحثوں سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔
[3] یعنی سچے مذہب سے جذبۂ مخالفت نہیں بلکہ جذبۂ طاعت پیدا ہوتا ہے اور جذبۂ طاعت سے روح ایسی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب کو نہیں بلکہ اُن کی خوبیوں کو دیکھا کرتی ہے۔ اس لئے مخالفوں کی توہین کرنے والے یا تو اپنے مذہب سے جاہل ہوتے ہیں یا بجائے روحانیت کے اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔

آنر کے لئے زبان درازی بُری، روٹی کیلئے جائز

آنر[1] کے لئے زبان درازی ہے بری — روٹی نہ ملے تو غل مچانا جائز
اس وقت (انگریز خطاب) میں ہے یہی نصیحت اچھی — اس ساز (باجہ) پہ ہے یہی ترانا (راگ) جائز

سب کو نوکری نہیں مل سکتی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی — ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت وزراعت کو دیکھ — عزت[2] کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

صحت، روزی، اور تسکین دل

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے — دیکھو نہ[3] ہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
صحت بھی ہو، روزی بھی ہو دل کو بھی ہو تسکین — دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے ساز کے لئے موزوں راگ یعنی موجودہ زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ اگر انگریزی خطابات حاصل کرنے ہیں تو انگریزوں کی خوشامد کرنی چاہیئے اور اُن سے زبان درازی نہیں کرنی چاہیئے۔ البتہ روٹی نہ ملنے پر آجکل شورش اور ہڑتالیں کرنا اور غل مچانا جائز ہے کہ بغیر غل مچائے ہوئے تنخواہ وغیرہ بڑھانے کے مطالبے پورے نہیں ہوتے [2] مطلب یہ ہے کہ ذریعہ معاش صرف سرکاری نوکری کو بنانا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ سرکاری نوکری ہر ایک کو نہیں مل سکتی۔ پڑھ لکھ کر دوسرے ذرائع معاش مثلاً صنعت و زراعت وغیرہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے اور اگر نوکری عزت کیلئے کرنی ہے تو سب سے بڑی عزت تو آدمی کا نیک خصال و نیک سلیقہ ہونا ہے اور یہی عزت اس کے لئے کافی ہے۔ [3] یعنی آپس میں ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو۔

قومی غیرت کی کمی

جس بات میں تم شکست ملت (زوال۔ فرقہ) سمجھو — اُس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو
جو بندۂ نفس (اغراض نفسانی) ہو مخالف اس کا — قومی غیرت کی اس میں قلت سمجھو

دھنی بننے کے لئے کمپنی بننے کی ضرورت

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہے اور دھنی (مالدار) بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی — کوشش لازم ہے کمپنی[1] بننے کی

وضع مغربی میں بھی دل مشرقی رکھو

گو کہ رک سکتی نہیں نقل وضع مغربی — پھر بھی کامل طور پر ممکن نہیں ہم قالبی (ہم رنگی)
اپنی تاریخ اپنی ملت سے رہو تم باوفا — بٹ[2] گی تم کو مبارک صاحبوں کو صاحبی

---

[1] لفظ انگریزی۔ Company یعنی جماعت بندی جو حصہ دار کسی تجارت کو اپنے مشترکہ سرمایہ سے چلاتے ہیں اُن کو مجموعی حیثیت سے کمپنی کہتے ہیں۔ آج کل تمام بڑی بڑی تجارتیں اور صنعتیں کمپنی کی ملکیت میں یعنی مشترکہ سرمایہ سے چل رہی ہیں اور ہر شخص کے علیحدہ علیحدہ تجارت کرنے سے عموماً وہ عظیم الشان منافع حاصل نہیں ہوتے جو کمپنی بنا کر تجارت کرنے سے ہوتے ہیں۔ تجارت ہی میں نہیں بلکہ ہر اہم قومی مقصد میں جو کامیابیاں باہمی اشتراک و اتحاد سے کام کرنے میں ہوتی ہیں وہ انفرادی کوششوں سے نہیں ہوتیں۔ اس لئے حصول مقاصد میں سب کو کمپنی بننے یعنی مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ تم انگریزوں کی حاکمی کو بس محکومی اور حاکمی ہی تک رہنے دو اس کی کوشش نہ کرو کہ وضع قطع میں انگریزوں کے ہمرنگ ہو جاؤ اور اپنی تاریخ اور اپنے مذہب سے روگردانی کرو۔

قانون سے فائدہ اُٹھانیکے لئے وفاداری کی ضرورت

پابند اگرچہ اپنی خواہش کے رہو | لائل[1] سبجکٹ تم برٹش کے رہو
قانون سے فائدہ اُٹھانا ہے اگر | حامی نہ کسی خراب[2] شورش کے رہو

پڑے رہو توکل بجندا

صاحب سے رُکے تو راعتوں کو ترسے | شوکت[3] سے اگر پھرے تو لعنت برسے
بہتر ہے پڑا رہے توکل[4] بجندا | باہر رکھے قدم نہ اپنے گھر[5] سے

جنگ کا نہیں بھنگ کا خیال

گفتم[6] ایراں را سر جنگ نہ ماند | آں مردی و آب ہوا و آں رنگ نہ ماند
آغا خندید گفت رنجے دگر است | کامروز برائے ساغرم بنگ نہ ماند

بھنگ

[1] Loyal Subject انگریزی الفاظ ہیں یعنی وفادار رعایا۔ [2] یعنی اگر امن واماں سے رہنا چاہتے ہو تو حاکم وقت کے قوانین کی پابندی کرو اور کسی باغیانہ سازش وشورش میں شریک نہ ہو۔ [3] شوکت سے مولانا شوکت علی تحریک خلافت کے لیڈر مراد ہیں۔ [4] توکل بجندا یعنی خدا پر بھروسہ کئے ہوئے [5] مطلب یہ ہے کہ سکون وعافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تو اس امید پر کہ خدا کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت پیدا کرے گا۔ خاموشی سے گھر میں بیٹھے رہو، سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی صورت میں اگر انگریزوں سے ترک موالات کروگے تو مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اور اگر قومی لیڈروں کی مخالفت کروگے تو قومی لعنت ملامت کے ہدف بنوگے۔ [6] ترجمہ: میں نے کہا ایران کو جنگ سے کوئی

(باقی صفحہ ۱۷۷ پر)

سرکاری خطاب کی دل کشی

راجہ[1] صاحب کو خطاب سی[2] ایس۔ آئی ہو گیا | مرتفع اب اور ہی اوج رسائی ہو گیا
راجہ صاحب میں ہے ایسی دل کشی اخلاق کی | جو ملا اُن سے بہ دل اُن کا فدائی ہو گیا

سب کچھ کرے مگر قوم کا ہمدرد رہے

جس سے جو بن پڑے وہی کام کرے | صاحب بنے کھلائے کھیلے آرام کرے
لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد | ہر حال میں ادعائے اسلام کرے

اصلی آزادی

ہمدرد ہوں سب یہ لطف آبادی ہے | ہمسایہ بھی ہو شریک تب شادی ہے
تسکین ہے جب کہ ہو خدا پر تکیہ | قانون[3] بنا سکیں تب آزادی ہے

سکون و اطمینان — بھروسہ

[1] راجہ صاحب سے مراد غالباً راجہ سر علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد ہیں جن کا ذکر حضرت اکبر کے اور اشعار میں بھی ہے۔ [2] سی۔ ایس۔ آئی C.S.I انگریزی حکومت کا ایک بڑا خطاب تھا جو خاص کارگزاروں اور بڑے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ان اشعار میں طنز نہ ہو بلکہ اظہار واقعہ ہو کہ جن راجہ صاحب کو خطاب ملا ہے وہ واقعی اس خطاب کے مستحق تھے۔ کیونکہ وہ ایسے خوش اخلاق ہیں کہ جو بھی اُن سے ملتا ہے اُن کا فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور طنز ہونے کی صورت میں اشعار کا مطلب یہ ہوگا کہ خطاب ملنے کے بعد راجہ صاحب کو چونکہ اور زیادہ عروج حاصل ہو گیا ہے اس لئے اُن سے ملنے والے خوشامد میں ان کی دل کشی اخلاق کے بہت مداح ہو گئے ہیں اور اپنے آپ کو ان کا فدائی بتلانے لگے ہیں۔ [3] یعنی اصلی آزادی یہ ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق ملکی قوانین خود بنا سکیں۔

خدا کی یاد، روٹی اور صفائی

کیا فرض ہے یہ کہ ہم ڈھٹائی سے رہیں — لازم کیا ہے، بلند دائی سے رہیں
کافی ہے خدا کی یاد اک گوشے میں — روٹی مل جائے اور صفائی سے رہیں

دلِ مشرق کی بیتابی

میں ہوں یا آپ جناب برہم[1]! — دنیا کی روش سے سب ہیں درہم برہم
بیتاب ہے زخم ہائے دل سے مشرق — یارب تری رحمتیں بنیں اب مرہم

تیری بھی کوئی صف ہے کہ نہیں

تجھ کو بھی جہاں میں کچھ شرف ہے کہ نہیں — کوئی طاقت تری طرف ہے کہ نہیں
داخل ہے نمازیوں میں یا فوج میں ہے — آخر تری بھی کوئی صف[2] ہے کہ نہیں

---

[1] یہ خطاب حکیم برہم صاحب مرحوم ایڈیٹر ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور سے ہے۔ غالباً یہ رباعی اخبار مشرق ہی کے لئے لکھی گئی تھی۔

[2] صف بمعنی قطار۔ صف میں ہونے سے مراد کسی تنظیمی دستہ میں منسلک ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو بھی کسی ایسی منظم جماعت یا گروہ میں شامل ہونا چاہیئے۔ جس سے تم میں اتحاد و یگانگت اور تنظیم و یک جہتی کی قوت پیدا ہو۔ اگر نماز کی صف بندی میں تم شامل نہ ہو۔ یعنی باجماعت نماز ادا نہ کرو تو کم از کم فوج کی صف بندی ہی میں شامل ہو جاؤ۔

جاہ اور شاہ کے خواہاں

بیخود ہیں وہ جو دل سے ہیں اللہ کے خواہاں — ہیں مست نگاہِ بتِ دل خواہ کے خواہاں
آسودہ ہیں علم و ہنر و فن میں جو ہیں محو — چکر[1] میں ہیں بس جاہ کے اور شاہ کے خواہاں

دل کی پھانسیں

مشکل سے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں — پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی — یونہیں[2] یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

زمینداروں کی محتاجی

محتاجِ درِ وکیل و مختار ہیں آپ — سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ

(صفحہ ۱۷۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) دلچسپی نہیں رہی۔ اور ایران کی بہادری اور جنگجویانہ شہرت و روایات ختم ہو گئیں۔ آغا (باشندۂ ایران) یہ سنکر ہنسا اور بولا مجھے ان باتوں پر تو نہیں مگر ایک اور بات کا افسوس ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے پیالہ کے لئے آج بھنگ نہیں رہی۔ مطلب یہ ہے کہ ایرانیوں پر نفس پرستی و عیش کوشی اس قدر غالب ہو گئی ہے کہ وہ اپنی قدیم خصوصیات و روایات کے مٹنے پر ماتم کرنے کی بجائے حظ نفس کے سامان مثلاً بھنگ وغیرہ کے نہ ملنے پر افسوس کرتے ہیں۔ حضرت اکبر کے زمانہ میں ایران کا ایسا ہی حال ہو گیا تھا۔ [1] مطلب یہ ہے کہ خدا پرست خدا پرستی میں، محب اپنے محبوب کے عشق میں اور دلدادگان علم و فن اپنے علم و ہنر میں محو و مشغول ہیں۔ مگر جو دنیاوی عزت و جاہ اور حکام رسی کے بھوکے ہیں وہ اسی چکر میں گرداں و پریشان رہتے ہیں۔ [2] کہانیوں سے یہاں مراد حکام وقت کے مظالم کی کہانیاں ہیں جن کی پھانسیں یعنی تکلیف دہ یادیں ہر وقت دل میں کھٹکتی رہتی ہیں اور جن کو صاف طور پر زبان پر نہیں لایا جا سکتا۔

آوارہ و منتشر ہیں مانندِ غبار　　معلوم ہوا مجھے کہ زمیندار ہیں آپ

پیر پیمبر ہونا آسان، علی برادر ہونا مشکل

دشوار ہے ستحق آنر ہونا　　کچھ سہل نہیں علی برادر ہونا
ہاں سب یہ دعا کریں کہ ان بندوں کو　　آسان ہو پیر اور پیمبر ہونا

چُپ رہنے والا گردن زدنی، بولنے والا کافر

شیخ جی کا وقت آخر ہو گیا　　جانِ مُل کا حال ظاہر ہو گیا
کیا تماشا ہے کہ چُپ شہ مارا گیا　　اور جو بولا وہ کافر ہو گیا

خاموش رہنے والا

لہ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے زمینداروں کی حالت ایسی خراب ہے کہ دن رات اُنہیں کچہریوں کی خاک چھاننی، وکیلوں اور مختاروں کی خوشامدیں کرنی اور سرکاری دفتروں کے سب ملازموں کی نازبرداریاں کرنی پڑتی ہیں ؎ تحریک خلافت کے مشہور لیڈران مولانا شوکت علی مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم کو جو دونوں حقیقی بھائی تھے اور خلافتی تحریک کے زمانہ میں جن کا طوطی بول رہا تھا انگریزی اخبارات میں علی برادر یا علی برادران لکھا جاتا تھا۔ پھر علی برادران کا لقب ان دونوں بھائیوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔ ؎ مطلب یہ ہے کہ حکام رسی کے ذریعہ سے خطابات کا حاصل کرنا بھی دشوار ہے اور قومی لیڈری کے ذریعے سے علی برادران کی جیسی عزت حاصل کرنا بھی۔ البتہ اس زمانہ میں غلامانِ حکومت انگریزی کے لئے پیر یا پیمبر بن جانا (یعنی دعوائے نبوت کر دینا) زیادہ آسان ہے۔ لہٰذا جو بڑا بننا چاہتے ہیں اُن کے لئے ہم سب کو پیر یا پیمبر بننے کی دعا کرنی چاہیئے۔ ؎ JOHN BULL سے مراد انگریزی قوم ہے ؎ یعنی تجربے انگریزی قوم کی یہ عجیب خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ

(باقی صفحہ ۱۷۹ پر)

دھوتی کی شکن اور پتلون کا بٹن

خوش آیا آپ کو دھوتی میں پُر شکن رہنا　　ہمیں پسند ہے پتلون کا بٹن رہنا
رہینِ ہنود کی باتیں سوا اس میں فرق نہیں　　نصیب دونوں کو ہے صدر انجمن رہنا

ہوائیں پھر وہی ہوں اور وہی امن

دھرم کی رکھ لے اے بھگوان تو لاج　　ہمارا ہند ہو دنیا کا سرتاج
ہوائیں پھر وہی ہوں اور وہی امن　　وہی گائیں، وہی بنسی، وہی راج

شرم۔ عزت　　بانسری۔ نے

(صفحہ ۱۷۸ کا بقیہ فٹ نوٹ) اپنی تکلیفوں اور شکایتوں کو زبان پر نہیں لاتے اور منہ سیئے رہتے ہیں اُن کی تو کوئی دادرسی نہیں ہوتی اور جو حکومت کی زیادتیوں اور بے انصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اُن کو کافر یعنی باغی و سرکش قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس لئے شیخ جی یعنی پرانے ٹائپ کے مسلمانوں کا ایسے حالات میں زندہ رہنا اور عافیت سے گزارہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔

لہ دھوتی ہندوؤں کا پہناوا ہے اور وہ اس طرح ڈھیلی ڈھالی باندھی جاتی ہے کہ کپڑے میں شکنیں اور سلوٹیں پڑی رہتی ہیں۔ دھوتی کے پہناوے سے ہندوؤں کے اس کیرکٹر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ بہت زیادہ کھنچے اور تنے ہوئے نہیں رہتے یعنی اُن میں شیخت و تمکنت زیادہ نہیں ہوتی اور وہ حسبِ ضرورت پھیل بھی جاتے اور سمٹ بھی جاتے ہیں یعنی نرمی کے موقع پر نرم اور سختی کے موقع پر سخت ہو جاتے ہیں ؎ پتلون انگریزوں کا پہناوا اور ایک چُست لباس ہے۔ باوجود چستی کے اس کا کپڑا تو جگہ سے بے جگہ ہو سکتا ہے مگر بٹن اس کا جہاں لگا ہوتا ہے وہیں رہتا ہے۔ اس لئے پتلون کا بٹن رہنے سے مراد ہے اپنی روش پر سختی سے قائم رہنا اور اُس سے ٹس سے مس نہ ہونا ؎ مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے کیرکٹر میں اگرچہ کافی فرق ہے۔ ایک کو موم کی ناک کی طرح توڑا مروڑا جا سکتا ہے دوسرے کو اپنے موقف سے ہٹانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اس اختلاف کیرکٹر سے ظاہری اعزازوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قومی انجمنوں کی صدارتیں ہندو بھی کرتے ہیں اور مسلمان بھی۔ ؎ اس مصرع میں اشارہ ہے ہندوؤں کے مشہور اوتار کرشن جی کے زمانہ کی طرف۔ کرشن جی گائیں چرایا کرتے اور بڑی دل کش بنسی یا بانسری بجایا کرتے تھے۔ یہاں وہی بنسی اور وہی گائیں مراد ہیں۔

خطاب پر سب کچھ واپس

مذہب واپس ، خیالِ جنت واپس — مسجد کا وہ حق ، وہ نذر و دعوت واپس
حضرت نے یہ صاف کہدیا سب[1] کہ ہیں — کرنے کا نہیں خطاب و خلعت واپس

پنجاب کا بلوا بھی بُرا علی گڑھ کا حلوا بھی

میرے نزدیک یہ پنجاب[2] کا بلوا بھی بُرا — ساتھ ہی اس کے علی گڑھ[3] کا یہ حلوا بھی بُرا
آپ اظہارِ وفا کیجئے تمکین کے ساتھ — لیٹ جانا بھی بُرا ناز کا جلوا بھی بُرا

---

[1] آزادی ہند کی تحریکوں کے سلسلہ میں ایک تحریک یہ بھی شروع ہوئی تھی کہ انگریزوں کے دیئے ہوئے خطابات و اعزازات واپس کر دیئے جائیں۔ بہت سے وطن دوستوں نے اپنے خطابات واپس کر دیئے ۔ مگر کچھ انگریز پرست طبقۂ علما تک میں ایسے تھے جنہوں نے ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے گوارا کر لئے مگر خطابات واپس نہیں کئے یہاں ایسے ہی لوگ مراد ہیں ۔

[2] و [3] رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں پنجاب میں انگریزی حکومت کے خلاف ایک بڑا فساد یا بلوا ہو گیا تھا۔ حضرت اکبر حکومت کے خلاف اس قسم کے بلوؤں کو بھی ناپسند کرتے ہیں ۔ اور علی گڑھ سے تعلق رکھنے والوں کی حکومت پرستی و امن پسندی کو بھی وہ کہتے ہیں ۔ نہ تو اتنی خوشامد اچھی کہ حکومت کی نظر میں وقعت نہ رہے اور نہ ایسی نازیبا حرکتیں کرنی جنہیں حکومت برداشت نہ کر سکے ۔

شملہ کا طُرّہ

اُونچ ہے یہ رئیسوں کی تمانہ ہے نہ عملے کا — نہ یہ پودا ہے گلشن کا نہ یہ بوٹا ہے گملے کا
ہمارے حضرتِ شیخِ مہذب کی ذہانت ہے — خدا اس میں چمک دے یہ بھی اک طرّہ ہے شملے[2] کا

یہی غنیمت ہے کہ کھلنے کو مل رہا ہے

سچ ہے اُنہوں نے ملک لے رکھا ہے — ہم لوگوں سے کمپ[3] کو پرے رکھا ہے
لیکن ہے ادائے شکر ہم پہ لازم — کھانے بھر کو ہمیں بھی دے رکھا ہے

---

[1] یہ اشعار مسلمانوں کے اس ڈپوٹیشن یا نمائندہ وفد کے متعلق ہیں جو شملہ ڈپوٹیشن کے نام سے مشہور ہے اور جسے ۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک مرحوم لسر کردگی سر آغا خاں لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس شملہ لے کر گئے تھے اور جس نے وائسرائے سے مسلمانوں کے سیاسی اور ملازمتی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس ڈپوٹیشن کی شملہ سے واپسی کے بعد ہی مسلم لیگ کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ حضرت اکبر کے نزدیک اس ڈپوٹیشن کے شملہ لیجانے کا خیال چند با اثر متمول مسلمانوں کے دماغ میں پیدا کرایا گیا تھا۔ عام مسلمانوں کی ضروریات اس ڈپوٹیشن کے بھیجنے کی محرک نہیں ہوئی تھیں اور نہ سرکاری ملازمین کی شکایات "گلشن کا پودا اور گملے کا بوٹا نہ ہونے" کا مطلب یہی ہے کہ جس طرح زمین یا گملے میں سے پودے قدرتی اثرات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ شملہ ڈپوٹیشن عام مسلمانوں کی شکایات و ضروریات کی ایسی قدرتی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس میں مہذب لیڈران قوم کی ذہانت و اعزاز طلبی کا بہت زیادہ دخل تھا۔

[2] شملہ ہندوستان کے گرمائی دار الحکومت کا نام ہے اور شملہ پگڑی کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلم ڈیپوٹیشن کا شملہ لیجانا بھی ہمارے لیڈروں کی پگڑی کا ایک طرّہ یعنی حکومت کی نظروں میں معزز ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ [3] camp کے لفظی معنی ہیں فوجوں کی قیامگاہ۔ یہاں حکومت کے وہ مخصوص ادارے مراد ہیں جن میں ہندوستانیوں کو جگہ نہیں دی جاتی یا گورا فوجوں (باقی صفحہ ۱۸۲)

فیس اور ٹیکس کا خوف

سکۂ زر بابوئے در دھوتی زرتار داشت ۔ باوجودش نالہائے زار در اخبار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ۔ گفت مارا خوف فیس و ٹکس دریں کار داشت

چندہ اور مرد آخر بیں

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست ۔ بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

یاد دار ایں قول مولانائے روم ۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

(صفحہ ۱۸۱ کا بقیہ فٹ نوٹ)، کے کیمپ مراد ہیں، جہاں سپاہیوں کو بھی بہت اچھا راشن دیا جاتا ہے اور ہندوستانیوں سے بالکل الگ رکھا جاتا ہے۔

ؔ ترجمہ:۔ ایک بابو نے اپنی سنہری تاروں سے بنی ہوئی یعنی چمکی کی دھوتی میں ایک سونے کا سکہ رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ اخباروں میں اپنی مفلسی و ناداری کا رونا رویا کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ سونے کا سکہ موجود ہونے پر بھی تم یہ رونا کیوں روتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ فیسوں اور محصولوں کے ڈر سے ایسا کرتا ہوں۔ یعنی اس اندیشہ سے کہ جو کچھ پاس ہے کہیں وہ بھی فیسوں اور ٹیکسوں کی نذر نہ ہو جائے۔ حضرت اکبر نے یہ اشعار کسی مشہور فارسی شاعر کے ان شعروں میں تصرّف کر کے لکھے ہیں ؎

بلبلے برگ گل خوش رنگ در منقار داشت ۔ واندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست ۔ گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

ؔ ترجمہ:۔ ہر رونے کا انجام ہنسنے پر ہوتا ہے۔ ہر تقریر کا خاتمہ چندہ طلبی پر ہوتا ہے۔ مولانائے رومی کا یہ قول یاد رکھو۔ انجام پر نظر رکھنے والا آدمی خوش نصیب ہوتا ہے۔

مولانا کو مات اور مسٹر کو مساوات

عالِم بنیے تو کیجئے ماتؔ کا شوق ۔ مسٹر بنیے تو ہو مساوات کا شوق

چکر ہی میں آپ کو پھنسا رکھوں گا ۔ مجھ کو بھی ہوا ہے اب اسی بات کا شوق

زر اُن کا، زور اُن کا، علم و حکومت اُن کی

یہی فتوائے نیچر ہے کہ ہم بھی ہو رہیں اُن کے

زر اُن کا، زور اُن کا، علم اُن کا سلطنت اُن کی

ملائیں کس طرح سُر صدر پر نزلہ ہے مذہب کا

بہت اونچے سُروں میں بج رہی ہے اب تو گت اُن کی

مگر قومی اطبا دور ہی کر دیں گے یہ نزلہ

قوی اطفال کو کر دے گی آخر تربیت اُن کی

ؔ یعنی عالموں کو تو اس کا شوق ہے کہ اپنے مخالفوں کو بحث مباحثہ میں ہرائیں۔ اور مسٹروں یعنی نئے تعلیم یافتوں کو اس کا شوق ہے کہ وہ انگریزوں کے مساوی ہوں۔ وہ بھی چکر میں ہیں اور یہ بھی۔ ؔ یعنی لوگوں کا خیال ہے کہ ساری طاقتیں انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں تو تقاضائے وقت یہی ہے کہ ہم بھی اُن کے ہو جائیں۔ یعنی اپنی قسمت کو اُن کے حوالہ کر دیں۔ ؔ یعنی مقلدین مغرب تو بہت تیزی سے لامذہبی کی طرف جا رہے ہیں ہم اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ ہمارے اندر ابھی تک مذہب کا اثر موجود ہے ؔ یعنی نئے لیڈران قوم کی تربیت سے مذہب کا بچا کھچا اثر بھی بچوں کے دل سے نکل جائے گا۔ اور نئی پود تقلید مغرب میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گی۔

پریوں کا عشق اور جنات کی غلامی

تھا شوق ادائے طلب اک حسن کے ساتھ — اکبر نے جو فکر کی تو وہ بات بنی
دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں کے — پکڑی گئی اور غلام جنات بنی

محنت، ہمت، حکمت اور قسمت

حاصل ہو کچھ معاش یہ محنت کی بات ہے — لیکن سرور قلب یہ قسمت کی بات ہے
آپس کی واہ واہ لیاقت کی بات ہے — سرکار کی قبول یہ حکمت کی بات ہے
بی اے بھی پاس ہوں ملے بی بی بھی دل پسند — محنت کی ہے وہ بات یہ قسمت کی بات ہے
تہذیب مغربی میں ہے بوسے تلک معاف
اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

شیخ کا مصلے اور شاعر کی اردوئے معلے

پہلے تھا قوم میں سب کچھ مگر اب کچھ نہ رہا — کسی شاعر نے ہے واللہ یہ کیا خوب کہا
شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلے باقی — اور مرے پاس ہے اردوئے معلے باقی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قوم عیش و عیاشی میں پڑ کر حکمرانی کی صلاحیتیں کھو چکی تھی۔ انگریزوں نے اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنا غلام بنا لیا۔ یعنی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ [2] یعنی روزی تو محنت سے مل جاتی ہے مگر دلی مسرت قسمت ہی سے ملتی ہے۔
[3] انگریزی ETIQUETTE ایٹی کٹ یعنی آداب معاشرت میں بے تکلف غیر عورتوں کے بوسے لے لیتے ہیں، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس سے آگے دست درازی کرنا بد تہذیبی ہی نہیں بلکہ شرارت و بد معاشی سمجھا جاتا ہے۔

غیبت اور بدگمانی میں محبت کیسے قائم رہے

حدی قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ قائم — زمانہ دیکھ کر چلئے طریق زندگانی میں
محبت کس طرح اس قوم میں باہم رہے قائم — زمانہ صرف غیبت ڈل میں ڈوبے بدگمانی میں

نئی تحریکوں سے دنیا کی بے چینی

ان تحریکوں سے یوں رہتی ہے دنیا بے چین — جس طرح پیٹ میں بیمار کے بائی دوڑے
ممبری کے لئے لپکا مری جانب وہ غول — گائے موٹی نظر آئی تو قصائی دوڑے

قوم کو قوت کی ضرورت ہے فربہی کی نہیں

ملتا نہیں گھی تو خشک روٹی ہی سہی — نعمت جو بڑی نہیں چھوٹی ہی سہی
میں قوم کی فربہی کا مشتاق نہیں — بس چاہئے میری عقل موٹی ہی سہی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ قومی فلاح و بہبود میں رفتار زمانہ کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور قومی زندگی کو اسی رخ پر چلنا پڑتا ہے جس رخ پر کہ زمانہ چلتا ہے۔ اس لئے کسی قومی شاہ راہ عمل کے متعین کرنے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ زمانہ کا رنگ کیا ہے۔ مثلاً اس زمانہ میں جبکہ غیبت و بدگمانی کا مرض عام ہے یہ امید رکھنا کہ افراد قوم میں محبت و یگانگت قائم ہو جائیگی اور اس امید پر کوئی قومی لائحہ عمل تجویز کرنا محض بے نتیجہ و بے سود ثابت ہوگا۔ [2] یعنی جس طرح موٹی گایوں کے حاصل کرنے کے لئے قصائی دوڑا کرتے ہیں اور حاصل کرنے کے بعد پھر اُن ہی گایوں کو ذبح کر کے اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح امیدواران ممبری پہلے تو ان لوگوں کی جن سے ووٹ لینے ہوتے ہیں ہر طرح کی خوشامد کر کے ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں اور ممبر ہو جانے کے بعد ان ہی رائے دہندوں کے گلوں پر چھری پھیرتے اور اپنے فائدہ کے لئے ان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ [3] فربہی ایسے مٹاپے کو کہتے ہیں جو چربی کی زیادتی کی وجہ سے ہوا اور جس سے بدن کی قوت گھٹتی ہیں کمی آ جائے ایسا مٹاپا کبھی زندگی کے لئے مفید نہیں ہوتا اور اس سے عمر بھی کم ہو جاتی ہے۔ قوم کی فربہی سے مراد قوم کی ایسی ظاہری ترقیاں ہیں جن سے قومی زندگی میں کمزوری پیدا ہو۔ [4] عقل موٹی ہونا یعنی کم عقل و کم فہم ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ اسے میری کم عقلی پر محمول کیا جائے مگر میری رائے یہی ہے کہ قوم کا فربہ ہونا یعنی محض اسباب عیش و راحت کے حاصل ہو جانے کو قومی ترقی سمجھنا اچھا نہیں ہے۔ موٹی عقل کی کمزوری کو سب مانتے ہیں مگر یہ قوم کا کمزوری کے دعوے کے ساتھ طنزاً ذکر کرنا خاص ادبی لطف اپنے اندر رکھتا ہے۔

لفظی اور بے معنی قومیت

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے — نوجوانوں کے لئے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنیٔ قومی فقط الفاظ سہی — چند احباب کا اک شغلِ دلآویز تو ہے

بے قوام کی قوم

مغالطے میں پڑے ہیں ہمارے اہلِ وطن — کہ قوم کے لئے مذہب کا کوئی کام نہیں
قوامِ قوم کا مذہب ہی ہے زمانے میں — کہاں کی قوم جب اس کا کوئی قوام نہیں

عہدوں سے قوم نہیں بنتی

دم تم میں ہے خدا ہی کی حمد و سپاس سے — دینِ خدا جدا نہ کرو اپنے پاس سے

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل کے لیڈران قوم جو اصلاح قوم اصلاح قوم کا غل مچا رہے ہیں یہ محض الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی پیش نظر نہیں ہیں یعنی ان لیڈروں کا مقصد قوم کے لئے کوئی ٹھوس کام کرنا اور قوم کو معتد بہ فائدہ پہنچانا نہیں ہے۔ البتہ یہ اصلاحی غل شور قوم کا ایک دلچسپ مشغلہ ہو گیا ہے۔ جس سے اگرچہ قوم کی بنیادیں مضبوط ہونے کی کوئی امید نہیں ہے مگر نوجوانوں میں اس سے کچھ جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔

[2] قوام مادہ مدار یا اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے قیام یعنی بننے اور قائم رہنے کا باعث ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قوم مذہب ہی کے سانچے میں ڈھلتی اور مذہب ہی کے رشتہ سے اُس کا شیرازہ بندھا رہتا ہے جب مذہب ہی نہیں رہا تو قوم کیسے بنے گی اور کیسے قائم رہے گی۔

عہدے جو سو پچاس کو اچھے ملے تو کیا — قائم نہ ہوگی قوم کبھی سو پچاس سے

قومی عزت و آسودگی کیوں کر حاصل ہو

جن بزرگوں کی طلب صادق و دیرینہ ہے — اُن کو الطافِ گورنمنٹ کا گنجینہ ہے
جن بزرگوں کو نئی راہ میں ہے سعی کا شوق — قوم سے اُن کو بلا واسطہ لینے کا ہے شوق
دونوں راہوں میں ہے عزت بھی کاوش بھی ہے — موقعِ مدح بھی ہے وجہ شکایت بھی ہے
مستند دونوں ہیں ہو چال جو اعزاز کے ساتھ — دونوں رہ سکتے ہیں آسودگیٔ دنیا کے ساتھ
نہ اُچھل کود کا حاصل نہ تملق کا اثر — بجز اس کے کہ گھٹو زور ہیں باہم لڑ کر
خوب ہے وہ جو قناعت کی طرف سالک ہے — کس مپرسی ہے تو ہو اس کا خدا مالک ہے
امرِ طاعت ہی ہے اللہ کے پیاروں کے لئے — ماسوا اس کے جو ہے شغل ہے یاروں کیلئے
طلبِ رزق ضروری ہے تو مجبوری ہے — اس سے آگے ہے جو کچھ اس سے مجھے دوری ہے

[1] یعنی سو پچاس آدمیوں کو عہدے مل جانے سے تو قوم قائم نہیں رہ سکتی۔

[2] یعنی سچے خیر خواہان حکومت کو حکومت کی عنایتوں سے فائدہ پہنچتا ہے [3] یعنی جن لوگوں نے قومی لیڈری کا راستہ اختیار کیا ہے اُن کو قوم سے چندے ملتے ہیں [4] اُچھل کود سے مراد قومی لیڈری ہے اور تملق سے انگریزوں کی خوشامد مطلب یہ ہے کہ قومی لیڈری ہو یا انگریزوں کی خیر خواہی دونوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی مخالفتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور آپس میں لڑنے سے قومی قوت کمزور ہوتی ہے۔ [5] یعنی سب سے اچھا یہ ہے کہ آدمی عزت و دولت کی حرص و ہوس کو چھوڑ کر صبر و قناعت سے بیٹھا رہے۔ اور کوئی پرسان حال نہ بھی ہو تو خدا پر بھروسہ رکھے۔

طنزیات

ہم نشیں جب مرے ایام بھلے آئیں گے
بن بلائے[1] مرے وہ آپ چلے آئیں گے

سب کچھ خدا کا وہم و گماں ہمارا

کالج میں ہو چکا جب یہ امتحاں ہمارا
سیکھا زباں سے کہنا ہندوستاں[2] ہمارا

رتبے کو کم سمجھ کر اکبر یہ بول اُٹھے
ہندوستان کیسا سارا جہاں[3] ہمارا

لیکن یہ سب غلط ہے کہنا یہی ہے لازم
جو کچھ ہے سب خدا کا وہم[4] و گماں ہمارا

جنہیں زور نہیں اُن کا مامن گور ہے

دنیا میں ضرورت زور کی ہے اور آپ میں مطلق زور نہیں
یہ صورتِ حال سہی قائم تو امن[5] کی جا جُز گور نہیں

تاریخ ہم اپنی جانتے ہیں اور آپ کو بھی پہچانتے ہیں
کب آپ کی باتیں مانتے ہیں کچھ فہم تو ہے گو زور نہیں

اے بھائیو بابو صاحب سے کھنچنے کا نہیں ہے کوئی محل
گو نسل علاء[6] الدین میں ہو مسکن تو تمہارا غور نہیں

---

[1] یعنی جب زمانہ موافق ہوگا تو مقاصد خود بخود پورے ہو جائیں گے۔ [2] اشارہ ہے علامہ اقبالؒ کے مشہور قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزی تعلیم دلوں میں رچ جانے کے بعد ہندوستانیوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ہندوستان تو ہمارا ہے، اس پر غیروں کی حکومت کیوں ہے۔ [3] حضرت اقبالؒ کا ایک اور مشہور اسلامی ترانہ ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎ چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان بلند کی پرواز خیال نے اور ترقی کی وہ ہندوستان ہی کو نہیں سارے جہان کو اپنا بنانے لگے۔ [4] حضرت اکبر کے نزدیک نہ تو یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہندوستان ہمارا، اور نہ یہ کہنا ٹھیک کہ سارا جہاں ہمارا، بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ سب کچھ خدا کا ہے یہ محض ہمارا وہم و گمان ہے کہ یہ تیرا ہے اور وہ ہمارا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مذکورہ ترانوں میں بھی ہندوستان ہمارا، اور سارا جہاں ہمارا، ان معنوں میں نہیں کہا گیا ہے کہ ہم ہندوستان کے یا سارے جہان کے مالک ہیں بلکہ علامہ ممدوح نے ہمارا کا لفظ اسی قومی یا مذہبی تعلق کی بنا پر لکھا ہے جو ہندوستانیوں کو ہندوستان اور مسلمانوں کو رحمۃ اللعالمین کی امت ہونے کی حیثیت سے سارے جہان کے ساتھ ہے۔ [5] مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں مگر وہ ہمیشہ تکالیف و مصائب کا شکار رہتے ہیں اور ہم ان کو قبر میں پہنچے پیچھے مسیحا ہونے کے بعد ہی لقب ہوتا ہے۔ [6] علاء الدین غوری ہندوستان کا ایک بادشاہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان ان بادشاہوں کی نسل میں ہیں جو غیر ممالک سے آکے یہاں بسنے والے تھے ان کو بھی ہندوؤں سے کشیدہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ غیر ملکی بادشاہوں کی نسل میں ہیں تو ہوں، وطن تو ان کا بھی اب ہندوستان ہے۔

جس کی لاٹھی اُس کی بھینس

کیسی ترقی کیسا میل ہم سے سن لو اس کا کھیل
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس فعلن، فعلن، فعلن، فعل[1]

بیوی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

ہر ایک کو خوش کروں میں کیوں کر صاحب اپنے ہی طرف بلاتے ہیں ہر صاحب
آسایش عمر کے لئے کافی ہے بی بی راضی ہوں اور کلکٹر (یعنی حکام) صاحب

ہر مسلک میں ایک پخ

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پخ اور شیخ (مولوی) کے گھر میں پنج (پنج وقتہ) گانے کی ہے پخ
بہتر ہے یہی کہ بُت پرستی کیجے (دفعتہ) گو اس میں بھی صبح کو نہانے (غوطہ) کی ہے پخ[2]

---

[1] یہ اِن اشعار کا بحری وزن ہے، غالباً کسی سیاسی مصلحت سے مافی الضمیر کے اظہار کی بجائے وزن شعری کے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ مقصد غالباً یہ ہوگا کہ جب تک لاٹھی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے بھینس اُن ہی کی رہے گی یعنی جب تک حکومت انگریزوں کی ہے ہماری قومی قسمت کے مالک وہی رہیں گے لاکھ ہم ترقی اور اتحاد کا غل مچایا کریں۔

[2] یعنی بت پرستوں کو بھی ہر صبح پوجا پاٹ کرنے سے پہلے نہانا پڑتا ہے۔

ہوائی گولا اور اپنا چولا

ہم کیا خالی ہوائی گولا[1] چھوڑیں　　کس جوگ کے بل پر اپنا چولا چھوڑیں

حضرت نے تو چھاؤنی میں رکھی ہے دوکان　　ہم کیوں اپنا محلہ ٹولہ چھوڑیں

کوچہ

تلخ مباحث اور شوخ شکر لب

نیچری[2] وعظ مہذب کو لئے پھرتے ہیں　　شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لئے پھرتے ہیں

ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں　　ہم تو اک شوخ شکر لب کو لئے پھرتے ہیں

تعلق

---

[1] خالی ہوائی گولا چھوڑنے سے مراد ہے محض دکھانے کے لئے ایسا کام کرنا جس سے کوئی خاص نفع نہ ہو۔ جوگ کے لفظی معنی نیک ساعت کے بھی ہیں مگر جوگ کے بل پر سے مراد ہے کس بہتری کی امید میں۔ چولا چھوڑنا قالب بدلنے یا ایک جون سے دوسری جون میں آنے کو کہتے ہیں چھاؤنی میں دوکان رکھنے سے مراد ہے کوئی ایسا کاروبار کرنا جس کا تعلق انگریزوں کی فوج سے ہو۔ محلہ ٹولہ چھوڑنے سے مراد ہے دیسی طریقوں کو خیرباد کہنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نوکری یا تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں انگریزوں سے تعلق رکھتے یا اُن کے ساتھ رہنے سہنے پر مجبور ہیں وہ اگر اپنے معاشی مفاد کے لئے ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ لیکن جن کا کوئی ایسا مفاد انگریزوں سے وابستہ نہیں ہے وہ خواہ مخواہ اپنے دیسی طریقے چھوڑ کر انگریزی بود و باش کیوں اختیار کریں۔ [2] نیچری سے مراد پیروان سر سید احمد خاں مرحوم اور نئی تہذیب کے لیڈران ہیں۔ چونکہ یہ حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں خدا کی جگہ اکثر نیچر (بمعنی فطرت و قدرت) کے لفظ کا استعمال کیا کرتے تھے اس لئے پُرانے خیال کے مولوی اُن کو تضحیکاً نیچری کہنے لگے۔ وعظ مہذب سے مراد ہے نئی تہذیب، اصلاح و ترقی کا وعظ۔

(باقی صفحہ ۱۹۳ پر)

اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں

ما[1] شاء اللہ وہ ڈنر کھاتے ہیں　　بنگالی بھائی ان کا سر کھاتے ہیں

بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکبر　　اُن کی گاتے ہیں اپنے گھر کھاتے ہیں

نہ معشوق، نہ صندوق، نہ بندوق

لذت[2] چاہو تو وصل معشوق کہاں　　شوکت چاہو تو زر کا صندوق کہاں

کہتا ہے یہ دل کہ خودکشی کی ٹھیرے　　خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں

صفحہ ۱۹۲ کا بقیہ فٹ نوٹ۔ شوخ شکر لب کے لفظی معنی ہیں شیریں دہن معشوقہ یہاں اس سے نئی روشنی کی دل چسپیاں اور آزادیاں مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی روشنی کی دل چسپیوں میں پڑ گئے ہیں ان کو نہ تو مولویوں کے مذہبی وعظوں سے کوئی لگاؤ رہ گیا ہے اور نہ نئے لیڈروں کے اصلاح و ترقی کے لکچروں سے۔ وہ تو بس نئی روشنی کی شیریں لب معشوقہ کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہیں اور کڑوی نصیحتیں سننا نہیں چاہتے۔

[1] ماشاء اللہ کلمہ تحسین ہے جو کسی اچھی چیز کو دیکھتے یا محسوس کرنے کے وقت بولا جاتا ہے۔ اور کبھی طنزاً کسی چیز یا بات کے معیوب پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے بھی۔ یہاں اسے طنزاً استعمال کیا گیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف شورش سب سے زیادہ بنگالیوں نے کی تھی اور بنگالیوں کی بم بازی سے انگریزوں کو بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ مزے میں وہ لوگ ہیں جو نہ تو خطابات و اعزازات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی خوشامد میں لگے رہتے اور ان کے ساتھ دعوتیں اڑاتے ہیں اور نہ بنگالیوں کی طرح اپنی باغیانہ حرکتوں سے انگریزوں کو پریشان کرتے ہیں بلکہ جو خدا نے ان کو دیا ہے وہ اپنے گھر بیٹھ کر کھا لیتے ہیں اور مصلحتاً انگریزوں کی تعریف بھی کر دیا کرتے ہیں۔ [2] مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے کسی مقصد کو بھی پورا کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں ہے یہاں تک کہ عالم مایوسی میں خودکشی کرنے کا بھی۔ اس لئے کہ بندوق اور ریوالور کا لائسنس بھی نہیں ملتا۔

خُدا کے تین ٹکڑے کر دینے والے

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں — جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

نئی روشنی کے چندا ماموں

چندوں ہی کے سوجھتے ہیں اُن کو مضموں — دل شاد ہوا اس سے قوم یا ہو محزوں
لڑکے انہیں دیکھ کر مچاتے ہیں دھوم — یہ ہیں نئی روشنی کے چندا ماموں

لاحول کے انگریزی ترجمے کی ضرورت

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں — اور تیرے بیان کی دلآویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

ؔلہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے ایک خدا کے تین خدا بنا دیئے ہیں یعنی باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) روح القدس (حضرت مریم) ؔعہ چندا ماموں بچے چاند کو کہتے ہیں۔ یعنی پہلے زمانہ کے ماموں تو بچوں کو روپے پیسے دیا کیا کرتے تھے اور نئی روشنی کے ماموں بچوں سے چندے لیتے ہیں۔ اس لئے نئی روشنی کے ماموں سچ مچ کے چندا ماموں ہیں۔ ؔتہ شیطان کو بھگانے یعنی شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لئے مسلمان لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا کرتے ہیں جس کا ترجمہ ہے "سوائے خدا کے کسی میں زور و طاقت نہیں ہے"۔ لاحول سے شیطان کو بھگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شیطان لاحول کے الفاظ سے ڈر جاتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب کسی شیطانی وسوسہ کے دور کرنے کے لئے (باقی صفحہ ١٩٥ پر)

طعنے اور گالیاں سننے کی بجائے قوالی سنو

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالیؔ سنو — باہنر ہو کر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہم کو تو پیر طریقت نے یہی دی ہے صلاح — قصۂ منصورؔ دیکھو اور قوالی سنو

روٹی نہ ملی تو کیا کریں گے

اُٹھا تو تھا ولولہ یہ دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے — معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے
کہاں کے قبلہ کہاں کے قبلی جنیدؔ کیسے کہاں کے شبلی — عوض تصوف کے ہم نے طلب لی نہیں گے پیر جی مزا کریں گے

(صفحہ ١٩٤ کا بقیہ فٹ نوٹ) مسلمان کی زبان سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے الفاظ نکلتے ہیں تو ساتھ ہی اس کے دل میں ان الفاظ کا یہ مفہوم بھی اُبھرتا ہے کہ خدا کے سوا کسی میں اتنی قدرت و طاقت نہیں ہے کہ انسان کو کسی او پر چلا سکے۔ اور اس مفہوم کے دل نشین ہوتے ہی شیطانی وسوسہ دور ہو جاتا ہے اور شیطان یہ سمجھ کر کہ لاحول پڑھنے والے پر اب میرا داؤں نہیں چلے گا بھاگ جاتا ہے اس لئے لاحول پڑھنے کا مقصد جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو لیکن ہندوستان کے بعض مسلمانوں پر انگریزیت اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ نہ تو عربی لاحول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کے اردو ترجمہ کو اس لئے اُن کا لاحول پڑھنا بیکار ہے جب تک کہ لاحول کے انگریزی ترجمہ سے اس کا مفہوم ان کے ذہن نشین نہ کرا دیا جائے۔ یعنی ایسے انگریزی دانوں کے واسطے شیطان کو بھگانے کے لئے لاحول کے انگریزی ترجمہ کی ضرورت ہے ؔلہ حالی تخلص ہے مسلمانوں کے مشہور قومی شاعر مع الفارم شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی مرحوم کا (وفات ١٩١٤ء) جو مرزا غالب کے شاگرد اور سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کے رفقاء خاص میں سے تھے اور جن کی اصلاحی نظم مسدس حالی بہت مشہور ہے۔ جس میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور اُن کی موجودہ قومی خرابیوں کمزوریوں اور بے ہنریوں کا نہایت مؤثر و عبرت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ؔعہ منصور یعنی شیخ حسین منصور حلاج جو خلیفہ مقتدر کے زمانہ یعنی ٣٠٩ھ میں ایک مشہور صوفی مجذوب بزرگ گزرے ہیں جن کو انا الحق (میں خدا ہوں) کہنے کی پاداش میں علماء شریعت کے فتوے کی بنا پر سولی دیدی گئی تھی۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ زمانہ ایسا نازک ہے کہ اگر بے ہنر رہا جاتا ہے تو مصلحین قوم کے طعنے سننے پڑتے ہیں اور کسی ہنر میں کمال پیدا کر کے شہرت حاصل کی جاتی ہے تو حسد کرنے والے ابنائے قوم گالیاں دیتے ہیں ایسی حالت میں (باقی صفحہ ١٩٦ پر)

دو رخی پالیسی

ہراک ریمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے | مجھ کو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے
مجھ سے کہا کہ گوزشتر ہے ترا سخن | اس سے یہ کہدیا کہ تو گوبر گنیش ہے

یہ مراقبہ ہے یا پینک

ہرچند کہ مجھ کو اعتقاد اب تک ہے | تاہم بلحاظ وقت دل میں شک ہے
بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور | کیا جانے مراقبہ ہے یا پینک ہے

(صفحہ ۱۹۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قومیات سے بے تعلق ہو کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں منصور وغیرہ اولیاء اللہ کے حالات پڑھا کریں اور قوالی سنا کریں۔ سلہ جنید۔ حضرت جنید بغدادیؒ ایک مشہور عارف باللہ صوفی باصفا تھے۔ صوفیوں کا فرقہ جنیدیہ اُن ہی کی طرف منسوب ہے۔ وفات ۹۱۰ء شبلی: حضرت ابوبکر شبلیؒ حضرت جنید بغدادی کے شاگرد اور باکمال و خدا شناس صوفی بزرگ تھے (وفات ۹۴۶ء) قبلہ کلمۂ تعظیم ہے۔ قبلی تصغیر ہے قبلہ کی جسے تابع مہمل کے طور پر شبلی کے ہموزن ہونے کی رعایت سے گھڑ لیا گیا ہے۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ دل میں جوش تو یہ پیدا ہوا تھا کہ حضرت جنیدؒ اور شبلیؒ کی طرح سارے علائق دنیوی سے منہ موڑ کر یاد خدا کیا کریں گے۔ مگر چونکہ یہ جوش سچی خدا پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں تھا اس لئے فوراً ہی پیٹ کا خیال آ گیا اور اس سوچ میں پڑ گئے کہ اگر دنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے اور کھانے کو نہ ملا تو کیا کریں گے۔ پیٹ کا خیال آتے ہی یاد خدا کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اور ہم نے جنید و شبلی کی پیروی میں صوفی بننے کی بجائے طب پڑھنی شروع کر دی۔ اور طبیب و جراح بننے کی دل میں ٹھان لی۔ تاکہ پیسے بھی خوب کمائیں اور عزت بھی۔

سلہ وسلہ گوزشتر (یعنی لفظی اونٹ کی ریاح) سے مراد ہے بیہودہ اور بادہوائی بات۔ گوبر گنیش (یعنی لفظی گوبر کا بنا ہوا گنیش کا بت) سے مراد ہے نہایت بدصورت، بے ڈول۔ موٹا بھینسہ۔ کاہل۔ کند ذہن۔ مطلب یہ ہے کہ انگریز ہندو مسلمانوں کے متعلق جو فقرے کستے ہیں وہ بچھو کے ڈنک کی طرح دونوں کے دلوں میں چبھتے اور تکلیف دیتے ہیں۔ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمہاری باتیں گوزشتر یعنی بیہودہ بکواس ہیں اور ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ تم گوبر گنیش ہو یعنی نہایت بھدے اور بے وقوف سلہ مطلب یہ ہے کہ زمانہ ایسی ریاکاری اور ضعیف الاعتقادی کا آ گیا ہے کہ معتقد مریدوں کو بھی پیروں کے مراقبہ یعنی دھیان و گیان پر شبہ ہونے لگا ہے کہ آیا وہ دراصل مراقبہ ہی میں ہیں یا افیم وغیرہ کے کسی نشہ کی اونگھ یا غنودگی میں۔

کلیسا کا چونا

مسٹر بی کل نے مجھ کو پیسا ہے | میرا چونا ہے اور کلیسا ہے
آپ ہی گا کے جھوم لیتے ہیں | باربد ہے نہ اب نکیسا ہے

چندے کے پھندے

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا | اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا
گلچیں ہے ہر اک نہیں ہے بلبل کوئی | اس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

سودائے سفر لندن

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر | بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر
سودا اس کو ہے جو سدھارا لندن | وہ دولت و جنس گھر میں جو تھی لے کر

سلہ مطلب غالباً یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے ہماری قومی و ملی خصوصیات کو ختم کر کے ہمیں بس اس قابل کر دیا ہے کہ ہم انگریزوں کے کلیساؤں کی تعمیر میں چونے کا کام دیں یعنی انگریزی قومیت و مذہب کے استحکام کا کام دیں۔ سلہ باربد اور نکیسا خسرو پرویز شاہ ایران کے دربار کے دو مشہور مطربوں کا نام تھا۔ نظامی گنجویؒ کی مثنوی شیریں خسرو میں ان کا ذکر آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حکومت و دولت تو ختم ہوئی کہ مشہور ماہران موسیقی کو نوکر رکھ کر ان کے کمالات فن سے متلذذ و مستفید ہوں۔ خود ہی گا کر جھوم لیا کرتے ہیں۔ سلہ آجکل کے لیڈروں کا نقشہ ہے کہ وہ قوم کو سبز باغ تو بہت دکھاتے ہیں لیکن سوائے چندہ وصول کرنے کے کوئی مفید خدمت قوم کی نہیں کرتے۔ قوم سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں۔ مگر قوم کی محبت دل میں نہیں رکھتے۔ سلہ مطلب یہ ہے کہ جن ہندوستانیوں کے دماغوں میں مغرب پسندی کا خبط نہیں سمایا ہے۔ وہ تو ہندوستان ہی میں رہ کر اپنے اپنے پیشوں کے ذریعے سے روزی کما رہے ہیں لیکن جن کو نئی روشنی کی ہوا لگ گئی ہے وہ اپنے گھروں کی رہی سہی پونجی کو بھی تعلیم وغیرہ کی غرض سے انگلستان جا کر برباد کر رہے ہیں۔

چلئے اجمیر شریف

اونچے ہیں رذیل اور ہیں زیر شریف — قسمت کا یہ دیکھتے ہیں اب پھیر شریف
اکبر یہ مجیب[۱] نے دی خوب صلاح — چل دیکھئے[۲] بھائی صاحب اجمیر شریف

اے - بی

حیراں ہیں اس زمانہ میں ہم جی کے کیا کریں — جائز[۳] سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجے کی ہوتی نہیں نصیب — پھر[۴] گھر میں بیٹھ کے بجز اے - بی کے کیا کریں

---

[۱] غالباً الٰہ آباد کے مشہور وکیل مولوی غلام مجتبٰے صاحب مرحوم مراد ہیں۔

[۲] یعنی جب زمانہ کا یہ حال ہے کہ سفلوں کی قدر اور شریفوں کی بے وقعتی ہو رہی ہے تو مناسب یہی ہے کہ ابنائے عصر سے کنارہ کشی کی جائے اور اجمیر شریف یعنی کسی متبرک روحانی مقام میں بیٹھ کر خدا کو یاد کیا جائے۔ [۳] مقصد یہ ہے کہ اگر جائز و ناجائز کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر انگریزوں کی تقلید اختیار بھی کر لی جائے اور اس سے ہماری زندگی کی تکلیفوں میں کوئی کمی نہ ہو تو ایسی تقلید کا کیا نتیجہ اور ایسی زندگی سے کیا فائدہ۔

[۴] مطلب یہ ہے کہ وہ اونچے درجے کی تعلیم تو ہم کو نصیب نہیں ہوتی جس سے ہم بڑے صناع اور تجار بنیں۔ جو تعلیم ہم کو دی جا رہی ہے وہ ایسی ہے کہ اگر کہیں نوکری نہ ملے تو سوائے اس کے کہ گھر بیٹھے مکھیاں مارا کریں یا بیوی سے دل بہلانے کے لئے اسے اے بی ذرا سنا کہکر بار بار بلائیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ بی اے ایک اونچی تعلیمی ڈگری ہے جس پر بڑی نوکریوں کے ملنے کا انحصار ہے اور اے بی انگریزی زبان کی الجبد کے ابتدائی دو حروف ہیں۔ اس لئے شعر کا یہ مطلب بھی لیا جا سکتا ہے کہ بی اے پاس نہ ہونے کی وجہ سے جن کو نوکری نہیں ملتی وہ ایسے ہی ہیں جیسے گھر میں بیکار بیٹھے ابھی A.B.C.D. پڑھ رہے ہوں۔ بی اے۔ اور اے بی کی صنعت تضاد کا لفظی اور معنوی لطف ظاہر ہے۔

گریۂ بے سُر

در پر مظلوم اک پڑا روتا ہے — بے چارہ بلا میں مبتلا روتا ہے
کہتا ہے وہ شوخ تال[۱] سم ٹھیک نہیں — کیا[۲] اس کی سنو کہ بے سُرا روتا ہے

ایک دوسرے کو پاجی کہنا حاجی کہنے سے بُرا ہے۔

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی — من[۳] ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ — من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

انگریز پرستوں کی آستاں بوسی

مشتاق[۴] لقا ہوں در پہ حاضر ہوں میں — منظور نہیں کہ بار خاطر ہوں میں
حضرت کو جو فرصت ملاقات نہ ہو — بوسے پر آستاں کے شاکر ہوں میں

---

[۱] تال سم - اہل موسیقی ضرب ہائے معینہ پر آواز موزوں ہونے کو تال اور آخر دزن کے ضرب کے ساتھ برابر ہونے کو سم کہتے ہیں [۲] مطلب یہ ہے کہ انگریزی دور حکومت میں مظالم و مصائب پر آہ و واویلا بھی قاعدے قانون سے کرنی پڑتی ہے جن مظلوموں کی چیخ پکار کسی قانون اور قاعدے کے ماتحت نہیں ہوتی ان کی شنوائی نہیں ہوتی [۳] یہ کسی مشہور شاعر کا ضرب المثلی مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے "میں تجھے حاجی کہوں اور تو مجھے حاجی کہہ" یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جبکہ ایک شخص دوسرے کی غلط تعریف کرے اور جس کی تعریف کی جائے وہ تعریف کرنے والے کی غلط تعریف کرے۔ مثلاً کوئی مجھے حاجی کہے اور میں اس کو حالانکہ دونوں میں سے کوئی بھی حاجی نہ ہو۔ اس طرح سے ایک دوسرے کی غلط تعریف کرنا بھی اگرچہ اخلاقاً معیوب ہے لیکن من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو" کہنے سے بہتر ہے۔ کیونکہ کسی کی غلط تعریف کرنے میں تو صرف غلط بیانی کا اخلاقی عیب ہوتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے کے (باقی صفحہ ۲۰۰ پر)

پرشاد اور مٹن دونوں تبرک

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتے ہیں حمد اور بھجن دونوں

مجھے اُلفت ہے سُنی سے بھی شیعہ سے بھی یاری ہے
اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دل کش بانکپن دونوں

مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی
تبرک ہیں مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

پنڈت اور مولوی سے گریجویٹ ہونا اچھا

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا!
دل ہونا بُرا ہے پیٹ ہونا اچھا

پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار
انساں کو گریجوایٹ ہونا اچھا

(صفحہ ۱۹۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) یا جب کہنے میں غلط بیانی بھی ہوتی ہے اور دل آزاری بھی اور فتنہ کے پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حکام رسی کے دل دادہ یہ جاننے کے باوجود کہ انگریز حاکم ان سے ملاقات نہیں کریں گے محض ان کے در دولت پر ہو آنے اور ان کی آستاں بوسی ہی کو ذریعہ مقصد برآری سمجھتے ہیں۔

ا؎ ان شعروں میں انگریزوں اور انگریزی حکومت کی نمائشی رواداری، بے تعصبی اور غیر جنبہ داری کو طنزاً بیان کیا گیا ہے کہ انگریز مسلمان، ہندو، سنی اور شیعہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنی دی ہوئی مذہبی آزادی سے ہمارے آپس میں فرقہ وارانہ لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں ان میں دلچسپیاں لیتے ہیں۔

۲؎ اسمال SMALL یعنی چھوٹا۔ گریٹ GREAT یعنی بڑا۔ دل چھوٹا ہوتا ہے اور پیٹ بڑا۔ دل کو اچھائی، برائی اور انجام کا احساس ہوتا ہے اور پیٹ صرف کھانے کو مانگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب بڑا بننا چاہتے ہیں۔ کوئی چھوٹا ہونا پسند نہیں کرتا اور سب یہ چاہتے ہیں کہ بس پیٹ بھرتا رہے۔ کوئی دل سے کام لینے، سوچنے سمجھنے اور اچھائی برائی پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ قدر صرف اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتوں کی ہے نہ پنڈتوں کی ہے نہ مولویوں کی۔ کیونکہ انگریزی تعلیم یافتہ بڑے ہوتے ہیں اور پنڈت مولوی چھوٹے۔

قومی ترقی کی شناخت

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے[1]
غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے

فلسفہ الحاد کا کر لیجیے فوراً قبول
دین کی ہو بات تو ابطال پر ٹھن جائیے

چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قرآن مجید
مذہبی محفل ہیں لیکن مثل دشمن جائیے

شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت
روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جائیے

بندہ اور بندی

دربار سلطنت میں ہے کبر و خود پسندی
مذہب میں دیکھتا ہوں جنگ اور گروہ بندی

رندی و عاشقی کا ہے شغل سب سے بہتر
لیمنڈ ہے اور وسکی بندہ ہے اور بندی

ا؎ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ پرانے خیال کے مسلمانوں کا نئی روشنی کے مسلمانوں سے ناراض ہونا بیکار ہے کیونکہ آج کل قومی ترقی کے معنی یہی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے سامنے تو شیخی جتائی جائے اور غیروں کے سامنے بھیگی بلی بن جایا جائے۔ لامذہبی کی باتوں کو فوراً اختیار کر لیا جائے اور مذہبی باتوں کی تغلیط و تردید کی جائے۔ چندہ جمع کرنے کی ضرورت ہو تو قومی جلسوں میں سچے مسلمانوں کے متاثر کرنے کے لئے ریاکاری سے قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور رو دیا جائے لیکن مذہبی وعظوں کی مجلسوں میں جا کر عیظوں کا مذاق اڑایا جائے اور مخالفوں کی طرح سے ان کے مواعظ پر نکتہ چینی کی جائے۔

۲؎ لیمنڈ Lemonade یعنی گیس سے تیار کیا ہوا لیموں کا انگریزی شربت۔ وہسکی Whisky ایک قسم کی تیز شراب جو زیادہ تر سکاٹ لینڈ میں بنتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی درباداری میں تو یہ خرابی ہے کہ اس سے شیخت و تمکنت پیدا ہوتی ہے اور مذہب سے تعصب جذبہ فرقہ بندی۔ لطف و عیش نہ اس میں ہے نہ اس میں۔ سب سے اچھا شغل آزاد منشی اور عشق و عاشقی کا ہے۔ جس میں وصل معشوق کا عیش بھی ہے (باقی صفحہ ۲۰۲ پر)

زبانِ مس پر قدرت

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا — مدت تک امتحان دیئے امتحان پر
جرمن، فرنچ، لیٹن و انگلش پہ ہے عبور — ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر
اک شوخ طبع مس نے دکھائی زباں مجھے — بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہو گے زیست کی لذت سے بے خبر
قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر

(صفحہ ۲۰۱ کا بقیہ فٹ نوٹ)

حاصل ہوتا ہے اور شراب نوشی کا لطف بھی۔ یہ اُن رند منشوں کا نقشہ ہے جو نہ دنیا کی کسی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور نہ عقبیٰ کی۔

لہ یعنی مس کے زبان نکالتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے کہ ابر میں بجلی کوندگئی ہو یا تاریک آسمان پر چاند نکل آیا ہو۔ زبان دکھانا تضحیک کے طور پر بھی ہوتا ہے یعنی کسی کے بیان کی ہنسی اُڑانے کے لئے بھی۔

ته مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں خواہ کیسے ہی امتحان پاس کر لو اور خواہ کتنی ہی زبانیں سیکھ لو لیکن اگر کوئی مس تمہاری معشوقہ ہو اس کی زبان بوسی پر تم کو مقدرت نہیں ہے تو مِسیں تمہارا مذاق اُڑاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تم زندگی کی لذتوں سے محروم ہو۔

بازمانہ بساز یعنی سایہ کی جگہ پشواز

ہوئی جو مجھ سے یہ فرمائش بُتِ طنّاز — کہ فنِ شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگا دے اس پہ کوئی مصرعِ حسین و نفیس — "زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز"
کہا یہ میں نے کہ ہے قیدِ حسن و خوبی کی — تو سن یہ شعر نشاط آور و نگاہ نواز
پہن لے سایہ مری جاں اتار کر پشواز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز

پھونک پھونک کر قدم رکھنے والوں کی کود پھاند

بلبل ہیں آج ہم چمنستان کمپ کے — پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے

سلہ سایہ۔ مغربی عورتوں کا لہنگا یا غرارہ۔ پشواز۔ لہنگے کی شکل کا ایک گھیر دار غرارہ جو ناچنے کے وقت پہنا جاتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز۔ کا مطلب ہے کہ اگر زمانہ تمہارے موافق نہ ہو تو تم زمانہ کے موافق ہو جاؤ۔ یعنی اگر تمہارا کوئی رویہ زمانہ کے خلاف ہو اور اس کی وجہ سے تم کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہو تو اس رویہ کو بدل دو اور وہی رویہ اختیار کر لو جس کی زمانہ قدر کرتا ہے۔ اس فارسی ضرب المثلی مصرع پر حضرت اکبر نے جو دلچسپ اور حسب مذاق زمانہ طنزیہ مصرع لگایا ہے وہ واقعی لفظاً اور معناً حسین یعنی نشاط آور بھی ہے اور نفیس یعنی نگاہ نواز بھی۔ اس زمانہ میں جو دلکشی اور نظر فریبی انگریزی زنانہ لباس سایہ میں ہے وہ پشواز میں نہیں ہے۔ پشواز قدرتی حسن کو چھپاتی ہے اور سایہ اس حسن کو ابھارتا ہے اور اسی لئے سایہ کی قدر زیادہ اور پشواز کی کم ہے۔ لہٰذا رفتار زمانہ کے ساتھ چلنے کی ضرورت سمجھنے والوں کو پشواز اُتار کر سایہ ہی پہننا چاہیئے۔ سه یعنی ابھی تو ہم صرف انگریزی ملازمتوں یا انگریزی چھاؤنیوں کے ٹھیکوں کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں مگر وہ وقت آنے والا ہے کہ ہم عیسائی گرجاؤں کے لیمپوں کے پروانے ہو جائیں گے۔ یعنی عیسائیت کو پسند کرنے لگیں گے۔

فکرِ بہشت کوثر و تسنیم ہو چکی — اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کے — خوگر ہوئے ہیں لیپ اسکپ کے جمپ کے

مئے گلگوں اور ریش سفید

پھرے اک مولوی صاحب جو کل دربار دہلی سے — یہ پوچھا میں نے کچھ لائے بھی تم سرکار دہلی سے
وہ بولے ہنس کے اے اکبر کہوں کیا تجھ سے حال اپنا — اسی مطلع سے بس کرتا ہوں اظہار خیال اپنا
اُدھر سرخی ہے گلگوں کی تھی انڈے کی زردی تھی — اِدھر ریش سفید اپنی تھی اور شدت سے سردی تھی

ؔ کوثر اور تسنیم بہشت (جنت) کی دو نہروں کے نام ہیں۔ یعنی آج کل بہشت کے باغات اور کوثر و تسنیم کی نہروں کی بجائے لوگوں کو شہری باغیچوں اور تفریح گاہوں کا یا پانی کے نلوں کا زیادہ فکر رہتا ہے۔ ؔ لیپ سکپ کا جمپ یہ تینوں انگریزی الفاظ ہیں JUMP OF LEAP SKIP یہ ایک قسم کی ورزش ہے جو اس طرح کی جاتی ہے کہ ایک کافی لمبی رسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیٹھ کی طرف سے جلدی سے سامنے لایا جاتا ہے اور دونوں ٹانگیں اچھال کر اس رسی کے اوپر سے اس طرح کودا جاتا ہے کہ رسی پھر پیٹھ کی طرف آ جاتی ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا محاورہ ہے یعنی نہایت آہستہ آہستہ احتیاط سے چلنا یا ڈرتے ڈرتے کوئی کام کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو بزرگ بڑی احتیاط سے چلا کرتے تھے وہ اب بچوں کی طرح رسیوں پر کود پھاند رہے ہیں یعنی جن لوگوں کی روشیں بڑی محتاط تھیں وہ بھی اب مآل اور انجام سے نڈر ہو کر زمانہ کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ؔ یعنی ۱۹۰۳ء کا دہلی دربار جو شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کی تقریب میں لارڈ کرزن وائسرائے نے منعقد کیا تھا۔ ؔ مطلب یہ ہے کہ دربار میں مزے تو ان لوگوں کے تھے جو شرابیں پی رہے اور انڈے کھا رہے تھے۔ یہاں تو سفید داڑھی کی شرم کی وجہ سے نہ شراب پی سکے نہ انڈے ہی افراط سے کھانے کو ملے سخت سردی میں اکڑتے رہے۔

مفلسی میں آٹا گیلا

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا — سادہ طبعوں کو بھی بالآخر رنگیلا کر دیا
شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا — وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا
تھا بنارس پہلے ہی سے اے صنم رس میں بھرا — چشم مس اینی نے اور اس کو رسیلا کر دیا

درگا بائی اور بی نصیبن

دل چسپ ہوائیں سوئے گلشن پہنچیں — زلفیں شملے سے تا بہ دامن پہنچیں
درگا بائی سے راجہ جی جب روٹھے — صدقے ہونے کو بی نصیبن پہنچیں

ؔ مذہب کا پیچ ڈھیلا کر دینے سے مراد ہے مذہب کی بندشوں اور مذہب کے اثر کو کمزور کر دینا۔ مفلسی میں آٹا گیلا ہو جانا محاورہ ہے جو ایسے موقعوں پر بولتے ہیں کہ تنگ دستی میں خرچ کی کوئی ضرورت نکل آئے یا ایک تکلیف کے وقت کوئی اور تکلیف برداشت کرنی پڑ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزیت نے مذہب کے اثر کو کمزور کر کے سیدھی سادی زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں میں بھی نئی روشنی کی نمود و نمائش اختیار کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔ اور کوٹ پتلون پہننے اور بنگلوں میں رہنے کا خبط ہو گیا۔ مفلس تو وہ پہلے ہی تھی اب نئے نئے خرچوں کی ضرورتیں اور بڑھ گئیں۔ ؔ مس اینی سے شادی کے بعد کی مسز اینی بیسنٹ مراد ہیں جو ایک مشہور مغربی خاتون اور ہندوستان میں مدراس کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کی روح رواں تھیں۔ مسز اینی بیسنٹ نے کافی عرصہ تک بنارس میں رہ کر ہندو مذہب کا مطالعہ کیا تھا۔ آخر عمر میں ہندوستان کو حکومت خود اختیاری دلوانے کے لئے انہوں نے ہوم رول لیگ قائم کی تھی ان کی آنکھیں رسیلی تھیں اور نام بھی اینی تھا جو عربی لفظ عینی (منسوب بہ چشم یعنی آنکھ والی) کا ہم آواز ہے۔ بنارس کے لفظ میں پہلے ہی رس موجود تھا جس اینی کی رس بھری آنکھوں اور رس بھری باتوں نے اس کے رسیلے پن کو اور بڑھا دیا۔ ؔ درگا بائی سے مراد ہندو قوم۔ راجہ جی سے مراد حکومت انگریزی اور بی نصیبن سے مراد مسلمان ہیں (حاشیہ مولانا عبدالماجد دریابادی) ان اشعار میں اشارہ مسلمانوں کے اس شملہ ڈیپوٹیشن کی طرف ہے جو سر آغا خاں کی سرکردگی میں نواب محسن الملک مرحوم لارڈ منٹو وائسرائے ہند کے پاس شملے لے کر گئے تھے اور جس کی شملہ پر بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔ دلچسپ ہواؤں سے مراد شملہ پہاڑ پر انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں کی غیر معمولی خاطر مدارات ہونے کی خبریں ہیں۔ شملہ پگڑی کے طرّہ یا اس سرے کو بھی کہتے ہیں جو سر پر اونچا اٹھا رہتا ہے اس سے مراد ہندوستان کا فیروزی علاقہ ہے۔ زلفوں سے مراد مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسنے کی انگریزوں کی حکمت عملی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوؤں کا زور کم کرنے اور ان کے بڑھتے ہوئے فتنہ کو دبانے کے لئے شملہ پر مسلمانوں کی جو غیر معمولی آؤ بھگت کی اور اس کی خبریں سارے ہندوستان میں پہنچیں تو مسلمان اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ انگریز ہندوؤں سے ناراض ہو کر مسلمانوں کے دوست ہو گئے ہیں اور وہ انگریزوں کی زلفوں کا شکار ہو کر یعنی حکومت کی اس چال کے جال میں پھنس کر انگریزوں پر صدقے قربان ہونے کے لئے تیار ہو گئے اور ان کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

پردے کا کیا ہے خود اونگا پیدا
خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا

کیا خوب کہا ہے مولوی ہدی نے
نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

شیطان کا ہتک عزت کا نوٹس

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس
بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ

آیندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر
فوراً داغوں گا اک ڈفیمیشن سوٹ

لہ خبر نہیں نواب محسن الملک مرحوم نے کس موقع پر اور کس مقصد سے کہا ہے کہ قدرت نے انسان کو ننگا پیدا کیا ہے۔ یعنی جب انسان پیدا ہوتا اور دنیا میں آتا ہے تو ننگا ہوتا ہے۔ اس کے امر واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ پیجامہ۔ تہمد۔ کرتہ اور انگرکھا وغیرہ انسانی اختراعات ہیں جن کی وجہ سے انسان کے لئے لباس کی اور بھوک کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ مگر جہاں تک ستر عورت یعنی ایسے اجزاء جسمانی کے چھپانے کا تعلق ہے جن کے بے پردہ رہنے سے دوسری جنس کی خواہشات نفسانی مشتعل ہوتی ہیں۔ ان کے چھپانے کی تحریک بھی انسانی فطرت ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اسی لئے تمام مذاہب نے اس کو ضروری قرار دیا ہے۔

سلہ داغنا یعنی توپ یا بندوق چھوڑنا مجازاً یعنی نالش یا دعوی دائر کرنا ڈیفیمیشن سوٹ DEFAMATION Suit یعنی نالش ہتک عزت۔ یعنی آبرو ریزی کے ہرجانہ کا دعوی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک دین کا غلبہ اور دینداروں کا عروج تھا شیطان کے ہتھکنڈوں اور دھوکہ بازیوں سے بچنے کے لئے لاحول کے حربے کام لیا جاتا تھا۔ یعنی یہ کہا جاتا تھا کہ سوائے خدا کے کسی میں قدرت و طاقت نہیں ہے کہ وہ خدا کے سچے پرستاروں کو ورغلا سکے۔ شیطان کے خلاف لاحول پڑھنے کا بالواسطہ اثر دلوں پر یہ ہوتا تھا کہ شیطان تو خدا کا باغی ہونے کی حیثیت سے ایک ذلیل قابل نفرت ہستی ہے وہ کیا خدا کے مقابلہ میں آ سکتا اور خدا کے بندوں کو بہکا سکتا ہے لیکن جب سے دین کمزور اور بے دینوں کا عروج ہوا ہے شیطان بھی اپنے آپ کو معزز سمجھنے لگا ہے۔ وہ اب لاحول پڑھنے کو اپنی بے عزتی تصور کرتا ہے اور لاحول سے ڈرنے کی بجائے لاحول پڑھنے والوں سے انتقام لینے کے لئے تیار ہے۔

ناول پڑھو اور پتلون و بوٹ پہنو

الا یا ایھا الطفل بجو راحت بہ ناولہا
کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون
کہ سر سید خبر دار د زراہ و رسم منزلہا

نئی روشنی کے صوفی اور واعظ

دیکھئے قوال بیچارے کا اب کیا حشر ہو
شیخ صاحب کو تو لکچر پر بھی وجد آنے لگا

کیوں کرے گا پیش ہم پر جلوہ حور بہشت
جب تھیٹر کا سماں واعظ کو تڑپانے لگا

Theatre

لہ یہ اشعار حافظ شیرازی کی مشہور غزل کے دو شعروں میں حسب حال تصرف کر کے لکھے گئے ہیں۔ حافظ کے اشعار یہ ہیں۔

الا یا ایھا الساقی ادر کاسا و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

ارے بھلے ساقی (شراب کے) جام کو گھما اور مجھ کو بھی دے۔ اس لئے کہ عشق شروع شروع میں تو آسان معلوم ہوا تھا لیکن اب اس نے بڑی مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ اگر پیر مغاں (پیر طریقت) تجھ سے کہے تو جانماز کو شراب میں رنگ لے کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کی راہ و رسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔ حضرت اکبر کے اشعار کا ترجمہ و مطلب یہ ہے۔ اے بچے ناولوں سے دل بہلایا کر اس لئے کہ قرآن شروع شروع میں تو یعنی جب تک کہ محض نام جانا تھا آسان تھا لیکن اب اس پر عمل کرنا پڑا ہے، بڑی مشکلیں پیش آ رہی ہیں اپنے پاؤں کو ڈاسن کے بوٹ اور پتلون سے آراستہ کر یعنی نئی تہذیب کے سانچہ میں ڈھل جا، کیونکہ سر سید احمد خاں ایک کہتے ہیں اور وہ قومی ترقی کی (راہ و رسم منزل) سے بے خبر نہیں ہیں۔ سلہ یعنی جب صوفیوں کو قوالی کے بجائے لکچر۔ اور واعظوں کو حوران بہشت کے جلووں کی بجائے تھیٹر کی ایکٹریسوں سے دل چسپی ہونے لگی تو اب مذہب و روحانیت کی طرف کون متوجہ ہوگا اور کون توجہ دلائے گا۔

پہلے چرخ کے رف رف اب کمسریٹ کے اونٹ

حضرت اکبر سے سن کر یہ لطیفہ بزم میں — سب ہنسے کچھ رہ گئے خون جگر کے پی کے گھونٹ
شیخ جی رف رف[1] بنے پھرتے تھے پہلے چرخ پر — چشم بد دور اب بنے ہیں آپ کمسریٹ کے اونٹ

نئی روشنی والے شب تاریک کے جگنو

کودتے[2] پھرتے ہیں یہ باغ میں ملّھو کی طرح — باغباں دبکے ہوئے بیٹھے ہیں اُلّو کی طرح
ان[3] نئی روشنی والوں سے نہیں ہے کچھ فیض — شبِ تاریک میں چمکا کریں جگنو کی طرح
آگئی[4] زلفِ بتاں زلفِ بتاں پر غالب — پیچ ہوتے تھے باہم افعی و راسو کی طرح
اکبر اس عہد میں لو صبر و تحمل سے جو کام
اس[5] سے بہتر ہے کہ غصہ کرو بابو کی طرح

[1] رف رف۔ وہ سواری جس پر رسول اللہ معراج میں براق سے اُتر کر عرش الٰہی تک تشریف لیگئے۔ کمسریٹ لفظاً انگریزی Commissariat یعنی محکمہ فراہمی غذا و ضروریات زندگی خصوصاً برائے افواج۔ مطلب یہ ہے کہ مولوی اور صوفی صاحبان پہلے تو آسمان سے باتیں کیا کرتے اور بڑے خدا رسیدہ بنتے تھے مگر اب وہ بھی کمسریٹ کے اونٹ ہو گئے یعنی انگریزی حکومت کے اثر میں آگئے اور اس کی بیگاریں بھگتنے لگے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والے دنیا میں بندروں کی طرح آزادی سے اُچھلتے پھرتے ہیں۔ اور رہنمایان قوم اُلّو کی طرح چھپے ہوئے بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے [3] یعنی یہ نئی روشنی والے اندھیری رات میں جگنو کی طرح چمکتے تو ضرور ہیں۔ یعنی اس تاریک دلی کے زمانہ میں بظاہر بڑے شاندار اور دل کش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بے مصرف و بیکار ہیں فائدہ ان سے کچھ نہیں پہنچتا۔ [4] معشوقان مغرب اور بتان نو کی زلفوں میں سانپ اور نیولے کی طرح داؤ پیچ ہوتے رہے۔ آخر کار سانپ نیولے پر غالب آگیا۔ یعنی مغربی اور ہندی معشوق دونوں نئی روشنی کے نوجوانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کرتے رہے مگر مغربی حسن نے ہندی حسن کو مغلوب کر لیا۔ [5] یعنی مسلمانوں کے لئے اس زمانہ میں مناسب نہیں ہے کہ وہ بنگالیوں کی طرح انگریزوں کے خلاف اظہار غصہ و ناراضی کریں۔ اُن کو صبر و برداشت سے کام لینا چاہیئے۔

دُنیا پر لات مارنے سے پہلے قوت تو پیدا کرو

شیخ اس درجہ اناڑی ہے جو گھوڑے پر چڑھے — باگ گردن میں رکاب آکے پھنسی ران میں ہو
لات[1] دنیا پہ نہ مارو ابھی اے حضرت شیخ — بیٹھکیں کر لو ذرا زور تو کچھ ران میں ہو

کھانے کے لئے متنجن رہنمائی کیلئے انجن

لذتِ[2] نانِ جویں تجھ کو مبارک اے شیخ — مجھ گنہگار کو ہے صرف متنجن کافی
حضرت[3] خضر ٹکٹ مجھ کو دلا دیں اکبر — رہنمائی کے لئے ہے مجھے انجن کافی

[1] لات مارنا محاورہ بھی ہے یعنی بیزار و متنفر ہونا۔ بے تعلق ہونا۔ بیٹھکیں کرنا ایک ورزش ہوتی ہے جس میں بار بار اُٹھا بیٹھا جاتا ہے اور جس سے رانوں اور ٹانگوں میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو لات مارنے یعنی دنیا سے قطع تعلق کرنے سے پہلے لات مارنے کی قوت اپنی ٹانگوں میں پیدا کر لو۔ یعنی پہلے اپنے اندر ایسی قوت اور قابلیت پیدا کر لو کہ تم قطع تعلق دنیاوی کی مشکلات و تکالیف کو برداشت کر سکو۔ ایسا نہ ہو کہ اناڑی بن کے گھوڑے پر سوار تو ہو جاؤ اور ایڑ لگاتے ہی گھوڑا ایسا دوڑے کہ اس کی لگام ہاتھ کی بجائے تمہاری گردن میں اور رکاب پنجوں کی بجائے تمہاری رانوں میں پھنس جائے اور تم بے بس ہو کر گھوڑے کے رحم و کرم پر رہو۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے مراد یہاں دنیا سے بے تعلقی کی زندگی اختیار کرنے سے ہے [2] موجودہ زمانہ کے رجحان طبع کا اظہار ہے کہ لوگ ایسا لینے سے جس سے جو کی روٹی کھانے میں لذت آئے ایسا گنہگار ہی رہنا پسند کرتے ہیں جب ان کو متنجن کھانے کو ملتا ہے [3] حضرت خضر سے مراد غالباً رہنمایان قوم ہیں۔ مطلب شعر کا غالباً یہ ہے کہ رہنمایان قوم کی امداد کی ضرورت مجھے صرف اس حد تک ہے کہ وہ میرے لئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے یا کوئی اچھی انگریزی ملازمت دلوانے کا انتظام کر دیں۔ اس کے بعد پھر مجھے اُن رہنماؤں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور میں مغربی تعلیم و تنظیم کی روشنی میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا جاؤں گا۔ جس طرح کہ آدمی کے ریل میں بیٹھ جانے کے بعد ریل کا انجن خود ہی اسے منزل مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔

نان پاؤ، خیالی پلاؤ، علی گڑھ کا بھاؤ

ہوتا ہے نفخ یوروپین نان پاؤ سے | میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ[1] سے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے | لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ[2] سے
دھمکا کے بوسے لوں گا رخ رشک ماہ[3] کا | چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے

ڈبل روٹی کھاؤ اور کلرکی کی خوشی سے پھول جاؤ

چھوڑ لٹریچر[4] کو اپنی ہسٹری کو بھول جا | شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ | کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

[1] خیالی پلاؤ پکانا ہوائی قلعے بنانے یا ایسے منصوبے سوچنے کو کہتے ہیں جو کبھی پورے نہ ہو سکیں۔ ڈبل روٹی کھانے سے نفخ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ یورپین معاشرت اختیار کرنے سے بے چینی و بے اطمینانی بڑھ جاتی ہے اور شیخت و تمکنت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ایشیا والے اگرچہ خیالی پلاؤ پکایا کرتے یعنی شیخ چلی کے سے منصوبے بنایا کرتے ہیں مگر میں ایسے خیالی پلاؤ کے کھانے ہی سے خوش ہوں کہ اس سے دل کو بے چینی تو نہیں ہوتی۔

[2] "علی گڑھ کے بھاؤ" یعنی اس شرط پر کہ جو امیدیں رہنمایان علی گڑھ یعنی سر سید وغیرہ انگریزی تعلیم و تہذیب حاصل کرنے سے متعلق دلوا رہے ہیں وہ پوری ہوں۔

[3] رشک ماہ اور چندہ کی معنوی مناسبت قابل غور ہے۔

[4] یہ نئی روشنی کے نوجوانوں کی موجودہ ذہنیت کا خاکہ ہے۔

اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور | کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
رزولیوشن[1] بد دعا کر دو پاس | کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

شب فرقت، حکومت سے فرصت

حکومت[2] سے سبک دوشی ہے حاصل | رکھو بحث ترقی کو نظر میں
غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت | رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

[1] کیڑے پڑیں، عورتوں کا محاورہ ہے یعنی گل سڑ جائیں ناکارہ و برباد ہو جائیں یہ اشعار جنگ طرابلس کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں جو ۱۹۱۳ء میں ٹرکی اور اٹلی میں ہوئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ترکی کے دشمن اٹلی سے لڑنے کے لئے نہ تو ہمارے پاس ہتھیار ہیں اور نہ طاقت۔ دعا جو کچھ کارگر ہوتی وہ بھی ہمارے دلوں سے نہیں نکلتی۔ ہمارے پاس تو اٹلی کو شکست دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ جلسوں میں بد دعا کے رزولیوشن پاس کر کے عورتوں کی طرح کوسا جائے کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جو قومیں دوسروں کی محکوم ہوتی ہیں اور ان پر حکومت کی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں اُن کا دماغ مفید باتوں کے سوچنے کی بجائے ایسی فضول بحثوں میں الجھا رہتا ہے جو بالکل بے کار و بے نتیجہ ہوتی ہیں۔ شب فرقت کی فرصت سے مراد وہ زمانہ ہے جو وصل حکومت یعنی حکومت کے حاصل ہونے کے انتظار میں گزرتا ہے۔

بسکٹ سے شیر مال اچھی

ہے طریق جدید خشک مزاج — میرے حق میں قدیم چال اچھی
گو کہ اس میں ذرا ثقالت ہے — پھر بھی بسکٹ سے شیر مال اچھی

ممبری پر جنگ سائیکل پر سواری

ملک پر تاثیر چشم ووٹ طاری ہوگئی — مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہوگئی
ہندوؤں کو کیوں نہ اب بھائی بنائیں صلح دوست — آریہ مذہب میں بھی توحید جاری ہوگئی
ممبری پر جنگ ہو اس میں گئو کا کیا قصور — ملک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہوگئی

زبان آتی ہے کان جاتا ہے

عزیزان وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس — چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے
یہ اتنی گوشمالی طفل مکتب کی نہیں اچھی — زباں آتی ہے اس کو سچ ہے لیکن کان جاتا ہے

---

۱ طریق جدید پرانی وضع کے لوگوں کو خشک مزاج یا کھرا اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تکلفات و تواضعات کو بہت کم دخل ہوتا ہے اور ضوابط وقواعد کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ انگریزی ناشتہ میں زیادہ تر بسکٹ ہوتے ہیں اور دیسی ناشتہ میں شیر مال۔ شیر مال کو بسکٹ سے زیادہ ثقیل ہونے کے باوجود پرانے لوگ اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں نئی روشنی کے بسکٹ کی طرح کرختگی اور سختی نہیں بلکہ تراوٹ اور نرمی ہوتی ہے
۲ مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی اور ان کے باہمی لڑائی جھگڑوں کی وجہ در اصل کونسلوں کے انتخابات اور ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرقہ وارانہ اشتعال انگیزیوں سے کام لینا ہے ۳ یعنی صلح پسند مسلمان ہندوؤں کو بھائی بنانے کی تائید میں جو دلیل پیش کرنے لگے ہیں کہ آریہ سماجی ہندو بھی توحید کے قائل ہیں حالانکہ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی کے بیج کو نشوونما دینے میں سب سے زیادہ دخل آریہ سماجی مذہب ہی کو ہے ۴ مطلب یہ ہے کہ جنگ تو ہندو مسلمانوں میں ہوتی ہے کونسلوں کی ممبری پر مگر ہندو امیدواران ممبری گئو رکشا کا پروپیگنڈہ کر کے خواہ مخواہ گائے کو درمیان میں لاتے اور مسلمانوں میں گائے کشی کی ضد پیدا کرتے ہیں۔ ۵ مطلب یہ ہے کہ بچوں کی گوشمالی کرنے یعنی ان کو جسمانی سزائیں دینے سے بچے زبان تو سیکھ جاتے ہیں لیکن ان میں سننے دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کو سزا کے ڈر سے زیادہ تر رٹنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور سننے سمجھنے کی قابلیت نہیں پیدا ہوتی۔ گوشمالی سے زباں آنے اور کان جانے کا لطف قابل غور ہے۔

مری ڈاڑھی سے رہتا ہے وہ بت انکار پر قائم — مگر جب دل دکھاتا ہوں تو فوراً مان جاتا ہے

آج کل کے شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں

اب کہاں دست جنوں تار گریباں اب کہاں — پائنیر ہے دشت مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کمبر ہیٹ میں ٹھیکہ دودھ کا — ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

کارونیشن ٹو مارونیشن

مفقود ہے گو کہ آج یار و نیشن — صد شکر ہوا ظہور کارونیشن
مانگو خالق سے حضرت جارج کی خیر — تم بھی ہو جاؤ گے ٹو مارونیشن

---

۱ مطلب یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے والوں کے دل بھی اخلاص و محبت کے جذبات سے خالی نہیں ہوتے۔
۲ تار یعنی تاگا جس کا مقابل پود یعنی بانا ہے۔ گریبان قمیص وغیرہ کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو گردن کو گھیرے ہوتا ہے۔ مجنوں۔ قیس عامری لیلیٰ کا مشہور عاشق جو عشق میں پاگلوں کی طرح جنگلوں میں پھرتا اور گریبان کو پھاڑ کر تار تار کر دیا کرتا تھا۔ شیریں فارس کے بادشاہ خسرو پرویز کی ملکہ تھی۔ فرہاد جسے کوہکن بھی کہتے ہیں شیریں پر عاشق ہوگیا۔ وصل کی شرط یہ ٹھیری کہ فرہاد کوہ بے ستون سے نہر کھود کر شیریں کے محل میں لائے اور اس کے ذریعہ سے دودھ محل میں پہنچائے۔ جب کام تکمیل کو پہنچ گیا تو بادشاہ نے مشہور کر دیا کہ شیریں مر گئی فرہاد اپنے سر میں تیشہ مار کر مر گیا۔ ان اشعار میں آج کل کی عاشقی اور معشوقی پر طنز کیا گیا ہے کہ آج کل کے مجنوں جنگلوں میں پھرنے اور گریبان کو تار تار کرنے کی بجائے اخبار پائنیر (انگریزی کا ایک مشہور روزنامہ) میں تار کی خبریں پڑھا کرتے ہیں اور آج کل کے شیریں اور فرہاد انگریزی حکومت کی ٹھیکہ داری کر رہے ہیں ۳ جارج یعنی شاہ جارج پنجم V GEORGE شاہ انگلستان و شہنشاہ ہندوستان جن کا دربار تاج پوشی ۱۹۱۱ء میں دہلی میں ہوا تھا اور بادشاہ اور ان کی ملکہ میری

(باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

بی نصیبن پڑھ کر بھی بی نصیبن ہی ہیں

ترقی کی تہیں ہم پر چڑھا کیں — گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں
رہیں ہر بھید کے آیا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

شیخ جی دوست بھی اور غلام بھی

کعبہ میں جلوہ گر وہی دیر میں مستتر وہی — لیتے ہیں ہم خدا کا نام کہتے ہیں رام رام بھی
بولی وہ مس کہ شیخ جی پہلے مرے حریف تھے — اب سمجھ ان کو آگئی دوست بھی ہیں غلام بھی

انگریز خوش۔ ہندو مگن ہم ڈھول میں پول

انگریز خوش ہے مالک ایمپائر ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چور ہے لمنڈ کا پھین ہے

صفحہ ۲۱۳ کا بقیہ فٹ نوٹ ملے نے خود اس میں شرکت کی تھی۔ لفظ انگریزی کارونیشن میں الفاظ کار اور نیشن کے ہونے سے حضرت اکبر نے تفاول کیا یعنی یہ اچھا شگون لیا ہے کہ شاہ جارج کے کارونیشن کے بعد ہندوستانی بھی جن پر آج قوم ہونے کا اطلاق نہیں ہوتا ایسے کاموں میں لگ جائیں گے کہ کل وہ بھی ایک قوم کہلانے لگیں گے ۱؎ مطلب یہ ہے کہ ترقی کرنے کے ولولے اور امنگیں تو بہت پیدا ہوئیں۔ مگر اُن کا نتیجہ بس یہ نکلا کہ قومی تمول اور خوش حالی تو گھٹ گئی مگر تقریریں بہت اور بڑی زوردار ہونے لگیں۔ مسلمان عورتوں نے کئی کئی سال اسکولوں میں پڑھنے کے بعد بھی بس یہ ترقی کی کہ ان کو آیا گیری یعنی کم حیثیت کی نوکریاں ملنے لگیں۔ ۲؎ مطلب یہ ہے کہ زمانہ کے اثر سے مسلمانوں کے مذہبی تعصبات بھی اب بہت کم ہو گئے ہیں ان کو بت خانہ میں خدا کا جلوہ نظر آنے لگا ہے اور وہ خدا کو رام کے نام سے بھی یاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے پہلے انگریزی تہذیب سے اُن کو دشمنی تھی اب اس تہذیب کے وہ دوست ہی نہیں بلکہ غلام ہو گئے ہیں۔ ۳؎ ڈھول میں پول، محاورہ ہے۔ ظاہری نمائش بہت، اندر کچھ نہیں۔ "خدا کا نام" محاورہ ہے یعنی کچھ نہیں۔ "بسکٹ کا چورا اور لیمنڈ کا پھین" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی تقلید تو ہم کرتے ہیں مگر ہماری مثال بسکٹ کے چورے اور لیمنڈ کے پھین کی سی ہے کہ بس دیکھنے ہی دیکھنے کو ہیں اندر کچھ نہیں۔

آب و دانے کی حکمرانی

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے — آب و دانے کی حکمرانی ہے
اک ادا سے کہا مسوں نے کم آن — تیر کی مجھ پہ آب روانی ہے

نام کے مسلمان ہونے کی برکت

مزے کا جشن تھا کل اک شراب خانے میں — کسی نے خوب یہ گایا کسی ترانے میں
خدا کے فضل سے ہم نام کے مسلماں ہیں — دگرنہ چین سے رہتے نہ اس زمانے میں

۱؎ نہ تو آٹا اب ہمارے گھروں کی چکیوں میں پستا ہے اور نہ پانی ہمارے گھروں کے کنوؤں سے نکلتا ہے۔ آٹے کے لئے آٹا پیسنے کی مشینوں کے اور پانی کے لئے نلوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ گویا آب و دانہ ہمارے قبضہ میں نہیں بلکہ ہم آب و دانہ کے قبضہ میں ہیں اور حکومت جب چاہے ہمارا آب و دانہ بند کر سکتی ہے۔ اس لئے ہم انگریزوں کے اشاروں پر ناچنے اور اُن کے ہر حکم کی بسر و چشم تعمیل کے لئے تیار رہتے ہیں۔

۲؎ یعنی اس زمانہ میں جو ہم شراب خانوں میں جشن مناتے ہیں اور چین سے رہ رہے ہیں وہ صرف اس وجہ سے کہ نام کے مسلمان ہیں اگر سچ مچ کے مسلمان ہوتے تو نہ یہ رنگ رلیاں کر سکتے اور نہ حکومت چین سے ہمیں جینے دیتی۔

مضمون رہ گیا اور جوتا چل گیا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال — بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا
بوٹ ڈاسن[1] نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا — ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اُن کو لطفِ مستی آیا، ہم بدمستی سے اُلو ہو گئے

درس[2] تھا یکساں مگر وہ تو مسیحی ہی رہے — ہم پہ مذہب کے عوض شیطاں کا قابو ہو گیا
ایک ہی بوتل سے پی ہوٹل میں دونوں نے شراب — لطفِ مستی اُن کو آیا اور تو اُلو ہو گیا

[1] ڈاسن جفت سازی کے ایک مشہور کارخانہ کے انگریز مالک کا نام ہے۔ جوتا چل گیا محاورہ ہے جس کے معنی جوتا مقبول ہو گیا، کے بھی ہیں اور آپس میں جوتی پیزار یعنی لڑائی جھگڑا ہو جانے کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ قومی ترقی کے ہمارے سارے منصوبے تو خاک میں مل گئے اور کسی میں ہم کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے سب بوئے ہوئے بیج اُگے اور بار آور ہوئے۔ یعنی انگریزوں کی اپنی تجارت کے فروغ دینے اور ہندوستانیوں میں آپس میں پھوٹ ڈلوانے کی ساری حکمت عملیاں اور چالیں کامیاب ہو گئیں۔ قومی ترقی و باہمی اتحاد کی تلقین کے مضامین کا تو کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن ڈاسن کے کارخانے کے جوتے ہندوستان میں مقبول ہو گئے اور آپس میں اب اتحاد ہونے کی بجائے ہم ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں اگرچہ ہندو مسلمانوں کو بھی تعلیم وہی دی جاتی تھی جو انگریزوں اور عیسائیوں کو مگر انگریز اور عیسائی تو اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن مسلمان مذہب سے منہ موڑ کر شیطان کے پھندے میں پھنس گئے اور دہریت کی طرف راغب ہو گئے۔ تعلیم کی شراب ایک ہی تھی۔ مگر انگریزوں نے اس شراب سے سرور کا لطف اٹھایا اور مسلمان اس کو پی کر اُلو یعنی بدمست و حواس باختہ ہو گئے۔

مغربی فانوس اور خرقۂ سالوس

روشنی سر میں اور گدازِ غم دلِ مایوس میں — شمع سا ہم جل رہے ہیں مغربی فانوس میں[1]
رد کتنا زور و ریا سے ہوں تو فرماتے ہیں وہ — آج کل برکت بڑی ہے خرقۂ سالوس میں

غزالی و رومی کی بجائے سپنسر و مِل

تل[2] کھیت میں مل جائے تو گودام میں لے جائیں — کیا فائدہ عارض پہ کسی بُت کے جو تل ہے
تنخواہ کے بل[3] سے ہمیں ہوتی ہے مسرت — اور شیخ یہ کہتا ہے کہ یہ سانپ کا بل ہے
غزالی[4] و رومی کی بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

[1] مطلب یہ ہے کہ مغربی تقلید جس کی انگریزی حکومت حفاظت و اعانت کر رہی ہے اُس کا پھل ہم کو یہ مل رہا ہے کہ ہمارے سر تو شمع کی لو کی طرح روشن ہیں یعنی بظاہر تو ہم بڑی ترقی کر رہے ہیں اور ہمارے دماغوں میں بڑے اونچے خیالات آ رہے ہیں لیکن حقیقت میں ہم شمع کی طرح پگھلتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ نمائش اور ریاکاری کے ہم دل دادہ ہو گئے ہیں اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آج کل سارے کام ریاکاری و دھوکہ بازی ہی سے چلتے ہیں۔ [2] تل کے معنی کنجد کے بھی ہیں (یعنی ایک قسم کا تخم جس سے تیل نکلتا ہے) اور خال کے بھی یعنی وہ سیاہ نقطہ جو انسان کی جلد پر ہوتا ہے اور جس کا کسی حسین کے رخسار پر ہونا شاعروں کی نظر میں اس کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی کی خالی دکھاوے کی باتوں اور بناوٹوں سے تو ہمارا کچھ بھلا ہوتا نہیں ضرورت اس کی ہے کہ ہماری مالی اور اقتصادی حالت درست ہو۔ [3] بِل انگریزی لفظ بھی ہے Bill یعنی فرد حساب قبض الوصول ہندی اور اُردو میں اس زمین یا دیوار کے سوراخ کو بھی کہتے ہیں جس میں چوہے اور سانپ وغیرہ رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی نوکری کی جو ماہانہ تنخواہ ہم کو ملتی ہے اس سے ہم کو تو خوشی ہوتی ہے۔ مگر پرانے خیال کے لوگ ہماری تنخواہ کے بل (قبض الوصول) کو سانپ کا بل بتلاتے ہیں یعنی اُن کے نزدیک تنخواہ کے لالچ میں انگریزوں کی جو نوکری کی جاتی ہے وہ ہماری تہذیب اور ہماری قومیت کے لئے مُہلک ہے۔ [4] غزالی۔ امام غزالی (محمد ابن محمد ابو حامد الغزالی وفات ۵۰۵ھ) مشہور اسلامی عالم و متکلم و فقیہ و محدث و فلسفی گزرے ہیں۔ اُن کی بہت سی تصانیف ہیں۔ جن میں احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۱۸ پر)

خالی خولی واہ واہ

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا ! پاکٹ میں یہ میں روپیہ کا نوٹ گیا
گھر پہ کھولا تو بس یہی لکھا تھا ! کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

تعلیم مغربی سے قوم کے زنانوں کا پردہ کھل گیا

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں[1] کا
پری[2] کی زلف میں اُلجھا نہ ریشِ واعظ میں دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ[3] حافظ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

(دیوان و مثنوی کا خزانہ)

(صفحہ ۲۱۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) رومی یعنی مولانا جلال الدین رومیؒ جن کی مثنوی معنوی بہت مشہور اور اسلامی تصوّف کی ایک بے نظیر کتاب ہے اور جو مشہور سالک مجذوب حضرت شمس تبریزؒ کے خاص معتقد و معتمد تھے (وفات ۶۷۲ھ) اسپنسر و ہربرٹ اسپنسر Hebert Spencer انگلستان کا ایک مشہور مصنف و فلسفی جس کی کتاب اُصول نفسیات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی داغ بیل اسی میں رکھی گئی تھی (وفات ۱۹۰۳ء) مِل (جان اسٹورٹ مل John Stuart Mill) انگلستان کے مشہور دہریہ فلسفی تھے جن کی کتاب UTILITARIANISM بہت مشہور ہے (وفات ۱۸۷۳ء) یعنی آجکل جسے دیکھو اسپنسر اور مل کے فلسفوں کا گرویدہ ہے۔ اب امام غزالی اور مولانا روم کی تصانیف پر کون عمل کرتا ہے۔

[1] زنانہ یعنی مخنث۔ ہیجڑا۔ نامرد۔ نری زنانوں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے مذہبی عقائد کمزور اور قوم پرستی محض نمائشی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جن مسلمانوں کے مذہبی عقائد کمزور تھے ان پر فلسفۂ مغربی حاوی ہو گیا اور وہ لامذہبی کی طرف مائل ہو گئے۔ [2] مطلب یہ ہے کہ موجودہ ناقص تعلیمی اور امتحان پاس کرنے کی محنتوں اور پریشانیوں کی وجہ سے آجکل بجائے اس کے کہ تعلیم سے طالب علموں کی دماغی صلاحیتیں اُبھریں اور بڑھیں وہ بالکل ہی مضمحل کر رہ جاتی ہیں نہ دماغوں میں قوت رہتی ہے نہ دلوں میں اُمنگ۔ یہاں تک کہ محبت کرنے کا جیسا فطری جذبہ بھی ماند پڑ جاتا ہے نہ خدا اور خدا پرستوں سے محبت ہوتی ہے اور نہ حسینوں اور مہ جبینوں سے۔ [3] یعنی بجائے اس کے کہ ہمارے حافظے ہماری قومی اور ملکی روایات اور کارناموں کے خزانے بنتے وہ یورپ و اہل یورپ کی تاریخ اور اُن کے کارناموں کے خزانے بن رہے ہیں۔

اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو

زر قوم سے لے کے ایسے سامان کرو جس سے کہ تمہاری بزم بن جائے بہشت
حلوے[1] مانڈے سے کام رکھو بھائی مردہ دوزخ میں جائے یا پائے بہشت

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

تجھ کو کیا کسی کی ہوا نے فدائے گل مجھ کو کیا کسی کی ادا نے فدائے قوم
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے[2] گل پکار میں چلاؤں ہائے قوم

تسبیح پر درود کے بجائے دہائی صاحب کی

ہے عجب انقلاب دنیا میں کیا کہوں بت بھائی صاحب کی

[1] اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھنا محاورہ ہے بمعنی ہر حال میں اپنا بھلا چاہنا۔ اپنی غرض اور نفع کو مقدم رکھنا۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، یہ بھی محاورہ ہے بمعنی خواہ کوئی مرے یا جیے۔ خواہ کسی کو نفع پہنچے یا نقصان آج کل کے لیڈروں کی خود غرضیوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو قوم کے نفع نقصان سے کچھ غرض اور مطلب نہیں ہے۔ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم سے چندے وصول کر کے اپنی جیبیں بھریں اور گل چھرّے اُڑائیں۔ [2] یہ شعر کسی اور مشہور شاعر کا ہے جس نے ہماری زبان میں ایک ضرب المثل کی سی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اصل شعر میں "ہائے قوم" کے بجائے "ہائے دل" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح بلبل گل کے عشق میں نالے کرتا ہے اسی طرح آج کل کے قوم پرست قوم کے عشق میں ہائے قوم ہائے قوم کرتے ہیں۔ مگر نہ گل کو بلبل سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ قوم کو آج کل کے قوم پرستوں سے۔

اب وہ تسبیح پر بجائے درود — پڑھ رہے ہیں دُھائی صاحب کی[۱]

جنّات کی خدمت، پریوں کی خوشامد

دن[۲] تو جنّات کی خدمت میں بسر ہوتا ہے — رات پریوں کی خوشامد میں گذر جاتی ہے
سلف رسپکٹ (Self-Respect) کا وقت آئے کہاں سے اکبر — دیکھ تو غور سے دنیا کو کدھر جاتی ہے

پل صراط کے لئے بائیسکل

یاروں کو فکر روزِ جزا کچھ نہیں رہی — بس کام ہے انہیں رہِ عیش و نشاط سے
کہتے ہیں حرج کیا ہے جو باریک ہے وہ پل — بائیسکل (Bicycle) پہ گزریں گے ہم پُل[۳] صراط سے

۱ یعنی تکلیف اور مصیبت میں خدا اور رسول کو یاد کرنے کی بجائے انگریزوں کے پاس فریادیں لے جاتے اور اُن کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ۲ یعنی دن کو تو انگریزوں کی نوکری کرنی پڑتی ہے۔ اور رات کو انگریز افسروں کی بیویوں کی خوشامد تاکہ افسر خوش رہیں۔ پھر ایک نوکر اور خوشامدی کے لئے عزت و خودداری کا کیا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ دنیا کا کچھ رنگ ہی بدل گیا ہے پہلے عزت و خودداری ہی سب کچھ تھی اور اب پیٹ اور انگریزوں کی خوشنودی میں سب کچھ ہے۔ ۳ پل صراط۔ اسلامی روایتوں کے مطابق دوزخ پر ایک پل ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی طرح تیز ہے۔ جس پر سے قیامت کے دن نیک اور بد سب کو گزرنا پڑے گا۔ نیکوں کے لئے یہ چوڑا ہو جائے گا اور وہ آسانی سے اُس پر سے گزر کر جنت میں پہنچ جائیں گے اور بد لوگ کٹ کٹ کر جہنم میں گر پڑیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والوں کو روزِ جزا کا کچھ فکر نہیں رہا۔ بجائے روزِ جزا کے خیال سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کے وہ پل صراط وغیرہ کی روایات کا مذاق اُڑاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پُل صراط باریک ہے تو ہوا کرے۔ ہم بائیسکل پر چڑھ کر اُسے پار کر لیں گے۔

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ

لیلیٰ[۱] نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ (coat) پہنا! — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحرِ ہستی فیشن (Fashion) کے ساتھ بہنا

شیوخ شہر اور شیوخ کیمپ

اکثر[۲] اسی ہوس میں بنے ہیں کلوخ کیمپ (camp) — اُس کے خوشا نصیب جسے ہو رسوخ کیمپ
اب شیخ شہر رہ گئے مُردوں کے واسطے — زندوں کو لے مریں گے ہمارے شیوخ کیمپ

۱ یعنی نئے فیشن کی گرویدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ معشوقوں کے انگریزی لباس اختیار کرنے میں عاشقوں کے جنون کا بھی رنگ بدل گیا ہے۔ مجنوں جو کبھی گریبان کو پارہ پارہ کر دیا کرتا اور جنگل میں جسم عریاں پھرا کرتا، اب کوٹ پتلون پہننے لگا ہے۔ معشوق اور عاشق دونوں ہی کو نیا فیشن اختیار کرنے میں زندگی کا لطف آنے لگا ہے۔ ۲ کلوخ مٹی کے کچے یا پکے ڈھیلے کو کہتے ہیں۔ کلوخ کیمپ بننے سے مراد ہے انگریزوں کی خدمت و خوشامد میں بچھ جانا اور اپنی عزت و خودداری کو بالائے طاق رکھ دینا۔ یعنی ہمارے مذہبی مقتدا اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی اس میں سمجھنے لگے ہیں کہ انگریزوں کے کیمپوں میں اُن کو رسوخ و اقتدار حاصل ہو۔ قوم بھی ایسے ہی بارسوخ مقتدایان مذہب کی عزت و وقعت کرنے لگی ہے۔ جو مذہبی لوگ انگریزوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں اُن کا کام بس یہ رہ گیا ہے کہ مُردوں کی تجہیز و تکفین کر دیا کریں۔ یعنی کوئی دنیاوی عزت ان کی باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن قوم کو جو نا عاقبت اندیش انگریزوں تک رسائی رکھنے والے شیوخ کی قدر کر رہے ہیں۔ اُن کو یہ خبر نہیں کہ یہ انگریز رس مذہبی پیشوا اپنے ساتھ ساری قوم کو لیکر ڈوبیں گے اور پُرانی روش کے مذہبی لوگ تو مُردوں کو آخری منزل تک پہنچاتے ہیں یہ نئے فیشن کے مولوی زندہ مسلمانوں کو مردہ کر دیں گے۔

رزِ ہیا زر ندارد مس کی کثرت سیم گم

ختنہ[1] قائم ہے مگر وہ مذہبی تعلیم گم ۔۔۔ مُہر ابراہیم باقی دین ابراہیم گم!

حسرتِ عشاق بازارِ جہاں میں کچھ نہ پوچھ ۔۔۔ رز[2] ہیا زر ندارد مس کی کثرت سیم گم!

شہرِ دل کے واسطے اب ان بتوں سے کیا لڑیں ۔۔۔ کر چکے ہیں بھائی صاحب ہم تو ہفت[3] اقلیم گم

جنت میں فوٹو ہو تو دوزخ میں جانے کے لئے تیار

آبرو اگر ملے جو ہے نام و نمود میں ۔۔۔ کیا حرج زندگی ہو اگر حالِ زشت میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں اُن کو عذر کچھ ۔۔۔ فوٹو[4] کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

[1] ختنہ جسے سنت اور مسلمانی بھی کہتے ہیں یعنی لڑکے کے عضو مخصوص کے زائد چمڑے کو کاٹ دینا۔ یہ طریقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نکالا تھا اور اسی وجہ سے اس کو سنت ابراہیمی کہا جاتا ہے۔ اور وہ گویا مختون (جس کا ختنہ ہوا ہو) کے دین ابراہیمی پر ہونے کی مُہر یا تصدیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری مسلمانی یعنی ملت ابراہیمی کی پیروی (کیونکہ ملت اسلام اور ملت ابراہیمی دراصل ایک ہی ہیں) محض ظاہرداری اور نام کی رہ گئی ہے اور تعلیمات اسلام سے ہم بہت دور چلے گئے اور بالکل بیگانہ ہو گئے ہیں۔ [2] رز کے معنی انگور کے ہیں۔ مگر مجازاً انگور کی شراب کو بھی کہتے ہیں جیسے دُخترِ رز کہا جاتا ہے۔ زر کے معنی ہیں سونا۔ مس فارسی میں تانبہ کو کہتے ہیں اور انگریزی میں ناکتخدا لڑکی کو۔ یعنی عشق بازوں اور عیاشوں کے سامنے اگر ناکتخدا لڑکی بھی ہو اور شراب بھی مگر اس کی جیب میں اتنے پیسے نہ ہوں کہ ان عیش کے سامانوں سے لطف اندوز ہو سکے تو اس کو بڑی حسرت ہوتی ہے۔ آج کل کے نوجوان بھی اسی حسرت کا شکار ہو رہے ہیں کہ سامانِ تعیش تو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں مگر ان کی آمدنیاں اتنی نہیں ہیں کہ ان عیش و عشرت کے سامانوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ [3] ہفت اقلیم یعنی سات ملک۔ مراد تمام دنیا سے ہے کیونکہ اس زمانہ میں جتنی دنیا معلوم تھی حکما نے اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا

(باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

اس زمانے میں خدا کا ذکر

حریفوں[1] نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۔۔۔ کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انوکھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں ۔۔۔ الم[2] تر کیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

مریدان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں ٹر ٹر پر ۔۔۔ نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب کے میانے[3] میں

حباب اور موجوں کا ساتھ

مغرب[4] نے سایہ ڈالا بتوں پر اثر کے ساتھ ۔۔۔ ساری بھی ان کی ہو گئی غائب کمر کے ساتھ

ہستی ہی تیری کیا ہے کہ ہو اُن کا ہم سفر ۔۔۔ موجوں کا لے حباب نہ دے تو اُبھر کے ساتھ

(صفحہ ۲۲۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) ہر ایک حصہ کا نام اقلیم تھا۔ یہ سات حصے حسب ذیل تھے۔ عرب۔ ایران۔ توران۔ ہند۔ چین۔ مصر۔ یونان۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو عشق و ہوس رانی میں اپنی ساری سلطنتیں گنوا بیٹھے ہیں اب محض اپنے ایک چھوٹے سے دل کے لئے ان مغربی معشوقوں سے کیا لڑیں۔ [4] مطلب یہ ہے کہ نام و نمود اور شہرت و عزت پر ہم اس قدر فریفتہ ہو رہے ہیں کہ اس کے لئے زندگی میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانے کے لئے تیار ہیں یہاں تک کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ تم دوزخ میں چلے جاؤ تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہو جائیں گے کیونکہ جنت میں فوٹو لگ جانے سے ہماری عزت و شہرت تو ہو گی۔

[1] یعنی اس زمانہ میں خدا کا ذکر کرنا بھی ایک تعزیری جرم ہو گیا ہے۔ [2] یعنی قرآن مجید کی سورۃ الفیل جس کی پہلی آیت ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس سورۃ میں طلوع اسلام سے پہلے کے اس واقعہ کا ذکر ہے جبکہ یمن کے ایک بادشاہ ابرہا نے خانۂ کعبہ کے گرا دینے کے ارادے سے ہاتھیوں کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی تھی اور خدا کی طرف سے اُس کے مقابلے کے لئے ایسے پرندے بھیجے گئے تھے جن کی چونچوں اور پنجوں میں عذاب کی کنکریاں تھیں۔ جس پر ایک کنکری لگتی وہ وہیں رہ جاتا یہاں تک کہ ابرہا کا سارا لشکر مع ہاتھیوں کے تباہ ہو گیا۔ فیل خانہ سے مراد ہے انگریزوں کی طاقتور حکومت۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی طاقتور حکومت کا مقابلہ کرنے کی جن غداروں میں قوت نہیں ہے وہ قرآن مجید کی سورۃ الم تر کیف کو پڑھ کر ابرہا کی بربادی کے واقعہ کو یاد کر رہے ہیں اور اس کے متوقع ہیں کہ خدا اپنی قدرت سے کوئی سامان انگریزوں کی بربادی کا بھی پیدا کر دے گا۔ [3] میانہ۔ ایک قسم کی سواری یا پالکی ہے جسے کہار کندھوں پر لے جایا کرتے تھے اور پہلے زمانہ میں شریف معزز لوگ شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اس پر آیا جایا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل مشائخ اور پیر تو ابھی تک اپنی پرانی

(باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

وظیفہ کی جگہ پانیر

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اورادِ سحر گاہی
وظیفہ کی جگہ پانیر یا آئی۔ ڈی۔ ٹی ہے

وظائف — صبح کے وقت کے — انگریزی نام روزنامہ — انگریزی نام روزنامہ

مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

تھا امن کسی قدر سو وہ دن بھی چلے!
ظاہر ہی کی سمت اہلِ باطن بھی چلے

مجلس پہ ہوا اضافہ، کانفرنس
مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

(صفحہ ۲۲۳ کا بقیہ نوٹ) وضع کو نبھا رہے ہیں۔ لیکن ان کے مرید نئی روشنی کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ ۲؎ سایہ کے معنی پرچھائیں کے بھی ہیں۔ اور سایہ اس لہنگے کی طرح کے لباس کو بھی کہتے ہیں جو انگریز عورتیں پہنا کرتی ہیں۔ ساری یا ساڑی ایک قسم کی لمبی دھوتی ہوتی ہے جو ٹانگوں پر لپیٹی بھی جاتی ہے اور سر پر اوڑھی بھی جاتی ہے۔ پہلے یہ پہناوا صرف ہندوؤں کا تھا مگر اب عام فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے تو نئی روش کا اثر صرف یہی ہوا تھا کہ مذہب اور قومیت کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اب اس نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ ساڑی جیسے ستر پوش لباس کو بھی عورتیں چھوڑ کر سایہ پہننے لگیں اور نیم عریاں رہنے لگی ہیں۔ ۳؎ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں تمہاری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے موجوں کے مقابلہ میں پانی کے بلبلہ کی۔ بلبلہ اگر اپنی حیثیت کو بھول کر موجوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرے گا تو کسی موج کے ایک ہی تھپیڑے سے فنا ہو کر پانی کی طرح بہہ جائے گا۔

۱؎ بڑے بڑے صنعتی شہروں میں کارخانے کے مزدوروں کو بیدار کرنے کے لئے بھونپو اور سیٹیاں بھی بجائی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے مقابلہ میں دنیاوی فرائض کے وقت پر انجام دینے کا احساس لوگوں میں بڑھتا جا رہا ہے اور علی الصباح نماز اور وظائف کی بجائے انگریزی اخبارات کا مطالعہ کیا جانے لگا ہے۔ مذہب سے روگردانی کا یہی بڑھتا ہوا رجحان سچے خدا پرستوں کے دلوں کو تکلیف دے رہا ہے اور وہ اس پر ماتم و افسوس کر رہے ہیں۔ ۲؎ مطلب یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے آنے سے اگرچہ اسلام میں بہت کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔ مگر ملک میں کچھ امن و امان ضرور ہو گیا تھا۔ مگر اب سیاسی کانفرنسیں بھی شروع ہو گئی ہیں اور ان میں اہل ظاہر یعنی صرف مولوی اور مفتی ہی نہیں بلکہ اہل باطن یعنی صوفی اور مشائخ بھی حصہ لینے لگے ہیں جس کا اثر ایک طرف تو یہ ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے ایمان بھی ڈگمگانے لگے ہیں اور خدا پر بھروسہ چھوڑ کر وہ مادی قوتوں پر بھروسہ کرنے لگے ہیں اور دوسری طرف ملک کا امن و امان بھی خطرہ میں پڑ گیا۔

نزع کے وقت یٰسین کے بجائے فوٹو

زندگی تھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے
کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہے دین ہائے

ماسٹر ہیں نزع میں لڑکوں کی شامت دیکھئے
ان کا فوٹو لیتے ہیں پڑھتے نہیں یٰسین ہائے

جاں کنی — بدنصیبی

اولڈ بوائے کے بعد اولڈ گرل

نکلا باآب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے
اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی

خواہش ہے اب یہ بعض محبانِ قوم کی
نکلے کسی طرف سے یوں ہی اولڈ گرل بھی

Gold — Old Girl

عزتیں اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ

احتمالِ فتنہ ہے ہر مجمعِ ملت کے ساتھ
گشت کرتی ہے پولیس بھی شیخ کی جنت کے ساتھ

۱؎ جاں کنی کے وقت مسلمانوں کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی جاتی ہے تاکہ مرنے والے کا دھیان خدا کی طرف رہے اُس کی جاں کنی کی مشکل آسان ہو جائے اور وہ باایمان دنیا سے رخصت ہو۔ مگر اس زمانہ میں استادوں کی جاں کنی کے وقت اُن کے شاگرد بجائے یٰسین پڑھنے کے مرنے والوں کے فوٹو لیتے ہیں تاکہ اخباروں میں چھپوائیں یا اس لئے کہ ان کے مرتے وقت کی یادگار رہے۔ زندگی تو آج کل مصیبت اور تکلیفوں میں گزر رہی ہے مرنے کے وقت مسلمان کی جان کنی کی تکلیفوں میں جو کمی ہو جایا کرتی تھی وہ بھی اب نہیں ہوتی۔ ۲؎ اولڈ بوائے Old Boy یعنی سابق طالب علم۔ یہ ایک ماہوار اردو رسالہ کا نام تھا۔ جو علی گڑھ کالج کے سابق طالب علموں میں ارتباط پیدا کرنے کے لئے بنارس سے جاری کیا گیا تھا۔ حضرت اکبر رسالہ کے نام اولڈ بوائے اور اس کے نکلنے پر تعریضاً لکھتے ہیں کہ جس طرح اولڈ بوائے نکلا ہے اسی طرح اب کہیں اولڈ گرل یعنی سابق طالبہ یا بوڑھی لڑکی کے نام کا رسالہ بھی نکلے گا۔ یا یہ کہ معمر لڑکیاں پردہ سے باہر آ جائیں گی۔ ۳؎ یعنی مسلمانوں میں فرقہ بندی کے تعصبات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ہر مذہبی مجلس میں فتنہ و فساد کا اندیشہ رہتا ہے اور امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کو بھی جلسوں میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ گویا واعظوں کی جنت کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ پولیس بھی گشت کرتی ہے۔

چھوٹ کر صحن حرم اکبر ہے محو طوف دیر | عزتیں گو اب بھی ہوتی ہیں مگر ذلت کے ساتھ[1]

ابرو کی کجی اور جی

ہم کو ابرو کی کجی نے مارا | شیخ صاحب کو جی نے مارا
خانۂ دیں ہوا القصہ تباہ | آئی آواز کہ انا للہ[2]

ممبری، لیڈری اور مسٹری

نہ ہر کہ ووٹ بیند دخت ممبری داند[3] | نہ ہر کہ بحث بیاموخت لیڈری داند
نہ ہر کہ ہیٹ بپوشید و کوٹ در بر کرد | ادائے مغربی و آئین مسٹری داند

---

[1] یعنی عزت تو آج کل بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر مذہب کو بالائے طاق رکھنے اور انگریزوں کی کوٹھیوں کا طواف کرنے کی ذلت برداشت کرنے پر

[2] مطلب یہ ہے کہ قومی رندوں کی زندگی تو عشق و عاشقی میں تباہ ہوئی اور مذہبی لوگوں کو انگریزوں نے جج، ریڈر، اعلیٰ افسر، بنا کر اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ غرض یہ کہ دین نہ دنیاداروں میں رہا نہ دین داروں میں اور دین کی بربادی و تباہی پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا جانے لگا۔

[3] ترجمہ و تشریح:۔ جو انتخابی مقابلہ میں زیادہ رائیں حاصل کر کے کسی مجلس کا ممبر بن جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ممبری جانتا ہو۔ یعنی ممبر بننے کی قابلیت بھی رکھتا ہو یعنی آجکل کے انتخابات میں کثرت رائے سے ناقابل بھی ممبر بن جاتے ہیں۔ جو بحث مباحثہ کرنا سیکھ لیتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ لیڈری کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ یعنی آج کل جو لوگ محض اس وجہ سے لیڈر بن گئے ہیں کہ وہ بحث مباحثہ اور تقریریں اچھی کر سکتے ہیں وہ سب لیڈری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ جو لوگ کوٹ پتلون پہنتے اور ہیٹ لگاتے ہیں وہ سب اہل مغرب کی خصوصیت کے حامل نہیں ہوتے اور نہ سب مسٹر (انگریزی کلمۂ تعظیم) اپنے کے آداب سے واقف ہوتے ہیں۔

ملک الموت کی زقند

تھی مرے پیش نظر وہ مس تہذیب پسند | کبھی وسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زقند | پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قبر میں بند

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد[1]
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اللہ کہیں تو واہ کہاں

بت کی سی اگر کہیں تو اللہ کہاں[2] | اللہ کا نام لیں تو یہ واہ کہاں
خاموش رہیں تو دل کو بے چینی ہو | بھاگیں تو سکت کسے ہے اور راہ کہاں

---

[1] یہ کسی مشہور فارسی شاعر کا شعر ہے جس کا ترجمہ ہے:۔ افسوس کہ پلک جھپکنے میں یار کی صحبت ختم ہو گئی۔ میں نے جی بھر کر ابھی پھول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی کہ بہار کا موسم ختم ہو گیا۔ اور پھول کمھلا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم عیش و عشرت میں پڑ کر بالکل بھول جاتے ہیں کہ موت خلاف توقع یکایک کبھی آ جایا کرتی ہے اور عیش و عشرت کو چھوڑ کر قبر کی اندھیری کوٹھری میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی غیر اللہ کو خوش کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو اللہ کو بھول جاتے ہیں اور اللہ کا نام لیتے ہیں تو واہ واہ نہیں ہوتی اور کوئی قدر و عزت نہیں کرتا۔ خاموش رہتے ہیں تو دل کو چین نہیں پڑتا اور زندگی کی اس شکل سے گھبرا کر بھاگنا چاہتے ہیں تو نہ تو اپنے اندر بھاگنے کی قوت پاتے ہیں اور نہ بھاگنے کا کوئی رستہ ملتا ہے۔ اس لئے کہ جب اللہ اور غیر اللہ دونوں سے کنارہ کش ہو گئے تو پھر کدھر جا سکتے اور کہاں رہ سکتے ہیں۔

خدارسیدہ اور گورنمنٹ رسیدہ

مرشد کی طلب میں جو میں اٹھا تو یہ بولے — اک پیرِ ڈنرؔ خوردۂ دہر سمت دویدہ
مردہ سمجھ اُن کو جو پہنچے ہوں خدا تک — مرشد ہیں وہی جو ہیں گورنمنٹ رسیدہ

مسلم ختم یونیورسٹی موجود

نغمۂ قومی کا مطرب آج کل ہے ہر بستی — تال ہے ذکر ترقی سمؔ ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دلوں سے اُن کے یونہیں گر مٹی — مسلم اُٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی
ہے ضروری لیڈروں میں غیرتِ تقویٰ و دیں — خود جواں ہیں نقص ہو تو ہے یہ اکبر اک پٹی!

ے ڈنر - DINNER - رات کی دعوتِ طعام۔ پیرِ ڈنر خوردۂ دہر سمت دویدہ سے وہ لیڈرانِ قوم مراد ہیں جو انگریزوں کے ساتھ دعوتیں اُڑاتے اور مرکزِ قومیت پر قائم رہنے کی بجائے حسبِ موقع و ضرورت ہر طرف دوڑتے یعنی پالیسیاں بدلتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں اور زمانہ شناس لیڈروں کا یہ کہنا ہے کہ آج کل مرشد یعنی ہادی و رہنما وہی ہو سکتے ہیں جو حکومت میں رسوخ رکھتے ہیں اور جو لوگ خدارسیدہ ہیں وہ تو زندہ نہیں مردہ ہیں کیونکہ مرنے کے بعد ہی آدمی خدا تک پہنچا کرتا ہے۔ ایسے مردہ مرشد، مرشد بنانے کے لائق نہیں ہیں۔

ے تال اور سم موسیقی کی اصطلاحیں ہیں۔ سم پر تالوں کا ایک وزن ختم ہوتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ اشعار اس زمانہ کے ہیں جب مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل ہر شہر میں ایک ہی قومی نغمہ گایا جا رہا ہے جس کی ابتدا ہوتی ہے ترقی قومی کی ضرورت سے اور تان ٹوٹتی ہے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی ضرورت پر۔ حضرت اکبر کو اندیشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے دلوں سے دین کی محبت مٹتی رہی تو یونیورسٹی (دارالعلوم) تو قائم ہو جائے گی۔ مگر وہ مسلم یونیورسٹی نہیں بلکہ صرف یونیورسٹی ہو گی کیونکہ مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ جو مسلمان لیڈر مسلم یونیورسٹی بنا رہے ہیں خود اُن میں نہ دینداری ہے نہ پرہیزگاری۔

گاندھی جی اور اُن کی تحریکیں

گاندھی اور انگریز کی لڑائی

مانا کہ رشی ہو تم، اور اچھا دل ہے — فطرت[1] کی طرف سے مغربی عاقل ہے
بھائی گاندھی سے کوئی کہہ دے کہ جناب — انگریز سے جیتنا بہت مشکل ہے

گاندھی جی سے شیخ جی کا میل

اس وقت شیخ جی کو گاندھی سے میل سوجھا — صاحب نے روگ چاہی ان کو بھی کھیل سوجھا
دونوں نے آخر اپنی اپنی نکاس[2] دیکھی — اسکیم[3] اِن کو سوجھی اور اُن کو جیل سوجھا

گاندھی جی اور ہوم رول کی چاٹ

بجا ہے شہد کی مکھی کو ہے جو پھول کی چاٹ — عبث ہے ہم کو مگر شورش فضول کی چاٹ
خبر نہیں تھی کہ گاندھی کو لے اُڑیں گے شیخ — جناب خوش نہ ہوئے دے کے ہوم رول[4] کی چاٹ

---

[1] یعنی فطرتاً بڑا چالاک اور عقلمند ہے جسے فطرتی کہتے ہیں۔ [2] نکاس = راہ مفر۔ بچاؤ۔ چھٹکارا۔ [3] سکیم لفظ انگریزی Scheme بمعنی منصوبہ۔ تدبیر۔ حکمت عملی۔ یعنی انگریزوں نے حکمت عملی سے کام لینا شروع کیا اور پیروانِ گاندھی سول نافرمانی کی تحریک میں جیل جانے لگے۔ [4] چاٹ کے معنی ہیں چسکا۔ لپکا۔ لت۔ اور چاٹ کسی ایسی مزیدار اور چٹ پٹی چیز کو بھی کہتے ہیں جو محض منھ کا ذائقہ بدلنے اور زبان کی تواضع کے لئے کھائی جائے۔ ہوم رول = Home Rule کے لفظی معنی ہیں گھر کی حکومت یعنی حکومت خود اختیاری۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو حکومتی اختیارات اسی امید پر دئے تھے کہ اگرچہ باگ ڈور حکومت کی انگریزوں ہی کے ہاتھ میں رہے گی مگر ہندوستانی ہوم رول کی اس چاٹ یعنی ایک ظاہری مزے دار چیز سے بالفعل مطمئن ہو جائیں گے اور کچھ روز کے بعد جب اختیارات کی تقسیم پر ہندو مسلمان آپس میں لڑنے لگیں گے تو انگریزوں کو حکومتی اختیارات کے ہندوستانیوں سے واپس لینے کا پھر ایک بہانہ مل جائے گا۔ مگر انگریزوں کی توقعات کے خلاف گاندھی جی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے اور مسلمان اُن کے پھندے میں آ کر یہ نہ سمجھے کہ ہوم رول کے شہد سے فائدہ تو شہد کی مکھیوں یعنی ہندوؤں کو پہنچے گا۔ مسلمان تو صرف صدقہ کا بکرا بنیں گے اور اُن کی قربانیاں بے سود ثابت ہوں گی۔

تحریک سودیشی

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوت شجرِ ملک کی بُن میں

تحریکِ سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبرؔ
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس[1] کی دُھن میں

صاحب حفاظت کریں اور ہم حکومت

کالج ہی نے بتائی نیگوں کو یہ تعلّی
صاحب ہی نے سکھایا ہندوستاں[2] ہمارا

صاحب[3] کریں حفاظت اور ہم کریں حکومت
گاندھی سے کام نکلا یہ بے گماں ہمارا

صاحب سے لڑ بھی جانا اکثر پکڑ بھی جانا
ہے عمدہ اک تماشا یہ امتحاں[4] ہمارا

---

[1] دیس یعنی وطن اور دیس ایک راگ کا نام بھی ہے جو آدھی رات کو گایا جاتا ہے یعنی دیسی چیزوں کے استعمال اور غیر ملکی چیزوں کے بائیکاٹ کی جو تحریک سودیشی کے نام سے شروع ہوئی ہے واقعی ایسی تحریک ہے جس سے دیس اور ملک کو نفع پہنچنے کی اُمید ہے۔

[2] یعنی ہندوستانیوں میں "ہندوستان ہمارا" ہونے کا جو احساس برتری و مشیخت پیدا ہوا ہے وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تقلید ہی کا نتیجہ ہے۔

[3] یعنی گاندھی جی کی تحریکوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ ملک کی دشمنوں سے حفاظت کی ذمہ داری تو انگریزوں ہی کی رہی اور اندرونی اور حکومتی اختیارات ہم کو مل گئے لیکن ایسے اختیارات کس کام کے جو دوسرے کے رحم و کرم پر ہوں اور جن کے برقرار رکھنے کی خود ہم میں طاقت و صلاحیت نہ ہو۔

[4] یعنی انگریزوں کی قانون شکنی کرنے اور پھر گرفتار ہو کر جیل جانے کا جو سیاسی امتحان ہمارا ہو رہا ہے وہ دوسری قوموں کی نظر میں ایک دلچسپ تماشا ہے۔

قید کی تکلیف سے بزرگی کا ثبوت

اُٹھائی قید کی تکلیف گو یوسف[1] نے زنداں میں
زلیخا کو تو قائل کر دیا اپنی بزرگی کا

گورنمنٹ انتظامِ غلّہ اب کر دے سپرد ان کے
کریں یہ شیر بن کر سامنا مہنگی کی گرگی[2] کا

ترک تعاون کا تجربہ

تجربہ ترکِ[3] تعاون کا کریں یہ نونہال
گور میں جو پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں اُن کو کیا

خاتمہ بالخیر ہے اُن کا پرانے سوگ[4] پر
وہ کہاں پائیں نئے سُر اور کریں اس دُھن کو کیا

---

[1] ان اشعار میں تلمیح ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ یوسف میں ہے۔ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے ایک مشہور اور نہایت حسین و جمیل پیغمبر تھے۔ یہ بارہ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے چونکہ حضرت یعقوبؑ کو اُن سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لئے دوسرے بھائی اُن سے حسد کرتے تھے۔ ایک دن حضرت یوسف کے بھائی اُن کو کسی بہانہ سے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک کنوئیں میں ڈال دیا اور باپ سے آکر کہہ دیا کہ یوسفؑ کو بھیڑئیے نے کھا لیا۔ حضرت یوسفؑ کے کنوئیں سے نکلنے پر مصر کے ایک سوداگر نے عزیزِ مصر یعنی بادشاہ مصر کے وزیر کے ہاتھ بطور غلام انھیں بیچ ڈالا وہاں عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا حضرت یوسفؑ کے حُسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی اور اُس نے اُن سے تعلق ناجائز پیدا کرنا چاہا۔ اس خواہش میں ناکامیاب ہونے پر اُس نے عزیزِ مصر سے شکایت کر کے حضرت یوسفؑ کو قید کرا دیا۔ بادشاہِ مصر کے خواب کی صحیح تعبیر دینے پر حضرت یوسفؑ کو قید سے رہائی ملی۔ بالآخر وہ عزیزِ مصر مقرر کئے گئے۔ زلیخا سے اُن کی شادی ہو گئی۔ اور قحط کے زمانہ میں غلّہ کا انتظام اُنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

[2] گرگی منسوب بہ گرگ یعنی بھیڑیا۔ یہاں یہ لفظ حضرت یوسفؑ کے قصّہ کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے قحط اور مہنگائی اگرچہ بھیڑئیے کی طرح ہندوستانیوں کی جان لینے کے درپے ہے لیکن اگر گاندھی جی کے ہاتھ میں قحط کا انتظام دے دیا گیا تو وہ شاید شیر کی طرح قحط کے بھیڑئیے کا مقابلہ کریں اور بھیڑیا شیر کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔

[3] تحریک ترک تعاون جسے انگریزی میں نان کوآپریشن کہتے ہیں گاندھی جی کی وہ مشہور تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی سرکاری ملازمتیں اور انگریزی حکومت کی امداد و معاونت چھوڑ دیں۔

[4] مطلب یہ ہے کہ ترک تعاون کی تحریک کا تجربہ کرنا ہے تو نوجوانوں کو کرنا چاہئے جو لوگ عمر ختم کر چکے ہیں اُن کا خاتمہ بالخیر تو اس پرانے ماتم ہی پر ہونے دو کہ ہماری ساری قومی خصوصیات اور پرانی روایات فنا ہو گئیں۔ اُن کو ان نئی نئی سیاسی اور قومی تحریکوں کا سلیقہ کہاں سے آ سکتا ہے اور وہ نئے لیڈروں کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔

گاندھی جی کا سوراج اور انگریز کا پیار

کیا طلب جو سوراج[1] بھائی گاندھی نے — مچی یہ دھوم کہ ایسے خیال کی کیا بات
کمال پیار سے انگریز نے کہا اُن سے — ہمیں[2] تمھارے ہیں پھر ملک و مال کی کیا بات

حکومت پرست اور پیروانِ گاندھی

گورمنٹیوں میں بڑی عقل ہے — مگر ان میں ایکا نہیں ہے نہ جوش
جو گاندھی کے پیرو وہ اکثر اُجڈ — مگر اک امنگ اُن میں ہے اور جوش

گاندھی کیپ اور ترکی ٹوپی

ہستیِ حق[3] کا تصوّر ہے تو ہم تم اب کہاں — آفتاب آیا، نمودِ بزمِ انجم اب کہاں
شاخِ گاندھی کیپ سر پر دوستوں کے لگ گئی — وہ کُلاہِ ترک اور پھُندنے کی وہ دُم اب کہاں

[1] بمعنی حکومت خود اختیاری یا ہوم رول۔

[2] یعنی انگریزوں نے گاندھی جی کے ساتھ اپنائیت اور محبت و دوستی کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ اس چال میں پھنس جائیں اور ملک و مال یعنی سوراج کا مطالبہ چھوڑ دیں۔

[3] ہستیِ حق کے تصوّر سے مراد یہاں غالباً گاندھی جی کی وہ تحریکیں ہیں جو اُنھوں نے حق و صداقت کے نام سے جاری کی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اُسی طرح گاندھی جی کی تحریکات حمایتِ حق و صداقت کے آگے اور ساری تحریکیں ماند پڑ گئیں اور گاندھی ٹوپی کا سینگ کھڑ جانے سے ترکی ٹوپی کے پھُندنے کی دُم غائب ہو گئی یعنی گاندھی جی کی تحریک سوراج نے خلافتی تحریک کو بھی دبا لیا۔

گاندھی جی اور مالوی جی

بھائی گاندھی خود سری کی آرزو کے ساتھ ہیں — اور صاحب لوگ غربی رنگ و بُو کے ساتھ ہیں
مالوی جی سب سے بہتر ہیں مری دانست میں — یعنی[1] مندر میں ہیں اور اپنی گئو کے ساتھ ہیں

گاندھی سے لڑے کون

بُت بن گئے خود شیخ تو گاندھی سے لڑے کون — صاحب بھی ہیں خاموش تو آفت میں پڑے کون
ٹڈّو ہیں، ترقّی کے رسالے کے ہیں داغی[2] — اور ایڑ[3] بھی آنر کا ہے پھر کہیئے[4] اَڑے کون

[1] مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی تو انگریزوں کی مخالفت کی ضد پر اَڑے ہوئے ہیں اور انگریز اپنی مغربی ترکیبوں اور پالیسیوں سے کام لے رہے ہیں۔ پُرانے خیال کے مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی سب سے بہتر ہیں کہ وہ اپنے مندر اور گائے کی پُوجا یعنی پُرانے خیالات میں مگن ہیں۔

[2] داغی اُس جانور کو کہتے ہیں جس کے جسم پر جلتے ہوئے ٹھپّہ سے کوئی داغ یا نشان بنا دیا گیا ہو۔ فوجی رسالے میں جو گھوڑے بھرتی کئے جاتے تھے اُن کو پہچان کے لئے داغی کر دیا جاتا تھا۔ داغی کے معنی عیب دار کے بھی ہیں۔

[3] ایڑ بمعنی مہمیز یا ایڑی یا وہ کانٹا جو فوجی سواروں کے جوتوں کی ایڑی میں لگا ہوتا ہے اور جسے گھوڑے کے پیٹ پر پیر سے مار کر گھوڑے کو بڑھاتے اور تیز کرتے ہیں۔

[4] مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان بھی گاندھی تحریکوں کے لیڈر ہو گئے اور انگریزوں نے بھی ان تحریکوں کی کامیابی کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تو پھر ان نوجوانوں سے جو ترقی کے رسالہ کے داغی ہیں یعنی جن کے دماغوں میں ترقی کا جوش بھرا ہوا ہے اور جن کے لئے ایڑ بھی آنر کا ہے یعنی جن کو ان تحریکوں میں حصّہ لینے سے اعزاز و افتخار بھی حاصل ہونے کی امید ہے اُن سے کون لڑ سکتا اور اُن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

ہماری حالتِ نزع اور ہوم رولیوں کی وسکی

ہم نزع میں رہیں گے مرنے کا ڈر نہیں ہے ۔۔۔ بُت زہر دے رہے ہیں عیسیٰ[۱] جِلا رہے ہیں
اسلام و شرک (اچاں کنی) کو وہ خود ہی بِلا رہے ہیں ۔۔۔ دونوں (یعنی ہندو) کو ہوم رولی (یعنی سوراج کی) وِسکی[۲] (شراب) پلا رہے ہیں

گاندھی جی کا وجد اور ہماری اُچھل کود

اس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں ۔۔۔ گاندھی تو وجد[۳] میں ہیں یہ کیوں اُچھل رہے ہیں
نشوونمائے[۴] (ترقی بالیدگی) کونسل جن کو نہیں میسّر ۔۔۔ پبلک کی جے میں اُن کے مضمون پَل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں، فریاد اور دلیلیں ۔۔۔ اور کِبر (بزرگی) شۂ[۵] مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
یہ سارے کارخانے اللہ کے ہیں اکبرؔ ۔۔۔ کیا جائے[۶] (بڑائی) دَم زدن ہے، یوں ہی یہ چل رہے ہیں

۱ عیسیٰ علیہ السّلام مشہور پیغمبر جن کی اُمّت عیسائی کہلاتی ہے اور جو مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے یہاں عیسیٰ سے مراد انگریز ہیں۔
۲ مطلب یہ ہے کہ انگریز ہندو مسلمان دونوں کو ہوم رول کی شراب پلا کر مست و مدہوش رکھنا چاہتے ہیں۔ ہوم رول کے نشہ میں ہندو ایسے دیوانے ہوئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتے ہیں مگر انگریزوں کی سیاسی مصلحتیں اس کی مقتضی ہیں کہ مسلمان زندہ اور باقی رہیں تاکہ موقع دیکھ کر دونوں کو آپس میں لڑایا جا سکے۔
۳ وَجد بمعنی سرمستی۔ بے خودی۔ حال۔ وہ کیفیتِ بے خودی جو اہلِ دل پر قوّالی وغیرہ سُن کر طاری ہوتی ہے۔ یعنی مسلمانوں کے خیر خواہ یہ سوچ رہے ہیں کہ گاندھی جی کا سیاسی جوش و خروش تو اُن کے جذبۂ حبّ وطن کا نتیجہ ہے جس نے اُن کو مست و بے خود کر رکھا ہے لیکن جو مسلمان اُن کے ساتھ ہیں وہ کیوں اتنا اُچھل کود رہے ہیں حالانکہ اُن کے دِلوں میں نہ تو حبِّ وطن کا جذبہ ہے نہ حبِّ قومی کا۔ ایسی نمائشی اُچھل کود کا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔
۴ یعنی جو کونسلوں کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتے وہ پبلک جلسوں اور جلوسوں میں جے کاروں کے نعرے لگا کر اپنی شخصیت کو نمایاں کر رہے ہیں اور لیڈر بننے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔
۵ یعنی قومی جلسوں میں بھی انگریزوں کے پاس وفد لے جانے کی تجویزیں پاس کی جا رہی ہیں اور انگریزوں ہی سے اپیلیں اور فریادیں کی جا رہی ہیں جس سے انگریزوں کو اپنی طاقت کا اور زیادہ گھمنڈ ہوتا ہے۔ ۶ یعنی اعتراض کون کر سکتا یا حرفِ شکایت کون زبان پر لا سکتا ہے۔

پِٹیں خوب اور سَر نہ اُٹھائیں

ہوں مبارک حضور کو گاندھی ۔۔۔ ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو
کہ پِٹیں[۱] خوب اور سَر نہ اُٹھائیں ۔۔۔ اور کھِسک[۲] جائیں، جب کہو جس کو

چُپ چاپ گزی کے تھان بنو

ہو تیزیٔ[۳] انوار؟ کی جو ہوس، ہنگامہ کرو، توپوں سے بھُنو
گاندھی کی جو حکمت (پالیسی) خوش آئے، چُپ چاپ گزی کے تھان بُنو
صاحب (انگریز) کی رفاقت ہو جو پسند، آسام[۴] میں جا کر چائے چُنو
اکبرؔ کی جو مانو بیٹھ رہو، جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

۱ گاندھی جی کی تحریک عدمِ تشدّد Passive Resistance کی بنیاد اسی پر تھی کہ راہِ حق میں ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں خود برداشت کر لو مگر دوسروں پر تشدّد نہ کرو۔
۲ کھِسک جانا = اپنی جگہ سے ہٹ جانا۔ یہاں ملازمت وغیرہ چھوڑنے سے مراد ہے۔ یعنی جب اُن سے یہ کہا جائے کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو جاؤ تو بے حیل و حجّت مستعفی ہو جائیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ سول نافرمانی کی تحریک کو دبانے کے سلسلہ میں جو حکم حکومت کی طرف سے اُن کو دیا جائے اُس حکم کی تعمیل کریں۔ کیونکہ ایسے احکام پر عمل نہ کرنا تو تحریک سول نافرمانی کے اصول میں داخل ہے۔
۳ یعنی اگر آزادی کی منزلِ مقصود پر جلد پہنچنے کی ہوس ہے تو خوں ریز فسادات کرو اور گولیاں کھاؤ اور اگر گاندھی جی کی آہستہ خرامی کی پالیسی پسند ہے تو کھدّر پہنو اور کھدّر بُنو۔
۴ آسام ہند کے ایک صوبہ کا نام ہے جہاں انگریزوں کے چائے کے باغات بہ کثرت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انگریزوں ہی کی رفاقت پسند ہے تو اُن کی تجارتوں میں اُن کے ساتھ لگ جاؤ تاکہ انگریزی حکومت جانے کے بعد بھی تمہارا اُن کا ساتھ رہ سکے۔

صاحب کے بیرے کا ہوم رول

کہا اُن کے بیرے نے گو ہوں شریک
خیالات میں گاندھی بابا کے ساتھ
میں سمجھوں گا لیکن یہی ہوم رول
تعلق جو ہو جائے آیا[1] کے ساتھ

مُلک سے رشتہ رکھنا ہے تو چرخہ بھی کاتو

پوچھتے کیا ہو ہم سے تم فتویٰ
نہ کرو ہم پہ بابِ آفت وا[2]
اِتنا کہتے ہیں رشتہ ملک سے ہو
چرخ چرخہ بھی دے اگر کتوا

[1] آیا اُس عورت کو کہتے ہیں جو انگریزوں کے یہاں بچّوں کے کھلانے پر نوکر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گاندھی کی تحریکیں اگرچہ خواص ہی میں نہیں بلکہ عوام میں بھی مقبول ہوگئی ہیں لیکن بمصداق فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست، ہر شخص ہوم رول (حکومت خود اختیاری) کو اپنی ذاتی مقصد برآری کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی انگریز کے خانساماں کے نزدیک ہوم رول بس یہی ہے کہ اُس کی شادی اُس آیا کے ساتھ ہو جائے جو اُسی گھر میں نوکر ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد ہوم رول سے خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہم تو ہوم رول اُسے سمجھتے ہیں کہ ہم کو اپنے ذاتی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ جس کے ساتھ ہم شادی کرنا یا اتفاق پیدا کرنا چاہیں بے روک ٹوک کر سکیں۔

[2] "بابِ آفت وا نہ کرو" کے معنی ہیں مصیبت کا دَروازہ نہ کھولو۔ مطلب یہ ہے کہ گاندھی جی کی عدم تشدّد۔ سودیشی اور چرخہ کاتنے کی تحریکوں کے متعلق اسلامی اور شرعی احکام کو واضح کرنے سے حکومت بھی ناراض ہوگی اور ہندو بھی اور مسلمان مصیبت میں پڑ جائیں گے اس لئے بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ملک اور ابناءِ ملک کے ساتھ تعلّقات قائم رکھنے چاہئیں خواہ مَردوں کو چرخہ کاتنے ہی پر کیوں نہ مجبور ہونا پڑے۔ رشتہ کے معنی تعلّق کے بھی ہیں اور تاگے کے بھی۔ چرخہ کے ساتھ رشتہ کی مناسبت ظاہر ہے۔

عزیمتِ گاندھی اور جلالتِ مغرب

اِدھر عزیمتِ گاندھی کی مشرقی کو تلاش
اُدھر جلالتِ مغرب ہوا میں ہے بم[1] پاش
کہیں یہ شکوہ[2] کہ انعام میں نہاں ہے فریب
کہیں یہ غصّہ کہ شور و فغاں ہے سمع خراش
کہیں یہ طعن کہ یہ سامری[3] ہے گاؤ پرست
کہیں یہ شبہ کہ خنزیر کی یہ کھائے گا قاش
کہیں یہ رجز[4] کہ مشرک سے ارتباط عبث
کسی پہ قہر کہ غیرت ہے نذرِ فکرِ معاش

[1] بم مہنّد ہے لفظ انگریزی Bomb کا بمعنی بھک سے اُڑ جانے والا مادّہ اور بم کا گولہ۔ یعنی ایک طرف تو ہندوستانی اِس کوشش میں ہیں کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں اُن کو عزم و استقلال کے ساتھ مصائب کے برداشت کی عادت پڑے اور دوسری طرف انگریز اپنا رعب داب قائم رکھنے کے لئے اپنی ہلاکت خیز فوجی اور مادّی طاقتوں کی نمائش کر رہے ہیں۔

[2] یعنی ہندوستانی تو کہتے ہیں کہ انگریزوں کی طرف سے جو مراعات کی پیش کش کی جا رہی ہے اُس میں بھی انگریزوں کی کوئی چالبازی چھپی ہوئی ہے اور انگریزوں کو اس پر غصّہ آ رہا ہے کہ ہندوستانی اپنی احتجاجی چیخ پکار سے اُن کے کان کیوں کھائے جا رہے ہیں۔

[3] سامری موسٰی علیہ السّلام کے زمانہ میں ایک جادوگر تھا جس نے چاندی سونے کا ایک بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل سے اُس کی پرستش کرائی تھی۔ یعنی انگریز پرست مسلمان تو گاندھی جی کو اُن کی گاؤ پرستی کی وجہ سے سامری ہونے کا طعنہ دے رہے ہیں۔ اور قوم پرست انگریز پرستوں پر خنزیر خوری یعنی سور کھانے کا الزام لگا رہے ہیں۔

[4] رجز اُن اشعار کو کہتے ہیں جو لڑنے والوں میں جاں نثاری کا ولولہ اور لڑنے کا جوش پیدا کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں پڑھے جاتے ہیں۔ یعنی کہیں تو گاندھی جی کی لیڈری کے خلاف مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا جا رہا ہے کہ مشرکوں سے دوستی نہیں کی جا سکتی اور کہیں انگریزوں کے ساتھ تعاون کا رشتہ منقطع نہ کرنے والوں کے خلاف اظہارِ غصّہ و ناراضگی کیا جا رہا ہے کہ فکرِ معاش کی وجہ سے اُنھوں نے اپنی قومی و ملّی غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

کہیں[1] یہ وسوسہ بُنیادِ تخت سُست نہ ہو — کہیں یہ خطرہ کہ گرنے لگے نہ لاش پہ لاش
کہیں[2] یہ فیصلہ یہ سب ہیں ملک و قوم فروش — کہیں یہ قول کہ یہ سب ہیں رند اور اوباش
جدھر[3] اُٹھائیں نظر اُن میں ہے عیاں باہم — عناد و غیبت و توہین و کینہ و پرخاش
تغیراتِ جہاں کون روک سکتا ہے — ہر ایک پائے گا اعمالِ زشت کی پاداش
فضول رائے کے اظہار میں جو ہیں سرگرم — یہ شعرِ صائب[4] اُنھیں خاموشی سکھائے کاش

تمیزِ[5] نیک و بد روزگار کار تو نیست
چو چشم آئینہ در خوب و زشت حیراں باش

---

[1] یعنی انگریزوں کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان کی حکومت کی بنیادیں کمزور نہ ہو جائیں اور ہندوستانیوں کو یہ خطرہ ہے کہ کہیں انگریز قتل عام نہ کرنے لگیں۔

[2] یعنی کوئی لیجی ٹیشن کی مخالفت کرنے والوں کو ملک و قوم فروش بتا رہا ہے اور کوئی ایجی ٹیشن کرنے والوں کو شہدہ اور بدمعاش۔

[3] یعنی ملک کی موجودہ حالت ایسی ہے کہ کسی کو کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ سب ایک دوسرے کی غیبت و توہین کر رہے ہیں اور آپس میں کینہ و پرخاش رکھتے ہیں۔

[4] صائب تخلص ہے مشہور ایرانی شاعر مرزا محمد علی اصفہانی کا۔

[5] صائب کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے۔ زمانہ کے نیک و بد میں فرق و امتیاز کرنا تیرا کام نہیں ہے۔ آئینہ کی آنکھ کی طرح اچھائی اور بُرائی کی دید میں حیران رہ۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہونا ہے ہوگا۔ اچھوں کو اچھا اور بُروں کو بُرا بدلہ ملے گا۔ اِس لئے فضول اظہار رائے کرنے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنے سے یہ بہتر ہے کہ آدمی حیرت سے دنیا کے نیک و بد کو دیکھتا رہے اور خاموش رہے۔

تعلیمِ نسواں
و
پردۂ نسواں

مَردوں کی عقل پر پَردہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں[1] میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل[2] پہ مَردوں کی پڑ گیا

زنے از پردہ بُروں آید و کارے بکند

کس[3] نماند است کہ در بیشہ شکارے بکند
تیغ گیرد بکف و فتح دیارے بکند

ایں زماں ہمّت مَرداں بہ ہمیں محدود است
زَنے از پردہ بُروں آید و کارے بکند

---

[1] زمین میں گڑ جانا، محاورہ ہے بمعنی نہایت شرمندہ ہونا، شرم سے پانی پانی ہو جانا۔

[2] عقل پر پردہ پڑ جانا بھی محاورہ ہے بمعنی عقل کا جاتا رہنا۔ بے وقوف اور خبطی ہو جانا۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی بے پردگی نتیجہ ہے اُن مَردوں کی حماقت کا جو اندھا دُھند نئی روشنی کی تقلید کر رہے ہیں اور جنھیں اپنا قومی انجام سوچنے کی عقل نہیں رہی۔

[3] ترجمہ اشعار:۔ کوئی نہیں رہا کہ جو جنگلوں میں جا کر شکار کھیلے۔ تلوار ہاتھ میں لے اور ملک فتح کرے۔ اس زمانہ میں مَردوں کی ہمّت بس یہیں تک محدود ہے کہ عورت پردہ سے باہر نکلے اور کچھ کام کرے۔ چوتھا مصرع فارسی کے اُس مشہور مصرع میں طنزیہ تصرّف کر کے لکھا گیا ہے۔ ع "مردے از غیب بُروں آید و کارے بکند"۔ طنز یہ ہے کہ پہلے تو مَرد کسی اہم اور دشوار کام کی انجام دہی کے لئے یہ آرزو کیا کرتے تھے کہ تائید ایزدی سے کوئی ایسا عالی ہمّت مرد پیدا ہو جائے جو اس کام کو انجام دیدے اور آج کل بجائے کسی مرد غیب کے ظہور کے کاموں کی انجام دہی کے لئے عورتوں کے گھروں میں سے سب پردہ باہر آنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

شوکت وغیرتُ اورلَنْ ترانی ختم

وہ شوکت وشانِ زندگانی نہ رہی ۔ غیرت[1] کی حرم میں پاسبانی نہ رہی
پردہ اُٹھا تو کُھل گیا اے اکبر ۔ اسلام میں اب وہ لَنْ ترانی[2] نہ رہی

چالیس برس بعدُ

جب تک ہم میں ہے قومی خصلتُ باقی ۔ بے شک پردے کی ہے ضرورتُ باقی
چالیس[3] برس کی بات ہے یہ شاید ۔ بعد اُس کے رہے گی پھر نہ حُجّتُ باقی

[1] یعنی شریفوں کے زنانخانوں کی سب سے بڑی محافظ ہماری غیرت وحمیت ہوا کرتی تھی جو عورتوں کے بے پردہ ہوجانے سے ختم ہوگئی۔

[2] لَنْ تَرَانِیْ (تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا) ٹکڑا ہے آیۂ کریمہ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ۔ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے خداتعالیٰ سے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار (اپنے تئیں) مجھ کو دکھا، تاکہ میں تیرا دیدار کرسکوں تو جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا، یعنی میرے دیدار کی تاب نہیں لائے گا۔ چونکہ لَنْ تَرَانِیْ کے مفہوم سے ایک ایسی انانیت اور تعلّی نکلتی ہے جو خدا ہی کے شایانِ شان ہے اس لئے لَنْ تَرَانِیْ کا کلمہ جب انسانوں کے متعلق بولا جاتا ہے تو مجازاً اُس سے شیخت دتعلّی اور انانیت مراد لی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھنے سے مسلمانوں کی یہ تمکنت اور شیخی ختم ہوگئی کہ اُن کی عورتوں کو کوئی غیر مرد نہیں دیکھ سکتا۔

[3] مطلب یہ ہے کہ تیس چالیس برس کے بعد ہماری وہ تمام قومی خصوصیات اور خصلتیں بدل جائیں گی جن کی وجہ سے ہم میں اسلامی غیرت وحمیت موجود ہے اور جو اس کی متقاضی ہیں کہ عورتوں کا پردہ قائم رکھا جائے غیرت وحمیت کے ختم ہوجانے پر پھر کوئی عورتوں کی بے پردگی پر معترض نہیں ہوگا۔

اُدھر حکومت کا سایہ اِدھر عزّت کا پردہ

نہ یہ[1] قیدِ شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے ۔ رواج ومصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے
تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثالِ اہلِ یورپ نے ۔ اُدھر سایہ حکومت کا ہے یاں عزّت کا پردہ ہے

حرم سرا کا مطلب حدِّ ادبُ

ہے[2] صاف عیاں حَرم سرا کا مطلبُ ۔ بیگانوں کے واسطے ہے اک حدِّ ادبُ
ممکن ہو اگر تو اِس کو قائم رکھو ۔ عزّت کے نشان اور مِٹ گئے سبُ

[1] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والے جو پُرانے خیال کے مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں کہ وہ رفتار زمانہ سے بے خبر ہیں اور اُن کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے کہ اُنھوں نے عورتوں کو حکم شریعت کے مطابق پردہ میں مقید کر رکھا ہے اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو مسلمان پردہ کے حامی ہیں وہ نہ تو عورتوں کو قید میں رکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زمانہ کے حالات سے بے خبر ہیں بلکہ آج کل تو عورتوں کا پردہ زیادہ تر رواج اور عزّت کی وجہ سے ہے اور پردہ کے قائم رکھنے میں یہ مصلحت وحکمت بھی ہے کہ انگریز عورتوں کی عزّت تو اُن کی حکومت کی وجہ سے محفوظ ہے۔ ہماری عورتیں بھی اگر پردہ سے باہر نکل آئیں تو اُن کی عزّت وحُرمت کی حفاظت کا ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے اِس لئے مغربی عورتوں کی تقلید ہمارے لئے مُناسب نہیں ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ شریف مسلمانوں کے ہاں زنانخانوں یعنی پردہ دار گھروں کا ہونا اور اُن میں نامحرم مردوں کا بے روک ٹوک داخل نہ ہوسکنا بھی ہماری بچی کُھچی قومی عزّت کی نشانیوں میں سے ہے۔ جب تک بھی ممکن ہو اِس نشانی کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

شوکت وغیرتُ اور لَن ترانی ختم

وہ شوکت و شانِ زندگانی نہ رہی — غیرت[1] کی حرم (شریفوں کا زنانخانہ) میں پاسبانی (نگہبانی - رکھوالی) نہ رہی
پردہ اُٹھا تو کھل گیا اے اکبر — اسلام میں اب وہ لَن ترانی[2] نہ رہی

چالیس برس بعدُ

جب تک ہم میں ہے قومی خصلتُ باقی — بے شک پردے کی ہے ضرورتُ باقی
چالیس[3] برس کی بات ہے یہ شاید — بعد اُس کے رہے گی پھر نہ حُجّتُ (تکرار بحث) باقی

[1] یعنی شریفوں کے زنانخانوں کی سب سے بڑی محافظ ہماری غیرت وحمیت ہوا کرتی تھی جو عورتوں کے بے پردہ ہوجانے سے ختم ہوگئی۔

[2] لَنْ تَرَانِيْ (تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا) ٹکڑا ہے آیۂ کریمہ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ ۔ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے خداتعالیٰ سے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار (اپنے تئیں) مجھ کو دکھا، تاکہ میں تیرا دیدار کرسکوں تو جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا تو مجھ کو نہیں دیکھ سکے گا، یعنی میرے دیدار کی تاب نہیں لائے گا۔ چونکہ لَنْ تَرَانِیْ کے مفہوم سے ایک ایسی انانیت اور تعلّی نکلتی ہے جو خدا ہی کے شایانِ شان ہے اس لئے لَنْ تَرَانِیْ کا کلمہ جب انسانوں کے متعلق بولا جاتا ہے تو مجازاً اُس سے شیخت و تعلّی اور انانیت مراد لی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھنے سے مسلمانوں کی یہ تمکنت اور شیخی ختم ہوگئی کہ اُن کی عورتوں کو کوئی غیر مَرد نہیں دیکھ سکتا۔

[3] مطلب یہ ہے کہ تیس چالیس برس کے بعد ہماری وہ تمام قومی خصوصیات اور خصلتیں بدل جائیں گی جن کی وجہ سے ہم میں اسلامی غیرت و حمیت موجود ہے اور جو اس کی متقاضی ہیں کہ عورتوں کا پردہ قائم رکھا جائے غیرت وحمیت کے ختم ہوجانے پر پھر کوئی عورتوں کی بے پردگی پر معترض نہیں ہوگا۔

اُدھر حکومت کا سایہ اِدھر عزّت کا پردہ

نہ یہ قیدِ[1] شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے — رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے
تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثالِ اہلِ یورپ نے — اُدھر سایہ حکومت کا ہے یاں عزّت کا پردہ ہے

حرم سرا کا مطلب حدِّ ادبُ

ہے[2] صاف عیاں حَرم سرا (شریفوں کا زنانخانہ) کا مطلبُ — بیگانوں (غیر محرم) کے واسطے ہے اک حدِّ ادبُ
ممکن ہو اگر تو اِس کو قائم رکھو — عزّت کے نشان اور مٹ گئے سبُ

[1] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی والے جو پرانے خیال کے مسلمانوں پر طعن کرتے ہیں کہ وہ رفتار زمانہ سے بے خبر ہیں اور اُن کی آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے کہ اُنھوں نے عورتوں کو حکم شریعت کے مطابق پردہ میں مقید کر رکھا ہے اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو مسلمان پردہ کے حامی ہیں وہ نہ تو عورتوں کو قید میں رکھنا چاہتے ہیں اور نہ وہ زمانہ کے حالات سے بے خبر ہیں بلکہ آج کل تو عورتوں کا پردہ زیادہ تر رواج اور عزّت کی وجہ سے ہے اور پردہ کے قائم رکھنے میں یہ مصلحت وحکمت بھی ہے کہ انگریز عورتوں کی عزّت تو اُن کی حکومت کی وجہ سے محفوظ ہے۔ ہماری عورتیں بھی اگر پردہ سے باہر نکل آئیں تو اُن کی عزّت وحُرمت کی حفاظت کا ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے اِس لئے مغربی عورتوں کی تقلید ہمارے لئے مُناسب نہیں ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ شریف مسلمانوں کے ہاں زنانخانوں یعنی پردہ دار گھروں کا ہونا اور اُن میں نامحرم مردوں کا بے روک ٹوک داخل نہ ہوسکنا بھی ہماری بچی کھچی قومی عزّت کی نشانیوں میں سے ہے۔ جب تک بھی ممکن ہو اِس نشانی کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

پردہ کے مخالف پیرانِ نابالغ

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقّی قوم کی — جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سُن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اس میں شریک — یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیرِ نا[1] بالغ ہیں وہ

نئی تعلیم یافتہ بے پردہ لڑکیاں

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں — دِلکش و آزاد خوش رُو بیساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش — ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اُس طرف بے ساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے — ایک مُدّت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ
اوجِ قومی سے شرافت کا ہُما[2] گر جائے گا — ماکیاں سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ
ڈال دے[3] گا سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سُو آختہ

[1] پیرِ نابالغ ایسے بڈھوں کو کہتے ہیں جو بوڑھے ہونے کے باوجود بچّوں کی سی حرکتیں اور باتیں کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ بوڑھے لوگ بھی اس زمانہ میں پردہ کے مخالف ہو گئے ہیں تو اُن کی عقل سٹھیا گئی ہے اور وہ بچّوں کی طرح ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں۔

[2] عجمی شاعرانہ تخیل کا ایک پرند جس کا سر پر سے گزرنا بڑی اقبال مندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھنے سے ہماری وہ قومی عظمت و شرافت ختم ہو جائے گی جو ہماری اقبال مندی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور ہماری عورتوں میں فاختہ کی سی معصومانہ دِل کشی باقی نہیں رہے گی اور وہ گھریلو مُرغیوں سے بھی زیادہ کم حیثیت ہو جائیں گی۔

[3] یعنی عورتوں کی شرم و غیرت ختم ہو جائے گی اور وہ آزادی کے ساتھ اپنے حُسن کی نمائش کرتی اور اپنی تیغ ابرو سے دلوں کا شکار کرتی پھریں گی۔

قومی چادر کی تہیں کھلتی جاتی ہیں

مردِ جنٹلمین[1] ہو کر پا رہے ہیں جب عروج — بی بیاں پھر گھر میں رنج کس مپرسی کیوں سہیں
مطمئن رہئے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب — چادرِ[2] قومی کی آخر کھلتی جاتی ہیں تہیں
اِک طرف[3] دامِ ترقّی اک طرف موجِ شراب — ہر طرح حاضر ہیں ہم کہئے پھنسیں کہئے بہیں

اُستاد ہونے چاہئیں استاد جی نہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ[4] خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متّقی ہوں جو ہوں اُن کے مُنتظم — استاد اچھّے ہوں مگر استاد جی[5] نہ ہوں

[1] جنٹل مَین (Gentleman) بمعنی نقلی شریف آدمی۔ طنزاً مغربی وضع قطع اختیار کرنے والے مشرقی۔ مطلب یہ ہے کہ جب مرد انگریزی وضع قطع اختیار کر کے اونچی سوسائٹیوں میں پہنچنے لگے ہیں تو انھیں دیکھ کر عورتوں میں کیوں نہ مغربی تقلید اور آزادی کا جذبہ پیدا ہو اور وہ کیوں گھروں میں اس طرح بندھی بیٹھی رہیں کہ اونچی سوسائٹیوں میں اُن کی پرسش نہ ہو۔

[2] چادرِ قومی کی تہیں کھلتی جانے سے مراد یہ ہے کہ قوم کی جتنی کمزوریاں اور بُرائیاں قومی حکومت کی چادر نے چھپا رکھی تھیں وہ رفتہ رفتہ سب آشکارہ و نمایاں ہوتی جا رہی ہیں۔ اِس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہماری عورتوں کی بھی جو کمزوریاں اور خامیاں پابندی پردہ کی وجہ سے ڈھکی چھپی ہوئی ہیں وہ ظاہر نہ ہوں اور پردہ نہ اُٹھایا جائے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ تقلیدِ مغربی کی ترغیبات میں ایک طرف تو ترقّی کے وہ سبز باغ ہیں جو ہمارے نئے لیڈر ہم کو دکھا رہے ہیں اور دوسری طرف آزاد منشی کے مزے اور عیش و عشرت کے مناظر ہیں اور یہ دونوں ہی ہمارے لئے تباہ کُن اور مہلک ہیں۔ یعنی ترقی کی اُمیدوں کے جال میں پھنسنا بھی اور شرابِ عیش و عشرت کی موجوں میں بہنا بھی۔

[4] یعنی عورتوں کو تعلیم تو ضرور دینی چاہئے مگر یہ تعلیم ایسی ہونی چاہئے کہ وہ اصولِ خانہ داری سے پورے طور پر واقف اور اچھی سلیقہ مند بیبیاں ہو جائیں نہ کہ ایسی تعلیم جس کو حاصل کر کے وہ مَردوں کی مجلسوں کی زینت بنیں اور ناچیں گائیں۔

[5] اُستاد جی گانے بجانے والی عورتوں کے اُستاد کو کہتے ہیں جو عورتوں کو سبھا کی پری بناتے ہیں نہ کہ خاتونِ خانہ۔

حجاب کے دن۔ نقاب کب تک

اِدھر جوانوں کو ہے یہ سَودا کہ سیرِ باغ اُنھیں کرائیں — اُدھر خواتینِ خلوت آرا ہنوز مست اپنی نوج[1] میں ہیں
مگر یہ قیدِ حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک — کہ گبرد ترسا[2] کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلے

مناسب ہے نئی تعلیمِ نسواں — یہی راہ آپ اب بے رد و کد لیں
سمجھ[3] لیں لاکھ باتوں کی یہ اِک بات — میاں بدلے تو بی۔بی کیوں نہ بدلیں

[1] نوج کا لفظ اظہارِ بیزاری کے لئے پُرانی عورتیں بولا کرتی ہیں بمعنی خدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کو تو یہ خبط ہے کہ اُن کی بیبیاں باغوں میں سیر و تفریح کرنے جایا کریں اور پُرانے خیال کی پردہ نشین عورتیں اپنی پُرانی روشوں میں مست ہیں اور نئی آزادیوں سے بیزار۔

[2] گبرد ترسا بمعنی آتش پرست و نصرانی۔ لیڈیاں ہندی جمع ہے لیڈی Lady کی جو بڑی حیثیت کی مغربی عورت کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے جو لیڈران قومی ترقی کا وعظ کہہ رہے ہیں اُن کے ساتھ غیر مسلم عورتیں بھی شریک ہیں۔ اِس لئے اب پردہ اور نقاب چند ہی روز کا ہے۔

[3] لاکھ باتوں کی ایک بات' محاورہ ہے بمعنی بڑی وزنی اور مختصر بات۔ بادلیل۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو نئی تعلیم دلوانے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب شوہروں نے نئی روشنی اختیار کر لی اور وہ پہلے سے شوہر نہیں رہے تو اُن کی بیبیاں کیوں نہ اپنی رَوِش بدلیں۔

عورتوں کو گھر کے لئے پڑھاؤ قوم کے لئے نہیں

کون کہتا ہے کہ تعلیمِ زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو[1] اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

مَردی کی شرم کا پردہ اُٹھ گیا

تمھیں سے اُٹھ گیا مرد[2] کی شرم کا پردہ — تو پھر بقائے حجاب رُخِ زناں کب تک
اِس انقلاب کا اب انقلاب ہے دشوار — رہو گے منتظرِ مہرِ آسماں کب تک

نئے سانچے میں ڈھلی ہوئی بیبیاں

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید — ہو اگر ضبطِ نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبطِ نظر آساں نہیں — مُنھ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

[1] یعنی اقتضاءِ عقل و حکمت یہ ہے کہ عورتوں کو قوم کا لیڈر بننے کی نہیں بلکہ اپنے گھر کا لیڈر بننے کی تعلیم دینی چاہئے۔ یعنی ایسی تعلیم جس سے وہ فرائضِ زوجیت کو شوہر کی مرضی کے مطابق انجام دے کر گھر کی ملکہ بنی رہیں اور اپنے بچوں کی ایسی نگہداشت و تربیت کر سکیں کہ اُن کا گھر نمونۂ جنّت ہو۔ نمونۂ دوزخ نہ ہو۔

[2] یعنی جب تمھیں اپنے مَرد ہونے کی شرم و غیرت کا احساس نہیں رہا اور تم اسے گوارا کرنے لگے کہ تمھاری عورتوں پر دوسرے مَردوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑیں تو پھر عورتیں بھی اپنا مُنھ کیوں چھپائیں اور نامحرموں سے پردہ کیوں کریں۔ تمھارے احساسات و جذبات میں نئی روشنی کے اثر سے جو انقلاب ہوا ہے۔ اُس کا اثر عورتوں پر پڑنا لازمی ہے اور اب یہ تمھاری امید بالکل فضول ہے کہ زمانہ تم پر مہربان ہوگا اور تمھاری عورتیں تمھارے اثر میں رہیں گی۔

تم میں[1] وہ ضبطِ نظر اُن میں وہ خودداری کہاں
رعبِ قومی مثلِ فاتحِ ملک پر طاری کہاں

اب رہی[2] تعلیم کون اس امر کا مفتوں نہیں
بیبیوں پر مغربی سانچا مگر موزوں نہیں

یہ[3] تو ظاہر ہے حریفِ شوخ کیوں رُکنے لگا
شوق سے لیکن خرابی پر میں کیوں جُھکنے لگا

شوہر پرستی کی بجائے پبلک پسندی

اعزاز[4] بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں سے وہ لینری اور ناچنے کو ریڈی

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بی۔بی۔ پبلک پسند لیڈی

[1] مطلب یہ ہے کہ نہ تو آج کل کے مرد ایسے پرہیزگار اور نیک ہیں کہ وہ نامحرم عورتوں کو بُری نظر سے نہ دیکھیں اور نہ آج کل کی عورتوں میں اپنی عزت و ناموس کا پاس ہے۔ اگر ہماری قومی حکومت ہوتی تو مردوں کو بھی اُس کا ڈر رہتا اور عورتوں کو بھی اور اس کی ضرورت نہ ہوتی کہ عورتوں کو زنانخانہ کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے۔ وہ گھر سے باہر نکل کر بھی ضروری کام کاج کر سکتی تھیں۔

[2] یعنی عورتوں کو تعلیم دلانے کا شوق سب ہی مردوں کو ہے۔ لیکن اُن کو ایسی تعلیم دلوانا کسی طرح مناسب نہیں ہے جو اُن کو مغربی سانچہ میں ڈھالے یعنی مغربی روش پر چلائے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ ہماری عورتیں بھی چلیں گی تو اُسی طرف جس طرف زمانہ اُن کو چلا رہا ہے مگر میں خوشی سے اُن کی بے پردگی اور آزاد منشی کی حمایت کیسے کر سکتا ہوں۔

[4] یعنی جتنی جتنی عورتوں کی عزت سوسائٹی میں بڑھتی جا رہی ہے اُتنا ہی اُن کا سکون و آرام کم ہوتا جا رہا ہے۔ نئی تعلیم کی خرابی کا اثر یہ ہوا ہے کہ عورتیں جلسوں میں ناچنے کے لئے تو ہر وقت تیار رہتی ہیں لیکن گھر کا کام کاج اُن سے نہیں ہو سکتا۔ پہلے وہ شوہر پرست یعنی شوہروں سے محبت کرنے والی بیبیاں تھیں اور اب پبلک پسند لیڈیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی جن کو شوہروں کی پسندیدگی کے مقابلہ میں پبلک کی پسندیدگی کا زیادہ خیال رہتا ہے۔

بیگم پیچوان، لیڈی سگرٹ

پردہ میں ضرور ہے طوالت بے حد
انصاف پسند کو نہیں چاہئے ہٹ

تشبیہ بُری نہیں اگر میں یہ کہوں
بیگم ہے پیچوان[1] لیڈی سگرٹ

یہ قوم کی عقدہ کشائی ہے یا پردہ دری

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے
کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے

یہی[2] ہے عقدہ کُشائیِ قوم تو اک دن
ازار بند کو کہہ دیں گے حَبسِ بیجا ہے

[1] پیچوان = ایک قسم کا شاندار حقہ جس کا نیچا کافی لمبا اور لچکدار ہوتا ہے تاکہ دور و نزدیک اور لیٹے لیٹے اُسے آسانی سے پی سکیں۔ سگرٹ کے مقابلہ میں پیچوان سے تمباکو کشی کی خواہش کا پورا کرنا اگرچہ زیادہ بکھیڑے کا کام ہے لیکن جو فرحت و سُرور پیچوان سے حاصل ہوتا ہے وہ سگرٹ سے حاصل نہیں ہوتا اور سگرٹ حقہ اور پیچوان کے مقابلہ میں زیادہ مضر بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ سگرٹ سے تمباکو کا دُھواں پانی کی منازل طے کر کے نہیں بلکہ براہِ راست حلق سے نیچے جاتا ہے۔ شریف مشرقی عورتوں کی حیا اور غیرت کی وجہ سے اُن کے ساتھ ایسی بے تکلفی اور بے حجابی سے اختلاط نہیں ہو سکتا جیسا کہ یورپین لیڈیوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے بیگم کی پیچوان سے اور لیڈی کی سگریٹ سے تشبیہ نہایت ہی موزوں اور پُر لطف ہے۔

[2] یعنی قوم کی مشکلات کا حل اگر نئی روشنی کے مخالفینِ پردہ کے نزدیک اسی میں ہے کہ عورتوں کا پردہ اُٹھا دیا جائے اور عورتوں کے پردہ کو وہ حبسِ بیجا سے تعبیر کرتے ہیں تو عجب نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد ستر پوشی کو بھی وہ حبس بیجا تصور کرنے لگیں اور پیجامہ پہننے کے بھی خلاف ہوں۔ پردہ در۔ عقدہ کشائی۔ ازار بند اور حبس بیجا کی تجنیسات معنوی قابلِ غور ہیں۔

بنائے عمارت فخر النسا کہیں در پردہ بے پردگی کی بنا نہ ہو

کالج بنا عمارتِ فخر النسا[1] بنی — شکرِ خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی[2]
بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا — جن کو یہ ڈر ہے اُن کی تو جانوں پہ آ بنی[3]
لیکن نگاہِ نبضِ شناسانِ وقت[4] میں — امراضِ قوم کے لئے عمدہ دوا بنی

اچھے تخم کے لئے اچھے درختوں کی ضرورت

تعلیم یافتہ ہوں اور نیک بخت بھی ہوں — تم سے رہیں ملائم اور شیطاں[5] پہ سخت بھی ہوں
قرآں ہی کرے گا ان بی بیوں کو پیدا — پاکیزہ تخم[6] جب کہ ہوں عمدہ درخت بھی ہوں

---

[1] عمارت فخر النساء :- غالباً زنانہ کالج علی گڈھ کی کسی عمارت کا نام ہے۔

[2] بنا بمعنی دولھا۔ مجازاً لڑکا۔ بنی بمعنی دلہن۔ مجازاً لڑکی۔ یعنی علی گڈھ کالج میں لڑکوں کی تعلیم تو ہوتی تھی۔ اب لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہوگیا۔ یعنی لڑکے لڑکیاں سب کالج میں پڑھنے لگے۔

[3] جان پر بن جانا یا جان پر آ بننا محاورہ ہے بمعنی سخت تکلیف پہنچنا۔ جان کا خطرہ میں ہونا۔ یعنی عمارتِ فخر النسا جو بظاہر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بنائی گئی ہے کہیں اس کی تعمیر میں عورتوں کی بے پردگی مضمر نہ ہو۔ یعنی اُس کے بننے سے کہیں عورتیں بے پردہ نہ ہونے لگیں۔ جن دُور اندیشوں کو اس عمارت کے بننے سے یہ اندیشہ ہے اُن کے دل کو بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔

[4] نبض شناسانِ وقت۔ زمانہ کی نبض پہچاننے والے۔ یعنی وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ زمانہ کس طرف جا رہا ہے اور اُس کا اقتضاء کیا ہے۔

[5] یعنی بُرے کاموں سے نفرت کرنے اور اُن کو سختی سے روکنے والی۔

[6] یعنی ایسی بیبیاں جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اسلامی خصائل بھی رکھتی ہوں جب ہی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اُن کے والدین احکامِ قرآنی کے پابند ہوں۔ کیونکہ عمدہ درخت تو اچھے بچوں ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

پردہ دَروں کا راز آشکار

پردے کے واسطے تو عبث بے قرار ہے — پردہ دَروں کا راز تو خود آشکار ہے
آغا تقی[1] میں حُسن نہ اب وہ سنگار ہے — پردہ اُٹھا کے دیکھو تو کوّا گُہار ہے

پردہ ذریعۂ عزّت و تمکنت

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں — مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں — میرزا یانہ ادا تھی سلطنت کی بات تھی
خون[2] میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کبھی — خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

عورت کی شان کا ظہور

تمکین اک نشاں ہے عصمت کی آن کا — پردا[3] بس اک ظہور ہے عورت کی شان کا

---

[1] ایک مشہور پُرانا مصرع ہے "آغا تقی کے باغ میں کوّا حلال ہے"

[2] مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی پردہ نشینی سے اگرچہ اُن کی عصمت و پاک دامنی کی حفاظت بھی ہوتی تھی لیکن پردہ کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ مسلمانوں کا قومی وقار اور عزت و شان برقرار رہے۔ پردہ کے مخالف کہتے ہیں کہ یہ مغلوں کے چونچلے تھے اور قومی وقار کا یہ احساس اُسی وقت تک کے لئے تھا جب تک کہ ہماری اپنی حکومت تھی۔ لیکن اگر ان مخالفین پردہ میں غیرت کا کچھ احساس باقی رہا تو کبھی نہ کبھی اُن کو بھی پردہ کے فوائد اور مصلحتوں کا معترف ہونا پڑے گا۔ کیونکہ بے پردگی سے یقیناً عورتوں میں ایسی بے غیرتیاں پیدا ہو جائیں گی جسے ہماری حمیّت قومی برداشت نہیں کر سکے گی۔

[3] یعنی پردہ ایک ایسا نشان ہے جس سے عورت کے احساسِ پاکدامنی کی تمکنت و شان ظاہر ہوتی ہے۔

پردہ[1] تو اُن کا حق ہے نہیں اُن پہ جبر (زبردستی) کچھ — آیا ہے اُن پہ وقت یہ سخت امتحان کا
شوخیٔ (بے حیائی) مغربی کے خریدار ہیں بہت — گاہک مگر خدا ہے حیا کی دُکان کا

نورِ اسلام کی حفاظت کے لئے فانوس پردہ کی ضرورت

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید — بے حجابی جو ہو اُس میں تو قباحت (برائی) کیا ہے
نورِ[2] اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ — شمعِ خاموش (بجھی ہوئی شمع) کو فانوس (قندیل) کی حاجت کیا ہے

آج اُس کا خوشنما ہے مگر ہوگی کل خراب

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور (بے تمیز، بدسلیقہ) ہے
حسنِ معاشرت (خانہ داری) میں سراسر فتور (نقص، خرابی) ہے — اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

[1] یعنی یہ کہنا کہ پردہ عورتوں سے زبردستی کرایا جاتا ہے۔ غلط ہے۔ بلکہ پردہ بھی عورتوں کے لئے ایک ذریعۂ عزت اور اُن کا ایک نسوانی حق ہے جس کی وہ خود مَردوں سے خواستگار ہوتی ہیں۔ کیونکہ پردہ سے خود اُنہی کی قدر و عزت بڑھتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ مغربی بے حیائی و بے پردگی کی قدر زیادہ کی جا رہی ہے اور حیا کی قدر کرنے والے صرف معدودے چند خدا پرست رہ گئے ہیں یا خود خدا جس کی قدر کا نتیجہ فوراً نہیں معلوم ہوا کرتا اس لئے مسلمان عورتوں کے لئے یہ وقت بڑے سخت امتحان کا وقت ہے اور جو عورتیں اس امتحان میں پوری نہیں اُترتیں وہی پردہ کو اپنے حق کی بجائے مردوں کے جبر سے تعبیر کر سکتی ہیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ نئی تہذیب کی عورتیں اگر دین و مذہب کی پابند ہوتیں اور اُن کے دلوں میں نورِ اسلام کی شمع جل رہی ہوتی تو وہ اُس کی حفاظت کے لئے پردہ کے فانوس سے کام لیتیں۔ اب تو وہ بجھی ہوئی شمع ہیں جس کے لئے فانوس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اُن پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست — چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست
لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت (غرور) — ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت
ہرچند ہو علومِ ضروری کی عالمہ (جاننے والی) — شوہر کی ہو مُرید (تابعدار) تو بچوں کی خادمہ

مذہب کے جو اصول ہوں اُس کو بتائے جائیں — باقاعدہ طریقِ پرستش (عبادت) سکھائے جائیں
اوہام[1] (دل کے توہمات) جو غلط ہوں وہ دل سے مٹائے جائیں — سکّے خدا کے نام کے دل میں بٹھائے جائیں
عصیاں (برائی، گناہ) سے محترز (پرہیز کرنے والی) ہو خدا سے ڈرا کرے — اور حُسنِ عاقبت (انجام بخیر ہونے کی) کی ہمیشہ دُعا کرے

تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام (فریب) میں — خالق[2] سے لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں
خیرات ہی سے ہوگی غرض خاص و عام میں — اُس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں
اچھا بُرا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے — نیکی[3] اگر کرے گی تو فطرت (خلقت یا قدرت) بھی ساتھ ہے

[1] جاہل عورتوں میں توہمات یعنی غلط اعتقادات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا کی عظمت و وقعت پر اُن کو پورا یقین نہیں ہوتا اور وہ تعلیماتِ مذہب سے بے خبر ہوتی ہیں۔ اس لئے تعلیم اُن کو ایسی دینی چاہئے جس سے فضول اور غلط توہمات اُن کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوں اور خدا کے سوا اور کسی طاقت سے مرعوب و متاثر نہ ہوں۔

[2] یعنی دنیاوی کام کاج بھی سب کرے گی مگر خدا کے دھیان سے غافل نہیں ہوگی۔

[3] مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت یا تائیدِ ایزدی نیکی کا ساتھ دیتی ہے۔ بُرائی کا ساتھ نہیں دیتی۔ اِس لئے نیکی کرنے والوں کے مقاصد کی کامیابی میں اُن کی فطرت اور تائیدِ ایزدی معین ہوا کرتی ہے۔

تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار[1] پر نشان تو ہیں واہیات سے
یہ کیا زیادہ گن نہ سکے پانچ سات سے
لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے
گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آیا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا
لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا[2]
مطبخ سے رکھنا چاہئے لیڈی کو سلسلا
وقت آ پڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا
گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی[3] کی چوریوں سے حفاظت پہ ہو نظر
عورت کے دل میں شوق ہے اس بات کا اگر
کپڑوں سے بچتے جاتے ہیں گُل کی طرح سنور
کسبِ[4] معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید
اِک شغل بھی ہے دل کے بہلنے کی بھی امید

---

[1] پرانے زمانہ میں چونکہ عورتوں کو حساب کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اس لئے وہ پوری گنتی بھی نہ گن سکتی اور نہ لکھ سکتی تھیں۔ دیواروں یا دروازوں پر کتھے یا کوئلہ وغیرہ کے نشانات کے ذریعہ سے ضروری یادداشتیں رکھتی تھیں۔

[2] یعنی انگلستان کے رسالوں میں بھی مغربی عورتوں کے لئے کھانا پکانا سیکھنے اور باورچی خانہ سے تعلق رکھنے کی ضرورت پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

[3] یعنی درزی عموماً کپڑا چرا لیا کرتے ہیں۔ عورتوں کو سینا پرونا اور قطع کرنا آتا ہوگا تو وہ درزی کی چوریوں پر نظر رکھ سکیں گی۔

[4] یعنی سینے پرونے کا ہنر ایک ایسا ہنر ہے جس سے کبھی ضرورت پڑنے پر عزت کی روزی حاصل کی جا سکتی ہے اور گھر میں اس شغل سے دل بھی بہلتا رہتا ہے۔

سب سے زیادہ فکر ہے صحت کی لازمی
صحت نہیں درست تو بے کار زندگی
کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا ہو لباس بھی
آفت ہے ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی
تعلیم کی طرف ابھی اور اِک قدم بڑھیں
صحت کے حفظ کے جو قواعد ہیں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلیدِ مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دِل[1] سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
ان کی طلب میں حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سُنو کہ جو اُس کا بیان ہے
دنیا[2] کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اُس کا عمل خراب
آج[3] اُس کا خوش نما ہے مگر ہوگا کل خراب

---

[1] یعنی جو میسّر ہے اُس پر شاکر و قانع رہو اور حرص و ہوس کو دل میں جگہ نہ دو۔

[2] یعنی دنیا محض ایک دارالعمل یا مزرعۂ آخرت ہے۔ جیسے عمل یہاں انسان کرے گا ویسا ہی دارالجزا میں اُس کا نتیجہ پائے گا۔

[3] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طلبِ دنیا میں دین کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں اُن کی دنیا اگرچہ زیادہ خوش نما دکھائی دیتی ہے مگر دارالجزا میں اُن کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

نئی اور پُرانی تہذیب

بے حجابی پڑوسی کے لئے نہیں حکّام رسی کے لئے

اُٹھ گیا[1] پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مرے ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صِرف حکّام سے ملنے میں مزا آتا ہے

الاؤ پر فانوس نہیں رہ سکتا

گوڈر[2] جدید روشنی کے شُعلوں کا ہے یہ
پردے کی احتیاج ہے کیا اِس بناؤ پر

جب شمع ہو تو اُس کی حفاظت ضرور ہے
فانوس کوئی رکھ نہیں سکتا الاؤ پر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی عورتوں کا پردہ اُٹھا دیتے ہیں وہ بھی اسے گوارا نہیں کرتے کہ اُن کے پڑوسی بغیر آواز دئے اُن کے گھر میں چلے آئیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے پردہ پڑوسی کے لئے تو نہیں اُٹھایا ہے بلکہ اِس لئے اُٹھایا ہے کہ ہم کو اس میں مزا آتا ہے کہ ہماری عورتیں بھی انگریز حکّام سے بے پردہ مِل سکیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ نئی روشنی کی شیدا رُو عورتوں کے بناؤ سنگھار کی مثال تو ایسی ہے جیسے پھٹے پُرانے کپڑوں کے ڈھیر میں کسی نے آگ لگا دی ہو اور آگ کے شُعلوں میں پھٹا پُرانا ہونا چھپ گیا ہو۔ بھلا ایسی جلنے والی عورتوں کے لئے پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ پردہ تو ایک فانوس ہے جس سے شمع کی روشنی کی حفاظت تو کی جا سکتی ہے مگر کسی الاؤ یا آگ کے ڈھیر پر اُس کو نہیں رکھا جا سکتا۔

شیطان کو بھی شیطان نہ کہو

مغوی کو بھی بُرا[1] نہ کہیئے ترغیب ہے یہ
کِس سے میں کہوں دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہہ دیا اِک دن
اک شور مچا خلافِ تہذیب ہے یہ

قیدِ مشرب و ملّت سے آزادی

ہر رنگ[2] کی باتوں کا مرے دل میں ہے جُھرمٹ
اجمیر میں کلچا ہوں علی گڑھ میں ہوں بسکٹ
پابند کسی مشرب و ملّت کا نہیں ہوں
گھوڑا مری آزادی کا اب جاتا ہے بگٹٹ

بھوکا یہ بھی نہ کہے کہ میں بھوکا ہوں

دقیانوسی طریق سے منھ موڑو
شیرازہ[3] مذہبی لغت کا توڑو
بھوکے سے کہو حدِ تہذیب میں رہ
آنتوں سے کہو کہ قُلْ ھُوَاللہ[4] چھوڑو

---

[1] یعنی آج کل کی تہذیب میں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ جو سیدھے راستہ سے بھٹکانے والا اور بُرائیوں کی طرف ورغلانے والا ہو اُس کو بھی بُرا نہیں کہنا چاہیے۔ مسلمان جو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (پناہ مانگتا ہوں میں شیطانِ مردود سے) پڑھا کرتے ہیں اور اُس میں شیطان کو رجیم یعنی مردود یا راندۂ درگاہ خداوندی کہا کرتے ہیں اُس کو بھی آج کل خلافِ تہذیب سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ تہذیب نہیں ہے بلکہ دل کی تخریب ہے۔

[2] یعنی میری آزادی اس قدر تیزی سے ترقی کر رہی ہے کہ میں کسی مسلک و مشرب کا پابند نہیں رہا۔ جیسا موقع دیکھتا ہوں ویسا بن جاتا ہوں۔ اجمیر میں دیسی وضع قطع اختیار کر لیتا ہوں اور علی گڑھ میں انگریزی۔ اجمیر کے کلچے اور علی گڑھ کے بسکٹ مشہور تھے۔

[3] و [4] یعنی اپنی زبان میں مذہبی الفاظ استعمال کرنے کے دقیانوسی طریقہ کی جو یک رنگی تم میں باقی ہے اُسے ختم کر دو۔ سخت بھوک میں بھی یہ نہ کہا کرو کہ آنتیں قُلْ ھُوَاللہ پڑھ رہی ہیں۔ کیونکہ قُلْ ھُوَاللہ کے الفاظ قرآنی اور مذہبی ہیں۔ آنتوں کا قُلْ ھُوَاللہ پڑھنا اُردو محاورہ ہے یعنی بھوک سے بے تاب ہونا۔

اونٹنی اور ٹم ٹم، قوّال اور چھم چھم

پیتا ہوں شراب آبِ زمزم[1] کے ساتھ — رکھتا ہوں اِک اونٹنی بھی ٹم ٹم[3] کے ساتھ
ہیں عشقِ حقیقی[2] اور مجازی دونوں — قوّال کی بھی صَدا ہے چھم چھم کے ساتھ

(ٹم ٹم: دو پہیوں کی ایک انگریزی گاڑی — قوّال: صوفیانہ اور حقانی چیزوں کا گانے والا — چھم چھم: گھونگھروؤں کی آواز)

نئی تہذیب کے انڈے

رہا کرتا ہے مرغِ فہم[4] شاکی — نئی تہذیب کے انڈے ہیں خاکی
چھری سے اُن کو کٹوا کر فلک نے — خدا جانے ہماری ناک کیا کی

(ناک: غیرت۔ شرم۔ عزت)

---

[1] زمزم اُس کنوئیں کا نام ہے جو خانۂ کعبہ میں ہے اور جس کو حضرت ہاجرہ نے اُس جگہ پر جہاں شدّتِ تشنگی سے حضرت اسمٰعیلؑ کے ایڑیاں رگڑنے پر پانی نکل آیا تھا مٹّی گھیر کر بنا لیا تھا۔

[2] عشقِ حقیقی خدا کے عشق کو کہتے ہیں اور عشقِ مجازی دنیاوی معشوق کے عشق کو۔

[3] یعنی میری تہذیب و معاشرت نئی اور پُرانی تہذیب کی ایک معجون مرکب بن گئی ہے۔ شراب پیتا ہوں اور آبِ زمزم کو متبرک سمجھ کر گھر میں رکھتا ہوں۔ اونٹنی پر بھی سوار ہوتا ہوں اور ٹم ٹم پر بھی۔ عشقِ حقیقی بھی کرتا ہوں اور عشقِ مجازی بھی۔ قوّالی بھی سنتا ہوں اور ناچ بھی دیکھتا ہوں۔

[4] مطلب یہ ہے نئی تہذیب کے انڈے تو خاکی یعنی محض دیکھنے ہی دیکھنے کے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان انڈوں کو چھری سے کاٹ کر ہم نے اپنی قومی حمیت و غیرت کو کہاں غارت کر دیا ہے۔ یعنی نئی روشنی کی نمائشی باتوں پر ریجھ کر اپنی قیمتی قومی خصوصیات کو کیوں برباد کر دیا۔

پیری کی نابالغی کا انتظار

کہتے ہیں اکبر یہ تیری عقل کا کیا پھیر ہے — طبع تیری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ میں بھی ہوں گا حاضر عنقریب — ہو چکا ہوں پیر[1] بس اب نابالغی کی دیر ہے

(عقل کا کیا پھیر ہے: یعنی تیری عقل کیسی الٹی ہو گئی ہے)

باپ کی لاحول اور ماں کی نوج پر خندہ زن

عزّت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے — حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے
اِس طرزِ تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن — لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج[2] ہے

(اوج: ترقی۔ عروج — موج: بہاؤ۔ لہر — خندہ زن: ہنسی اڑانے والے)

ہر پھول میں کانٹا

ذکروں پہ جو گذرتی ہے مجھے معلوم ہے — بس کرم کیجے مجھے بے کار رہنے دیجئے

---

[1] نابالغی کے معنی ہیں ناسمجھی۔ بچپن۔ پیرِ نابالغ اُس بڈھے کو کہتے ہیں جو بچوں کی سی ناسمجھی کی باتیں کرے۔ مطلب یہ ہے کہ بڈھا تو میں بھی ہو گیا ہوں عنقریب اُس عمر کو پہنچنے والا ہوں جب عقل و شعور سے محروم ہو جاؤں گا۔ اُس وقت میں بھی شاید نوجوانوں کی طرح نئی تہذیب پر مائل ہو جاؤں۔

[2] نوج۔ خدا نہ کرے۔ دور پار۔ عورتوں کی زبان سے یہ لفظ اظہارِ تنفر کے لئے بے ساختہ نکلا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کی نہ عزّت میں کوئی ترقی ہو رہی ہے نہ نیکی میں وہ سوائے اِس کے کہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سے اپنی قوم پر حملہ کریں اور کچھ نہیں جانتے۔ اُن کی تربیت ایسی ہوئی ہے جس پر اغیار ہنستے۔ باپ لاحول پڑھتے اور مائیں نوج کہتی ہیں۔ یعنی سب ہی اُن سے بیزار و ناخوش ہیں۔

راہ میں لیسنس[1] ہی کافی ہے عزّت کے لئے — بس یہی لے لیجئے تلوار رہنے دیجئے

ڈاکٹر صاحب سے ملنا آپ[2] کا اچھا نہیں — بیٹھئے گھر میں مجھے بیمار رہنے دیجئے

تیزئی مے[3] کا اثر تھا نزع (جان کی) کی آمد نہ تھی — خیر اُٹھئے توبہ استغفار (خدا سے گناہوں کی معافی مانگنا) رہنے دیجئے

مشرق غربی جھپیٹ میں

مشرق غربی جھپیٹ (بھوت پریت کا سایہ) میں ہے — دل[4] سینے میں تھا سو پیٹ میں ہے

کیوں اس کو ہے مولوی پہ ترجیح — کیا بات گریجویٹ میں ہے

کیسہ (بٹوہ۔ تھیلی) خالی ہے بکس ہے خالی — جو کچھ[5] ہے یہاں پلیٹ (رکابی) میں ہے

[1] لیسنس لفظ انگریزی (Licence) بمعنی اجازت نامہ جو آج کل ہتھیاروں وغیرہ کے رکھنے والوں کو حکومت سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل لوگ تلوار وغیرہ کے لیسنس اپنی حفاظت یا اُن سے کام لینے کے لئے نہیں بلکہ صرف عزّت کے لئے حاصل کرتے ہیں۔

[2] یہ خطاب بیمار شوہر کا اپنی بیوی سے ہے۔ یعنی شوہر کو بیمار رہنا منظور ہے مگر یہ منظور نہیں کہ عورت ڈاکٹر کے پاس جاکر اپنی عصمت کو خطرہ میں ڈالے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ شراب زیادہ پی لینے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جان نکل رہی ہے اور اس لئے توبہ استغفار شروع کردی تھی مگر جب موت کا اندیشہ نہیں رہا تو پھر وہی حرکتیں شروع کردیں۔

[4] یعنی مشرق پر مغربی تہذیب کا یہ اثر ہوا ہے کہ دلوں میں سوائے شکم پُری کی فکر کے اور کوئی خیال نہیں رہتا گویا دل سینہ سے ہٹ کر پیٹ میں چلا گیا ہے۔

[5] یعنی آمدنی میں سے کچھ پس انداز نہیں ہوتا سب کھانے پینے کے نذر ہو جاتا ہے۔

کاش بچّے پیدا ہی نہ ہوتے

مشرق کے جو ہو رہے وہ پستی (خواری۔ ذلّت) میں پڑے — مغرب سے سبق لیا تو مستی (یعنی بدمستی جس کا انجام ہوش نہ رہا) میں پڑے

پیدا ہی نہ ہوتے کاش اطفال یہاں — آخر یہ کیوں بلائے ہستی (زندگی کی مصیبت میں پھنسے) میں پڑے

کالج کے پاس اور مسجد کے پاس

پاس کالج کے جو ہیں ووٹ (رائے) طلب کرتے ہیں — پاس مسجد کے جو ہیں طاعت رب (خدا) کرتے ہیں

عشوہ[1] ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں کُشتہ (مارے ہوئے) — یہ رخ سادگی طرز عرب کرتے ہیں

اُن کو ہے لمنڈ و وسکی (شراب) کی ضرورت اور یہ — رفع پانی سے فقط خشکی لب کرتے ہیں

پھیلتے[2] وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ — یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظ نسب کرتے ہیں

وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں

وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

[1] یعنی کالج کے پڑھے ہوئے تو عجمی ناز و انداز اور کرشموں پر مبتلا ہو رہے ہیں اور مسجدوں میں خدا کی عبادت کرنے والے عرب کی سادہ زندگی ہی کو اچھا اور قابل تقلید سمجھتے ہیں۔

[2] یعنی نئے تعلیم یافتہ تو نئے رنگ میں رنگ کر اغیار سے اپنے تعلقات بڑھا رہے ہیں اور اُن سے رشتے قائم کرنا چاہتے ہیں اور پرانے خیال کے لوگ اپنے حسب و نسب کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ اغیار سے راہ و رسم نہیں بڑھاتے۔

نکٹائی سے تو زُنّار ہی اچھّی تھی

ہوائے کوچۂ مشرق کی موجیں یاد ہیں ہم کو — وہی تھی منزلِ راحت وہی رفتار اچھّی تھی
نئی محفل کی نکٹائی[1] تو گویا طوقِ گردن ہے — وہی بُت خانہ بہتر تھا وہی زُنّار اچھّی تھی

آج کل کے لیڈر اور پہلے کے بزرگ

شوخی[2] یہ لیڈروں کی یہ ملّت کی ابتری — تاریک شب میں کشمکشِ برق و ابر ہے
محفوظ مثلِ انجمِ تاباں ہیں وہ بزرگ — ذوقِ صلوٰۃ جن کو ہے اور تابِ صبر ہے

لیونڈر اور عطرِ حنا

ہر چند کہ ہے مِس کا لیونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سایہ کی بھی سَن سَن ہوس انگیز ہے لیکن — اُس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

[1] نکٹائی۔ انگریزی (Neck-tie) کپڑے کا ایک لمبا ٹکڑا جسے خوشنمائی سے گانٹھ دے کر قمیص کے کالر میں باندھتے ہیں۔ زُنّار جنیو کو یعنی اُس تاگے کو کہتے ہیں جسے ہندو آڑا ترچھا کر کے گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنیو پہننے والے کو لباس پوشی کے اُن آداب و قواعد کا لحاظ نہیں رکھنا پڑتا ہے جن کی ٹائی باندھنے والے دلدادگانِ فیشن جدید کو محفلوں میں پابندی کرنی پڑتی ہے۔ گویا ٹائی گلے کا طوق بن کر ٹائی باندھنے والوں کو راحتِ لباس سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ لباس نہیں پہنتے بلکہ گویا لباس میں بند ہو جاتے ہیں۔

[2] یعنی ہمارے لیڈروں کی شوخی و طراری اور ملّت کی ابتری کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تاریک رات میں ابر اور برق میں کشمکش ہو رہی ہو لیڈر زوالِ ملت کے ابر میں بجلی کی طرح کوند کر غائب ہو جاتے ہیں اور اُن کی روشنی باقی نہیں رہتی یعنی اُن کا کوئی اثر ملت کے فلاح و بہبود پر نہیں پڑتا لیکن جن بزرگانِ دین کو نماز سے دلچسپی ہے اور جو صبر و استقلال سے کام لے سکتے ہیں۔ وہ ستاروں کی طرح ہمیشہ چمکتے رہتے اور روشنی کم رکھنے کے باوجود قوم کی صحیح رہنمائی میں مدد دیتے ہیں۔

مرکزیت ختم ہو جانے کا اندیشہ

کب کہتا ہوں یہ شیخ معزّز نہ رہیں گے — البتّہ[1] یہ ہے خوف کہ مرکز نہ رہیں گے!
سچ کہتا تھا معمار کسی وقت میں اکبر — اُٹّھا دو فُٹہ اب یہ مرے گز نہ رہیں گے!

سول لائن اور شہر کی رہائش

جناب ہی کو مناسب ہے یہ سِول[2] لائن — نیازمند کو تو شہر ہی میں راحت ہے
زمانہ ہے کہ وہ دشمن ہے صاف گوئی کا — زبان ہے کہ نہیں مانتی مصیبت ہے

زندہ نُما مُردے اور مُردوں سے بَدتر زندے

یہ پوچھا شیخ سے میں نے کہ کہیئے کیا گذرتی ہے — یہ سن انّیس سو دس ہیں نئے مقصود و منظر ہیں
بہ[3]نہایت یاس و حسرت سے وہ بولے کیا کہوں تم سے — یہ دو مصرعے سُنو جن میں نہاں دفتر کے دفتر ہیں
نئی تعلیم کے مُردے تو زندہ ہیں تماشوں میں — پُرانی وضع کے زندے مگر مُردوں سے بدتر ہیں

[1] مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ قدیم رہنمایانِ دین کی عزت نہ کی جائے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ ان کی مرکزیت ختم ہو جائے گی یعنی قوم کو اُن سے وابستگی باقی نہیں رہے گی اور اُن کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ جس طرح پیمایش کے آلات بدل گئے ہیں اسی طرح اخلاقی معیار بھی بدل جائیں گے۔

[2] سول لائن۔ انگریزی (Civil Lines) شہر کے اُس حصّہ کو کہتے ہیں جہاں انگریز افسروں کی کوٹھیاں اور بنگلے ہوتے ہیں۔

[3] یعنی نئے تعلیم یافتہ جو خدا و مذہب سے بیگانہ اور اپنی قومی خصوصیات سے محروم ہو جانے کی وجہ سے حقیقت میں مر چکے ہیں وہ تو متحرک تصویروں کی طرح دنیا کے تماشائیوں کی نظر میں زندہ دکھائی دے رہے ہیں اور تماشا بنے ہوئے ہیں۔ لیکن پُرانی روشنی کے لوگ جو اپنے مذہب اور اپنی خصوصیات پر قائم ہیں وہ مُردوں سے بدتر ہو رہے ہیں۔

نئی روشنی عارضی ہے اور پرانی پائیدار

روشنی جن میں نئی ہے وہ مری سنتے نہیں — لاکھ سمجھاؤں کہ صاحب ہے یہ فانی روشنی
انجم و شمس و قمر لیکن ہیں میرے ہم طریق — وضع پر قائم ہیں ان میں ہے پرانی روشنی

عاشقی عقل کے ساتھ

عاشقی اُن کی نہیں ہے عقل سے بالکل جدا[1] — اہلِ دل وہ بھی ہیں لیکن دل بدن کے ساتھ ہے
وہ نہیں ہیں میرے چاکِ جیب و داماں میں شریک — ہے جنوں اُن کو بھی لیکن پیرہن کے ساتھ ہے
آہوئے رعنائے دشتِ ہو کے وہ قائل نہیں[2] — آنکھ اُن کی آہوئے دشتِ ختن کے ساتھ ہے
مجھ کو اُلجھانے کو کافی ہو گئی سنبل کی شان[3] — جوشِ سودا اُن کا زلفِ پُرشکن کے ساتھ ہے

[1] مطلب پہلے دو شعروں کا یہ ہے کہ آج کل کے عاشقوں کا عشق بھی عقل سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہ اہلِ دل تو ہوتے ہیں یعنی دل میں محبت تو رکھتے ہیں مگر اُن کو اپنے تن بدن کا ہوش بھی رہتا ہے وہ پرانے زمانہ کے عاشقوں کی طرح گریبان اور دامن کو چاک نہیں کیا کرتے۔ محبت کا جنون اُن کو بھی ہوتا ہے مگر وہ اپنے لباس کو پھاڑا نہیں بلکہ سنوارا کرتے ہیں۔

[2] "آہوئے رعنائے دشتِ ہُو" ہُو کے جنگل کا خوش خرام ہرن۔ ہُو اللہ کا اسمِ ذات ہے۔ جیساکہ قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ هُوَ الْاٰخِرُ یعنی وہ اوّل ہے اور وہ آخر۔ دشتِ ہُو اصطلاحِ صوفیہ میں مقامِ لاہوت کو کہتے ہیں۔ یعنی جہاں سوائے ذات الٰہی کے ماسوا کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ختن ملک تاتار کا ایک علاقہ جہاں کا مشک مشہور ہے اور جہاں کے بعض ہرنوں کے نافہ سے مشک نکلتا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ آج کل کے عاشقوں کی نظریں دشتِ ہُو کے آہو پر نہیں بلکہ دشتِ ختن کے آہو پر رہتی ہیں۔ یعنی عشقِ الٰہی کے وہ قائل نہیں ہیں وہ تو صرف اُن معشوقوں سے عشق کرتے ہیں جن سے اُن کی خواہشاتِ نفس پوری ہوں۔ یا دنیاوی فوائد حاصل ہوں۔

[3] سنبل ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے جس کی پتیاں بڑی لمبی لمبی اور گھنی ہوتی ہیں۔ اس کو بال چھڑ بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پرانے لوگ تو سنبل سے بھی اُلجھ جاتے ہیں یعنی اُن کو سبز پتوں میں بھی نورِ الٰہی نظر آجاتا ہے اور وہ اُس پر عاشق ہو جاتے ہیں مگر نئے عاشقوں میں جوشِ عشق حسینوں کی پُرشکن زلف ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ نہیں تو کچھ نہیں باتیں ہی باتیں ہیں فقط
ہر زباں اپنے جدا طرزِ سخن کے ساتھ ہے

ہم نہ رہے جان رہ گئی

کیا پوچھنا ہے حکمتِ مغرب کا واہ واہ — فطرت بھی اُس کو دیکھ کے حیران رہ گئی
سمجھے تھے یہ کہ ایک ہیں ہم اور ہماری جاں[1] — دیکھا مگر کہ ہم نہ رہے جان رہ گئی

[1] مطلب یہ ہے کہ اہلِ مغرب کی یہ حکمت و عقلمندی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے ہم کو ہماری جان سے علیحدہ کر دیا یعنی ہم تو نہیں رہے مگر ہماری جان باقی رہ گئی حالانکہ ہم سمجھتے تھے کہ ہم اور ہماری جان دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ ہم نہیں ہوں گے تو ہماری جان بھی نہیں ہوگی اور ہماری جان نہیں ہوگی تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔ مگر ہوا یہ کہ انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے ہم کو یعنی ہماری اُن تمام قومی اور ملّی خصوصیات کو تو ختم کر دیا جن کی وجہ سے ہم ہم تھے صرف ہماری جان باقی رہ گئی اور وہ جان ایک ایسے قالب میں منتقل ہو گئی جس پر اُس ہم کا اطلاق نہیں ہو سکتا جس کا پہلے ہوتا تھا یعنی آج کل کے ہم وہ ہم نہیں رہے جو پہلے تھے۔

نئی اور پُرانی تعلیم

خاں صاحب اور خان ساماں صاحب

تم نے جو سُنا صحیح ہے ہاں صاحب — عربی سے گریز کرتے ہیں خاں صاحب
سچ کہتے ہیں وہ کہ ہم کو اس سے کیا کام — ہیں کیمپ میں[1] ہم تو خان ساماں صاحب

مغربی تعلیم کا اثر دِلوں پر

مغربی تعلیم سے دِل ایشیا کا ہے ملول — کر دیا خلقت کو اس نے بے تمیز و بے اُصول[2]
جو کرے اصلاح اس کی مدح کا ہے مستحق — اور باتوں کو بظاہر میں سمجھتا ہوں فُضول

سعدی کا بھتیجا اور ملٹن کا غلام

ماسٹر صاحب کا علم اِس وقت گو ہے نیک نام — اہلِ دانش میں مگر میرا فزوں ہے احترام
بات بالکل صاف ہے سمجھیں گی کچھ بھی نہیں — میں[3] ہوں سعدی کا بھتیجا وہ ہیں ملٹن کے غلام

---

[1] خان ساماں کے لفظی معنی ہیں گھر کا سامان کرنے والا۔ میر ساماں۔ آج کل انگریزوں کے بیرے یعنی خدمتگار کو کہتے ہیں۔ انگریزوں کے خان ساماؤں کو عربی سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

[2] یعنی انگریزی تعلیم سے نہ تو لڑکوں میں ادب و تمیز رہی نہ کسی اُصول کی پابندی۔

[3] سعدی کا بھتیجا ہونے سے مراد یہ ہے کہ سعدی میرے بزرگوں میں تھے۔ علاوہ ازیں مسلمان عام طور شیخ سعدی کو "چچا سعدی" بھی کہا کرتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ پرانے تعلیم یافتوں میں عام طور پر عقل اور سمجھ زیادہ ہوا کرتی تھی اور ملٹن کے غلاموں یعنی نئے تعلیم یافتوں میں علمی نمود و نمائش زیادہ ہوتی ہے۔

اسکولی قوم

اندازِ سلف[۱] کو یک قلم بھولی قوم — ہے سالک راہِ غیر معمولی قوم
جمعیتِ دین و دل سے کچھ کام نہیں — قومی اسکول ہے اور اسکولی قوم

تعلیم جدید کا فتنہ

تہذیبِ قدیم کے جب ارکان تھے چُست
مُلکی حالات سب رہے صاف و دُرست
تعلیم جدید نے کیا فتنہ بپا
اے بادِ صبا![۲] ایں ہمہ آوردۂ تُست

(۱) یعنی قوم بزرگوں کی راہ و رسم کو چھوڑ کر نئی نئی راہوں پر چل رہی ہے۔ اب نہ کسی کو دینی اتحاد و میل ملّت سے کام ہے اور نہ دل کے سکون و اطمینان کی فکر۔ قومی اسکولوں میں پڑھ کر جو قوم نکل رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی قوم نہیں بلکہ اسکولی قوم ہے۔ جس کے دل و دماغ میں سوائے اسکولی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے۔

(۲) یہ فارسی مصرع کسی مشہور فارسی شاعر کا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "اے صبح کی مشرقی ہوا یہ سب تیرا ہی لایا ہوا ہے" مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ملک میں جو سیاسی فتنہ و فساد برپا ہو رہے ہیں یہ سب تعلیم جدید کی وجہ سے ہیں اور تعلیم جدید چونکہ انگریزوں کی پھیلائی ہوئی ہے اس لئے فتنہ و فساد کے یہ بیج بھی خود انگریزوں ہی کے بوئے ہوئے ہیں۔ جب تہذیب قدیم کی ساری خوبیاں اور خصوصیات قوم میں موجود تھیں اُس وقت تک مُلک میں کوئی گڑبڑ نہیں تھی بلکہ ہر طرح امن و امان تھا۔

بے غیرتی اور بے بصیرتی

کیسا[۱] اسلام ان میں غیرت ہی نہیں — ایمان کہاں کہ جب بصیرت ہی نہیں
طرزِ تعلیم پر ہے لیکن الزام — وہ علم نہیں تو وہ طبیعت ہی نہیں

فارسی کے ساتھ اُردو بھی رخصت

اقبال کے ساتھ اے خرد تو بھی گئی — غیرت[۲] کے ساتھ مذہبی بُو بھی گئی
سچ کہتے ہیں حضرتِ کرامت[۳] اکبر — رخصت[۴] ہوئی فارسی تو اُردو بھی گئی

(۱) مطلب یہ ہے کہ جدید طرزِ تعلیم سے صرف یہی خرابی نہیں ہوئی کہ صحیح علم سے ہم محروم ہو گئے بلکہ ہمارے مذاق اور ہماری طبیعتیں بھی بدل گئیں۔ ہمارے دلوں میں وہ نور اور عرفان الٰہی کی بصیرت نہیں رہی جس سے ایمان کو تقویت پہنچتی ہے اور اسلام ہی ہم سے رخصت نہیں ہوا بلکہ اسلامی غیرت بھی ہم میں باقی نہیں رہی۔ یعنی اس کا احساس بھی نہیں رہا کہ ہم مسلمان کہلاتے اور مسلمان قوم میں سمجھے جاتے ہیں۔ ہم سے ایسی حرکات سرزدنہ ہونی چاہئیں جو براہِ راست ہماری اور بالواسطہ ہماری قوم کی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوں۔

(۲) حدیث قدسی ہے اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ۔ حیا اور غیرت بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ جب مسلمان میں حیا اور غیرت نہیں رہتی تو اُس کا ایمان اور مذہب بھی کمزور ہو جاتا ہے۔

(۳) کرامت سے مراد ہیں مولوی سید کرامت حسین کنتوری۔ بیرسٹر ایٹ لا الہ آباد و بانی "کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ"۔ بعد کو الہ آباد ہائی کورٹ کے جج بھی ہو گئے تھے۔ وفات ۱۹۱۷ء (از مولٰنا عبدالماجد صاحب دریا آبادی)

(۴) یعنی زبان فارسی جس کی بنیادوں پر اُردو کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اگر اُس کا پڑھنا پڑھانا مسلمانوں نے چھوڑ دیا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اُردو بھی ختم ہو گئی۔ یعنی اُردو کی اکثر و بیشتر ادبی خوبیاں ادب فارسی کی رہینِ منت ہیں۔ اور اُن کے برقرار رکھنے کے لئے فارسی جاننا بھی ضروری ہے۔

موجِ تسنیم کی بجائے وھسکی کی لہر

قسمت[1] وہ کہاں کہ اب وہ تقسیم نہیں — کیوں کر وہ اثر ہو جب وہ تعلیم نہیں

لغزش[2] پہ مری بُرا نہ مانو اے شیخ — وھسکی کی ہے لہر موجِ تسنیم نہیں

(لغزش: پیروں کا لڑکھڑانا — وھسکی: شراب — تسنیم: بہشت کی ایک نہر)

نہ بازوؤں میں قوّت نہ دِل میں نور

انگریز[3] میں عظمتِ جہانبانی ہے — ہم میں اک شانِ علمِ روحانی ہے

لیکن تم لوگ تو کسی میں بھی نہیں — بازو نہ قوی نہ قلب نورانی ہے

(جہانبانی: بادشاہی ـ حکومت)

[1] یعنی پہلے جن اخلاقی اقدار سے ہماری قسمت کو عروج ہوا تھا اور ہم نے قابلِ رشک ترقیاں کیں تھیں اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ اخلاقی خصوصیتیں ہمارے حصّے میں نہیں آتیں اور آج کل کی تعلیم سے وہ اثرات مترتب نہیں ہوتے جو قدیم تعلیم سے ہوا کرتے تھے۔ پھر ہم اپنی قومی حیثیت سے آج کل کیسے ترقی کر سکتے ہیں۔

[2] یعنی میری لغزشوں پر شیخ کو ناراض نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ لغزشیں شیخ کے کسی ایسے متبع کی نہیں ہیں جو بہشت کی آرزو اور خدا کا خوف دل میں رکھتا ہے بلکہ ایک نئی روشنی کے دلدادہ کی ہیں جو شراب کے نشہ میں مدہوش ہے۔

[3] یعنی انگریز اپنی حکومت اور حکومتی صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا میں ممتاز ہیں اور قدیم روش کے مسلمانوں میں ایک امتیازی علمِ روحانی کی شان ہے۔ یعنی اس نئے تعلیم یافتوں میں کوئی امتیازی خوبی نہیں ہے۔ نہ اُن کے پاس کوئی مادّی قوت و طاقت ہے اور نہ اُن کے دل میں روحانیت کا نُور۔

بے نُور کے تارے

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے — دنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے

لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا — پھر کیا تم عرش کے تارے بھی ہوئے

(ہمارے بھی ہوئے: ہماری طرف منسوب ہو کر ہمارا نام کو بھی چمکایا — نورِ طبع: دل میں روحانیت کا نور — عرش کے تارے: سب سے اونچے آسمان کے تارے یعنی بہت بڑے درجہ والے)

طلب عہدہ اور الفتِ وطن

تکمیل میں اُن علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف

لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں — عہدہ[1] مطلوب ہے وطن ہے مالوف

(نیچر: کائنات ـ قدرت — مکشوف: ہویدا ـ واضح — مالوف: پیارا ـ عزیز)

فونوگرافی تعلیم

طفلِ مکتب کہ سُخن ہا ز زباں می گوید — شکوہ کم کُن کہ چنیں گفت و چناں می گوید

طبعِ او فونوگراف[2] است و سرودش سبقش — آنچہ بستند برو نقش ہماں می گوید

(سرودش: اس کا نغمہ یا گیت)

[1] مطلب یہ ہے کہ اُن ہی علوم طبیعیہ کا حاصل کرنا انسان کے لئے مفید ہو سکتا ہے جن سے کائنات اور قدرت کی چھپی ہوئی طاقتوں کا انکشاف ہو اور ان علوم کا حاصل کرنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم سرکاری عہدے حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کے لئے علم و فنون حاصل کریں اور اُن کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں دنیا کے جس حصّہ میں بھی جانا پڑے وہاں جائیں۔ لیکن ہم تو سرکاری عہدوں کے بھوکے ہیں اور وطنِ عزیز کو چھوڑ کر باہر جانے، پردیس کی تکلیفیں اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

[2] فونوگراف Phonograph = آلۂ حافظ و ناشر الصّوت۔ یعنی جس کے ذریعہ سے آوازیں محفوظ بھی کی جاتی ہیں اور نشر بھی۔ مطلب یہ ہے کہ آج کل کے بچّوں کے متعلق یہ شکایت کرنا بے کار ہے کہ اُن کی زبان سے یہ کیوں نکلتا ہے یا وہ کیوں نہیں نکلتا۔ آج کل کے بچّوں کی مثال تو فونوگراف کی سی ہے۔ فونوگراف میں جیسی آوازیں بھری جاتی ہیں ویسی ہی اُس میں سے نکلتی ہیں۔ ہمارے بچے بھی اپنی عقل و شعور سے کام نہیں لیتے۔ اُستاد کے رٹائے ہوئے سبقوں کو دُہرا دیتے ہیں۔

مذاقِ قوم کو مذہب سے بیگانہ نہ ہونے دو

مسلمانوں میں اب تعلیمِ انگلش رُک نہیں سکتی | کسی سے مشرق و مغرب کی سازش (میل ملاپ یعنی مغرب پرستی) رُک نہیں سکتی
وہ[1] نزلہ رُک نہیں سکتا، یہ پیچش رُک نہیں سکتی | بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رُک نہیں سکتی

مذاقِ قوم بیگانہ (ناآشنا) نہ ہو اللہ اکبر سے
یہ نقشِ جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

گملوں ہی پر پھولنے والے لڑکے

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے | چند لڑکے ہیں مشن اسکول (مسیحیت کی تبلیغ کرنے والا اسکول) کے
بار آور پارک (باغیچہ) میں یہ ہوں گے کیا | گملوں[2] ہی پر رہ گئے ہیں پھول کے

---

[1] نزلہ زکام مشرق میں زیادہ ہوتا ہے اور پیچش مغرب میں۔ مشرق و مغرب کے ملاپ سے اہلِ مشرق کو نزلہ بھی ضرور ہوگا اور پیچش بھی۔ یعنی دماغ پر بھی اثر پڑے گا اور معدہ پر بھی۔ لیکن اس کے باوجود بڑے بوڑھوں میں یہ خواہش باقی رہے گی کہ قوم کا مذاقِ طبع کہیں ایسا نہ بگڑ جائے کہ وہ اللہ اکبر سے بیگانہ ہو جائیں اور خدا پرستی کا روح پرور نقش اُن کی لوحِ دل سے مٹ جائے۔

[2] یعنی آج کل جس کو قوم کہتے ہیں وہ کچھ طالبِ علم ہیں اور وہ بھی زیادہ تر مشن اسکول کے۔ اُن سے بڑے ہونے پر قوم کو فائدہ پہنچنے کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو اسکولوں اور کالجوں ہی میں اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہیں اور قوم کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں یا یہ کہ اُن کی بار آوری (فائدہ رسانی) کی قوت اسکولوں کے گملوں میں اُن کے پھولوں کے کھل جانے سے ختم ہو گئی ہے۔ پھولنا یا پھول جانا اُردو کا ایک محاورہ بھی ہے (جس کے معنی ہیں مغرور ہو جانا۔ اترانا۔ اور درختوں کا پھولنا اُن کے پھول دینے یا اُن میں پھول آنے کو بھی کہتے ہیں۔ جس پودے کو گملے میں پھول آ جانے کے بعد گملے سے زمین میں منتقل کیا جاتا ہے وہ اُس وقت تک پھل نہیں دیتا جب تک کہ اُس میں پھر پھول نہ آئیں۔

کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

ہم میں وہ خوبیٔ و نکوئی (نیکی) نہ رہی | پاکیزگی (پرہیزگاری) و خجستہ خوئی (نیک خصلتی) نہ رہی
تعلیمِ جدید سے ہوا کیا حاصل | ہاں[1] کفر کے ساتھ جنگ جوئی نہ رہی

ندوہ کو تو قبلہ رخ رہنے دو

کہنا مجھ کو جو کچھ ہے وہ کہنے دیں | دینی[2] علموں کی موج کو بہنے دیں
شبلی (مولانا شبلی نعمانی) کی دعا بتانِ مغرب (یعنی انگریزوں سے) سے یہ ہے | ندوہ[3] (ندوۃ العلماء) کو حضور قبلہ رُخ رہنے دیں

کاش ہم باپ اور کمیٹی میں آپ نہ ہوتے

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دامِ بلا (مصیبت کا جال) ہے | اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ[4] نہ ہوتے
یہ آپ کی برکت ہے کہ پیچیدگیاں ہیں | بہتر تھا کمیٹی میں اگر آپ[5] نہ ہوتے

---

[1] یعنی تعلیمِ جدید سے ہماری ساری اخلاقی خوبیاں اور بھلائیاں تو ختم ہو گئیں۔ صرف ایک چیز حاصل ہوئی جس کو مذہبی رواداری اور بے تعصبی کہا جاتا ہے یعنی اپنے مذہب کی محبت کے تقاضے سے ہم جو کفر سے نفرت رکھتے اور اُس کے خلاف بر سرِ پیکار رہا کرتے تھے۔ اب یہ جذبۂ مخالفتِ کفر ہمارے اندر نہیں رہا۔

[2] یعنی علومِ دینیہ کی درس گاہوں کے فیض کو جاری رہنے دیں۔

[3] یعنی علی گڑھ کی طرح ندوۃ العلماء میں مغربی مقاصدِ تعلیم کو داخل نہ کریں اور اُس کا مقصد یہی رہنے دیں کہ جو مسلمان اس درس گاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ مرکزِ اسلام اور مرکزِ قومیت سے نہ ہٹیں بلکہ اُس پر اور زیادہ مضبوطی سے قائم ہو جائیں۔

[4] یعنی ہم کو اپنی اولاد کی وہ تکلیفیں اور ابتر حالتیں نہ دیکھنی پڑتیں جن کے جدید تعلیم کی وجہ سے وہ شکار ہو رہے ہیں۔

[5] آپ سے مراد وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان لیڈرانِ قوم ہیں جو انگریزوں کی مشاورتی مجلسوں اور تعلیمی درس گاہوں کی منتظمہ جماعتوں کے ممبر ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں وہ حضرت اکبر کے نزدیک ایسے مسلمان ممبروں ہی کی وجہ سے ہوئی ہیں جو نئی روشنی کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور پرانی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔

دیوبند، ندوہ اور علی گڈھ

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبندؔ[1] | اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
ہاں علی گڈھ کی بھی تم تشبیہہ لو | اِک معزز پیٹ بس اُس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز | گوکہ فکرِ آخرت ہے اصل چیز

[1] دیوبند ہندوستان کے صوبۂ یو۔پی کے ضلع سہارنپور کا ایک مشہور قصبہ ہے جہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی وغیرہ علمائے مسلکِ قدیم کا ایک مذہبی دار العلوم ہے۔ ندوہ کے معنی انجمن کے ہیں یہاں مراد ندوۃ العلماء سے ہے۔ اس نام سے عربی اور مذہبی تعلیم کا ایک ادارہ مولانا محمد علی مونگھیری اور مولانا شبلی وغیرہ نے ۱۹۰۱ء میں قائم کیا تھا اور جس کا مقصد عربی اور دینی نصاب و طریقۂ تعلیم میں ایسی اصطلاحات کا جاری کرنا تھا جن سے اس درس گاہ کے تعلیم یافتہ عربی زبان بے تکلفی سے بول سکیں اور لکھ سکیں اور دینی معاملات میں وہ بالکل پرانی لکیر کے فقیر ہی نہ بنے رہیں بلکہ اپنی سمجھ بوجھ اور روشن خیالی سے کام لے سکیں۔ علی گڈھ سے مراد سر سید احمد خاں کا قائم کردہ علیگڈھ کالج ہے جو اب یونیورسٹی ہوگئی ہے۔ اور جس کے قائم کرنے کا مقصد زیادہ تر مسلمانوں کو اعلیٰ سرکاری نوکریاں دلوانا اور ملک میں اُن کی قومی اور سیاسی پوزیشن کا قائم کرنا تھا۔ حضرتِ اکبر کہتے ہیں کہ دیوبند کو دلِ روشن کہنا چاہئے۔ ندوہ کو زبانِ ہوشمند۔ اور علی گڈھ کو "ایک معزز پیٹ" یعنی دیوبندی علماء کے دلوں میں تو خدا ترسی اور روحانیت کا نُور ہوتا ہے۔ اور ندوی علماء باتیں بڑی سمجھداری کی کرتے ہیں اور علیگڈھ مسلمانوں کو معزز نوکریاں دلواتا ہے یعنی اُن کے لئے عزت سے پیٹ پالنے کا انتظام کرتا ہے۔ آخری شعر میں فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ پیٹ کا فکر سب سے مقدم ہے اور اس لحاظ سے مذکورہ تینوں درس گاہوں میں علیگڈھ کو فوقیت حاصل ہے۔ لیکن زندگی کا مآل کار اور مقصدِ خلقتِ انسانی محض پیٹ بھرنا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد دار الجزا یعنی آخرت کی تیاری کرنی ہے اور اصل چیز جب آخرت ہے تو دیوبند اور ندوہ کا درجہ جہاں مسلمانوں کی محض دنیا ہی کو نہیں بلکہ اُن کی عاقبت کو بھی درست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علی گڈھ سے بڑھا ہوا ہے۔

تعلیم بازاری عقل سرکاری

اُس چیز کا کیا کہنا اکبر تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا ہموار کیا [یعنی ہم مذاق و ہم خیال کیا] اور ایک کیا
جو قوم کو ابتر کرتے ہیں اب اُن اثروں [نتائج] پر رونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے معلوم نہیں کیا ہونا ہے
تعلیم جنھوں نے پائی ہے وہ بد تو نہیں ہیں بے حس [یعنی احساس قومیت نہیں رکھتے] ہیں
دعوے جو ہیں رسم و مذہب کے سب اُن کے یہاں سے ڈسمس[1] ہیں
کیوں دولت و قوّت کی ہے کمی اِس کے تو سبب پیچیدہ ہیں
کچھ[2] اس کو سمجھ سکتے ہیں وہی بوڑھے جو زمانہ دیدہ [تجربہ کار] ہیں
لیکن جو یہ سوشل [تمدنی و معاشرتی] آفت ہے طوفان بپا ہے فتنوں کا
بے مہریٔ [بے مروتی] ملّت کی یہ ہوا اِک قہر [غضب و مصیبت] ہے جس کا ہر جھونکا

[1] ڈسمِس لفظ انگریزی Dismiss بمعنی برخاست کرنا' یا عدالت کا کسی نالش کو خارج کرنا یعنی دعوے کو ناقابلِ دادرسی سمجھنا۔ مطلب یہ ہے کہ مذہب و قومیت کے نام پر جو درخواستیں اُن سے کی جاتی ہیں اُن کو وہ قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ آج کل قوم میں دولت و قوت کی جو کمی ہوتی چلی جا رہی ہے اُس کے اخلاقی اور اقتصادی اسباب پیچیدہ ہیں جو آسانی سے نئی نسلوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ البتہ جو بوڑھے لوگ ایسے موجود ہیں جنھوں نے قومی عروج کا زمانہ بھی دیکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا سبب اپنی حکومت کا نہ ہونا ہے اور مرکزِ قومیت سے روگردانی کرنا ہے۔

اس کا جو سبب ہے سُن لو اُسے سب پردہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں یہ مطلعِ اکبر حاضر ہے

تعلیم[1] جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

کالج کا کا کا تُوا

نہ تیر افگنی (تیر اندازی) ہے نہ اب حکمرانی (صلاحیت حکومت) | نہ وہ وضعِ ملّت (طرز طریق) نہ قرآن خوانی
نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی | یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی (یعنی پرانے زمانہ کی بھولی عورتیں)
ہر اک شاخ میں پاس یہ اے بُوا ہے | مرا لال[2] کالج کا کا کا تُوا ہے

[1] اِس شعر کو پہلے تین شعروں کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپس کی بے مہری و بے مروّتی کی وجہ سے تمدّنی اور معاشرتی فتنوں کا جو طوفان آج کل ہماری قوم میں بپا ہے اُس کے اسباب .... واضح ہیں اور وہ یہ ہیں کہ تعلیم جو ہم کو دی جا رہی ہے وہ بازاری ہے یعنی شریفوں کی سی نہیں بلکہ اوباشوں کی سی ہے۔ اِس تعلیم سے شریفانہ نہیں بلکہ اوباشی خصائل پیدا ہوتے ہیں اور عقل جو ہم کو سکھائی جا رہی ہے ہماری اپنی عقل نہیں بلکہ سرکاری عقل ہے تاکہ ہم ہر ایک بات کو اپنی نظر اور اپنی عقل سے نہیں بلکہ سرکاری نظر اور سرکاری عقل سے دیکھیں۔

[2] لال پیارے لڑکے کو کہتے ہیں اور لال سُرخ چونچ کا ایک مشہور پرندہ بھی ہوتا ہے۔ کا کا تُوا ایک قسم کا سفید رنگ کا بڑا طوطا ہوتا ہے۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ جو لڑکے اسکولوں اور کالجوں سے پاس ہو کر نکل رہے ہیں اُن میں نہ کوئی مادّی قابلیتیں ہیں اور نہ مذہبی و روحانی۔ نہ وہ ہتھیاروں کا اِستعمال جانتے ہیں نہ حکمرانی کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اطوار و خصائل اُن کے مسلمانوں کے اطوار و خصائل سے مختلف ہیں۔ نہ نماز روزہ کے پابند ہیں نہ تلاوت قرآن کے عادی۔ نہ اُن میں بڑوں کا ادب ہے نہ چھوٹوں پر شفقت و مہربانی۔ مگر یہ دیکھ کر کہ اُنھوں نے بہت سے امتحانات پاس کر لیئے ہیں بھولی بھالی عورتیں اُن کو محبت اور فخر سے کا کا تُوا کہا کرتی ہیں۔

احیاءِ زبانِ سنسکرت

زبانِ سنسکرت (ہندوؤں کی قدیم مذہبی زبان) اِس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے | کہ اچھا ہے مری الفت تمھارے دِل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلاشک تم اگر مجھ کو جِلاؤ گے | مگر وہسکی[1] (شراب) پلاؤ گے کہ گنگا جل (گنگا کا پانی) پلاؤ گے
جیوں[2] گی میں کہ پھر تم کو مِلاؤں دیوتاؤں سے | بھڑاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے
اگر شوقِ عبادت[3] ہے تو میں موجود ہوں اب بھی | اگر دنیا کا سودا ہے تو کب میں اس سے راضی تھی

غل مچانے والوں کے اُستاد تو آپ ہی ہیں

پیدا[4] جو ہوئے یہ غُل مچانے والے | دل اُن کا نہیں ہیں ہم بڑھانے والے
لیکن بہ ادب کریں گے یہ عرض کہ ہیں | اِس فن کے حضور ہی سکھانے والے

[1] یعنی میرے زندہ ہونے کے بعد مجھے زندہ رکھنے کے لیئے تم مجھے انگریزی شراب پلاؤ گے یا گنگا جل۔ یعنی مجھ سے مغربی تہذیب کے فروغ دینے کا کام لو گے یا ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کے فروغ دینے کا۔

[2] یعنی کیا تم مجھے اپنے قدیم دیوتاؤں سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بناؤ گے یا اپنی دنیاوی مصیبتوں کا مجھ سے ہی مقابلہ کراؤ گے یعنی مجھ کو محض اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیئے استعمال کرو گے۔

[3] یعنی اگر اپنی مذہبی محبت اور اپنے عبادت کے شوق سے تم مجھے زندہ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو لیکن اگر دنیا کی محبت میرے زندہ کرنے کی محرک ہوئی ہے تو میں اس سے نہ پہلے خوش تھی نہ اب خوش ہوں۔ میں ایسی زندگی سے باز آئی۔

[4] یعنی انگریزوں کے خلاف شورشیں کرنے والے جو نوجوان پیدا ہوئے ہیں ہم اُن کی شورشوں کو اچھا تو نہیں سمجھتے اور نہ اُن کی ہمت افزائی کرنا چاہتے ہیں لیکن انگریزوں سے بہ ادب ضرور عرض کریں گے کہ جنابِ والا شورش اور ایجی ٹیشن کا یہ فن تو ہمارے نوجوانوں کو آپ ہی نے سکھایا ہے ورنہ ہماری تہذیب تو یہ سکھاتی ہے کہ بزرگوں کا ادب اور حاکموں کی اطاعت کی جائے۔

علیگڈھ کالج

اور

سرسیّد

سِرُّلِاَبِیہٖ کی بجائے سِرٌّ لِلماسٹر

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا — قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایا
کہتے[1] تھے ولد کو لوگ سِرٌّ لابیہٖ — سِرٌّ للماسٹر کا اب وقت آیا

تحصیلِ عُلوم کا نتیجہ مفلسی وگمنامی

جو لوگ طرف دار علی گڈھ کے رہیں گے — اس دور میں بیشک وہی بڑھ چڑھ کے رہیں گے
مفلس[2] رہیں گمنام رہیں خیر جو کچھ ہو — کالج کے یہ سب علم تو ہم پڑھ کے رہیں گے

پھُول کا پودا نہیں گلدان کا گُلدستہ

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے — مضمون لطیف وخوب و برجستہ ہے
پودا[3] نہیں پھول کا علی گڈھ کالج — گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہے

---

[1] عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ" یعنی بیٹا اپنے باپ کی خصلت پر ہوتا ہے۔ لیکن آج کل کے لڑکوں کا اُٹھان باپ کے رنگ پر نہیں بلکہ ماسٹروں کے رنگ پر ہوتا ہے۔ یعنی آج کل کے بچوں پر بجائے خاندانی اور خونی رنگ چڑھنے کے انگریزی اسکولوں کے ماسٹروں کا اور اُن کی تعلیم کا رنگ چڑھتا ہے۔

[2] یعنی نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔ ہم مفلس وگمنام ہی کیوں نہ رہیں مگر کالج کے سب امتحانات ضرور پاس کریں گے۔

[3] یعنی علی گڈھ کالج کو پھول کا پودا یا درخت نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ تو ایک گلدان ہے جس میں مسلمانوں کے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی قوم کے اِس تعلیمی ادارہ کی خوش نمائیاں محض دیکھنے دکھانے کی ہیں۔ ان میں اصلی قومی زندگی نہیں ہے۔

خود فروشی کے بغیر ہی انمول ہو گئے

واہ اکبر بس مقیمِ کول ہو کر رہ گئے — خود[1] فروشی کی نہیں انمول ہو کر رہ گئے
(علیگڑھ کا پرانا نام) (بیش قیمت)

عرضِ وطولِ ہند میں تم نے نہ دوڑائے خطوط — دل کشی مرکز میں پائی گول ہو کر رہ گئے
(مراد وسیع خطہ ہند چوڑائی لمبائی) (یعنی علی گڈھ) (خاموش ہو کر بیٹھ گئے)

چندہ کی مسلمانی

اب[2] کہاں تک بُت کدے میں صَرفِ ایماں کیجئے — تاکجا عشقِ بُتاں میں سُستِ پیماں کیجئے
(یعنی کب تک ایمان کو خراب) (قائم کیا ہوا ازلی عہد)

ہے یہی بہتر علی گڈھ جا کے سیّد سے کہوں — مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے
(مراد سر سیّد احمد خاں)

---

[1] ان اشعار میں اُن لیڈرانِ قوم پر طعن ہے جنھوں نے اپنی لیڈری کے دائرہ عمل کو صرف علی گڈھ کالج کی تعمیر و ترقّی ہی تک محدود کر رکھا تھا اور جو مرکزِ قومی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے بغیر کسی ایثار و قربانی کے مسلمانانِ ہند کے بڑے اور مشہور لیڈروں میں شمار کئے جانے لگے تھے۔ حالانکہ اُنھوں نے کبھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ مُلک کے دُور دراز حِصّوں کا دَورہ کریں بلکہ اگر کبھی کوئی ایسی ضرورت پیش بھی آئی تو گول ہو کر رہ گئے یعنی اُس کو ٹال گئے۔

[2] مطلب غالباً یہ ہے کہ میں نے خدا پر بھروسہ چھوڑ کر اور اُس سے بندگی کا جو عہدِ ازل میں کیا تھا اُسے بھول کر انگریزوں کی محبت اور اُن کی جبہہ سائی تو بہت کرلی۔ اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں علی گڈھ جاؤں اور سر سیّد کو چندہ دے کر مُسلمان ہو جاؤں۔ یعنی دنیادی مقاصد پورے کرنے کے لئے براہِ راست انگریزوں کی خوشامد درآمد سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ میں سر سید کے متبع مسلمانوں میں ہو جاؤں اور یہ مقصد علی گڈھ کالج میں چندہ دینے سے بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔

پرانی روشنی بالائے طاق

نیض کالج سے جوانی رہ گئی بالائے[1] طاق — امتحاں پیشِ نظر اور عاشقی بالائے طاق
(یعنی بھلا دی گئی) (یعنی عاشقی ختم ہوگئی)

وہ چراغوں[2] سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر — کہتے ہیں رکھئے پُرانی روشنی بالائے طاق
(نفرت کرنے) (یعنی زیرک و دانا جن کا دل روشن ہو)

قوم کے عشق میں ایک ہی دُھن

واہ اے سیّد پاکیزہ گہر کیا کہنا — یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا
(عالی نسب)

قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا — ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا
(دھیان، شوق)

یورپ کی پیری کے آگے کچھ نہ چلی

پاؤں[3] کو بہت جھٹکا پٹکا زنجیر کے آگے کچھ نہ چلی — تدبیر بہت کی اے اکبر تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی
(یعنی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی)

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا سیّد کو مرید بنا ہی لیا — سب پیروں سے تو وہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی
(مراد سرسیّد)

---

[1] بالائے طاق رہنا بمعنی بھول جانا، بھلا دینا اور بالائے طاق رکھنا بمعنی ختم کر دینا، تعلّق نہ رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ علی گڈھ کالج سے جو فیض قوم کو پہنچے اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ نوجوانوں میں جوانی کے ولولے باقی نہیں رہے اور امتحان کی تیاری میں وہ ایسے مشغول ہوئے کہ عشق عاشقی بھی اُن کی ختم ہو گئی۔

[2] یعنی نوجوانوں کے دِلوں اور دماغوں میں نئی روشنی کچھ ایسی بس گئی ہے کہ وہ پرانی روشنی سے نفرت کرنے اور اُس کو بالکل غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں۔

[3] یعنی انگریزوں کی غلامی قسمت میں لکھی تھی اُس سے بچنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ سر سید جیسے عالی دماغ بھی جو کسی پیر کے پھندے میں نہیں پھنسنے تھے وہ بھی انگریزوں کے مرید ہو گئے اور اُن کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

جاگو ضرور مگر اللہ کا نام لے کر

سیدؔ[1] صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور (بیدار مغزی) — کہتا نہیں تم سے میں کہ ہو اُس سے نفور (نفرت کرنے والا، بیزار)
سوتوں کو جگا دیا اُنھوں نے لیکن — اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

نہ پڑھنے کا کوئی اُصول نہ بڑھنے کی کوئی راہ

سُنتا[2] نہیں کچھ کسی سے بڑھ بڑھ کے سوا — کہتا نہیں کوئی کچھ بھی پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول بڑھنے کی نہ راہ — اور قبلہ کوئی نہیں علی گڈھ کے سوا

کانگریس اور سر سیدؔ

بات[3] سید کی کچھ ایسی تھی کہ جس نے اُس کو — کاٹنا چاہا (رد کرنا) زمانے میں وہ بس آپ کٹا (یعنی شرمندہ و ذلیل ہوا)
کہتے پھرتے ہیں یہ اب کانگرسی (کانگریسی خیال والے) ہر سُو — مر گیا کول (علی گڈھ کا پرانا نام) کا بوڑھا (یعنی سرسید) یہ چلو پاپ کٹا (مصیبت سے نجات ملی)

[1] یعنی سرسید نے جو سوتی ہوئی قوم کو جگایا اور اُس کے اندر روشن خیالی اور بیدار مغزی پیدا کی ہے وہ بھی قوم کے لئے مفید ہو سکتی ہے بشرطیکہ جاگنے والے خدا کا نام لے کر جاگیں یعنی جاگنے اور ہوش میں آنے کے بعد خدا سے بے تعلق نہ ہو جائیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ ہر ایک قومی لیڈر یہی کہہ رہا ہے کہ بڑھو بڑھو (ترقی کرو) اور پڑھو پڑھو۔ لیکن نہ تو تعلیم کسی صحیح اصول پر دی جا رہی ہے اور نہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے لئے کوئی راستہ ہے۔ سب نے خدا اور رسول کے قبلہ کو چھوڑ کر علی گڈھ ہی کو قبلہ بنا لیا ہے۔ یعنی کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ خدا اور رسول کے احکام اور اُن کی مرضی کیا ہے۔ جو ہدایات علیگڈھی لیڈروں کی طرف سے جاری ہوتی ہیں سب اُنہی پر عمل کرتے ہیں۔

[3] یعنی سرسید کی باتیں ایسی وزن دار اور مدلل ہوتی تھیں کہ مخالفوں کو اُن کے مقابلہ میں مُنھ کی کھانی پڑتی تھی۔ اِس لئے سرسید کے انتقال پر اُن کے مخالف خوشیاں منا رہے ہیں کہ اس عالی دماغ بوڑھے کی مخالفت سے اُن کو نجات مل گئی۔

ارکانِ لیگ میں تخصیصِ علیگ

کمیٹی میں جتنے ہیں ارکانِ لیگ (مراد مسلم لیگ) — بفضلِ خدا سب ہیں میرے کلیگ (ساتھی)
مگر اُن سے ہے مجھ کو تخصیصِ خاص (تعلقِ خصوصی) — کہ ہے[1] نام کے ساتھ جن کے علیگ

علی گڈھ کالج، لندن کی مسجد

بزرگانِ ملّت نے کی ہے توجہ — کمی پر رہیں گے نہ عالم نہ عابد (عبادت کرنے والے)
ترقیِٔ دیں ہوگی اب روز افزوں — علی[2] گڈھ کا کالج ہے لندن کی مسجد

آپ نے اپنے باپ سے سیکھا ہے میں نے آپ سے

کر چکا کالج میں جب تکمیلِ فن — تب یہ بولے مجھ سے مسٹر ماریسن[3]

[1] علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ اپنی تعلیمی ڈگریوں کے ساتھ "Alig" بھی لکھا کرتے ہیں جو علی گڈھ کی انگریزی املا کا مخفف ہے۔

[2] یعنی مسلمانوں کو عالم بنانے کے لئے علی گڈھ کالج تو تھا ہی اب اُن کو عابد بنانے کے لئے بزرگانِ ملّت کی توجہ سے لندن میں ایک مسجد بھی بن گئی ہے۔ جب قوم میں عالم بھی ہوں گے اور عابد بھی، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین میں روز افزوں ترقی نہ ہو۔ یہ سب طنز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لندن کی مسجد بھی جن قومی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر تعمیر ہوئی ہے اُن سے عابد بھی ویسے ہی پیدا ہوں گے جیسے کہ علی گڈھ کالج سے عالم پیدا ہو رہے ہیں۔ اور دین کی ترقیاں بھی اُسی رُخ پر ہوں گی جس رُخ پر دنیاوی ترقیاں ہو رہی ہیں۔

[3] Mr. Morrison. بھی علی گڈھ کالج کے ایک مشہور انگریز پرنسپل تھے۔

گو کہ شُہرت ہے تمھاری دُور دُور / مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل وشعور[2]
عرض کی میں نے کہ اے روشن ضمیر / ہے یہی تو جس کو روتا ہے بشیر[1]
آپ[2] نے سیکھا ہے اپنے باپ سے / اور میں نے جو پڑھا وہ آپ سے

پھُولنے تو لگے تھے پھَلے نہیں

سرسید کو فلک نے تننے[3] نہ دیا / تہذیب کو پھر دوبارہ چلنے نہ دیا
ملّت کی شکست میں مدد دی کامل / بننے لگی قوم جب تو بننے نہ دیا
گھر[4] میں ہمیں چرخ نے ٹہلنے نہ دیا / باہر کی طرف چلے تو چلنے نہ دیا
کالج[5] نے بٹھا دیا جو مانندِ شجر / کچھ پھُول چلے تھے اُس نے پھَلنے نہ دیا

۱ یعنی خان بہادر مولوی بشیر الدین صاحب اخبار البشیر اٹاوہ کے مشہور ایڈیٹر اور علیگڑھی تحریکات کے ایک مخلص نکتہ چیں۔
۲ یعنی مسٹر مارِسین کے علیگڑھی شاگردوں میں اُن کا سا فہم وشعور کیسے پیدا ہو سکتا تھا کیونکہ مسٹر مارِسین کے اُستاد تو اُنہی کی قوم کے اور اُن کے دل سے ہمدرد تھے اور علیگڑھی شاگردوں کے اُستاد مسٹر مارِسین ایک غیر قوم ہی کے نہیں بلکہ ایسی غیر قوم کے ہیں جو حکمراں ہے اور جو ہندوستانیوں کی تعلیم میں بھی اپنی حکمرانی کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھتی ہے۔
۳ تننا یعنی سیدھا ہو کر بیٹھنا۔ اکبر کا مطلب یہ ہے کہ زمانے نے سرسید کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ آزادی کے ساتھ قوم کی تہذیب و اصلاح کرتے جب تک سرسید کی رہنمائی میں قوم بگڑتی رہی زمانہ بھی سرسید کا ساتھ دیتا رہا مگر جب سرسید کو یہ احساس پیدا ہوا کہ قوم بگڑ رہی ہے اور انھوں نے اپنی رہنمائی کا رُخ بدلنے کی ضرورت محسوس کی تو موت نے اُن کو اس کی مہلت نہیں دی۔
۴ یعنی انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے نہ تو ہم اپنے ملک میں ہاتھ پاؤں چلا سکے اور نہ ہم کو اس کی اجازت دی گئی کہ ہم دوسرے ملکوں میں جا کر کچھ حاصل کریں۔
۵ یعنی علی گڑھ کالج کی تعلیم سے ہماری قومی ترقی کا درخت اُگ تو آیا تھا اور کچھ پھُولنے بھی لگا تھا مگر انگریزوں نے اپنی مصلحتوں کی وجہ سے اُسے پھَلنے نہ دیا۔ یعنی نمائشی فائدہ تو قوم کو علی گڑھ سے حاصل ہوا مگر کوئی ایسا فائدہ حاصل نہ ہوا جس سے قوم بنتی اور اُس میں قوت پیدا ہوتی۔

حضرتِ سیّد دے گئے مذہب میں لوچ

دیکھ[1] کاریگریٔ حضرتِ سیّد اے شیخ / دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح
بحرِ[2] ہستی کا یہی دَور چلا جاتا ہے / برف کی طرح جمے بہہ گئے پانی کی طرح

خدمتِ سرسیّد میں حاضری

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات / افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے[3] کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے / میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

حکّام کی عیسیٰ نفسی سے اعضاء کالج کی زندگی

اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں / جو اہلِ نظر ہیں شرمندہ ہیں
حکّام کی ہے یہ صرف عیسیٰ نفسی[4] / اعضاء کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں

۱ یعنی سرسیّد کی یہ ایک قومی کاریگری ہے کہ اُنھوں نے مذہب اسلام کو ایک ایسے رنگ میں پیش کیا کہ ہر شخص اُس سے اپنے مذاق اور اپنے مقصد کے مطابق کام لے سکے اور اُس کو آسانی سے گھٹایا بڑھایا جا سکے۔ کمانی لچکدار لوہے کے اُس پُرزے کو کہتے ہیں جس کو اُبھارا اور دبایا یا پھیلایا اور سمٹایا جا سکے۔
۲ یہ شعر پہلے شعر سے مربوط نہیں ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایک حال پر قائم نہیں رہتی کبھی ترقی کر کے برف کی طرح جم جاتی ہے اور کبھی زوال میں آ کر پانی کی طرح بہہ جاتی اور فنا ہو جاتی ہے۔
۳ یعنی سرسیّد سے یہ سُنتے ہی کہ تجھ کو دین کی اصلاح کرنی چاہیئے میں آداب عرض کر کے اُن کے پاس سے چلا آیا کیونکہ میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ سرسیّد مجھ کو کس قسم کی نصیحتیں کریں گے۔ اور میں دین کی اصلاح کو بے دینی سمجھتا ہوں۔
۴ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ معجزانہ طاقت جس سے وہ پھُونک مار کر مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے مطلب یہ ہے کہ قوم میں زندگی کے آثار تو باقی نہیں رہے۔ کالج کے کچھ نوجوان جو زندہ نظر آتے ہیں وہ محض اس وجہ سے زندہ ہیں کہ انگریز اُن کو مارنا نہیں چاہتے۔

نبیوں میں کوئی پنشن یافتہ نہیں ہوا

عقلِ[۱] سید بود از انوارِ حکمت بافتہ | زورِ بازوئیش عدو را پنجہا برتافتہ
مشکلے در پیش ہست او را اگر گویم نبی | ز انبیا ہرگز کسے نگذشت پنشن یافتہ

بُت خانہ کو اپنا کرلیا

دورِ[۲] گردوں نے اُبھارا دَیر کو سچ ہے مگر | یہ نہ کہئے حضرتِ سیّد نے پھر کیا کرلیا
اُن نگاہوں سے کہ جو تھیں خوگرِ طوفِ حرم | آفریں کہئے کہ بُت خانہ کو اپنا کرلیا

۱؎ ترجمہ و توضیح:۔ سرسید کی عقل حکمت کی شعاعوں سے بُنی ہوئی تھی۔ یعنی سرسید نہایت روشن دماغ اور عقل کے پتلے تھے۔ ان کے زورِ بازو نے دشمن کے پنجوں کو موڑ رکھا تھا یعنی اُن کی عالی دماغی نے اُن کے دشمنوں کو زیر کر رکھا تھا (پنجہ لڑانا ایک ورزشی مقابلہ ہے جس میں ہار جیت حریف کا پنجہ موڑ دینے سے ہوتی ہے) اگر میں کہتا ہوں کہ سرسید نبی تھے تو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ انبیاء میں سے اب تک کوئی پینشن Pension بمعنی وظیفہ بمعاوضۂ خدماتِ سابقہ) پانے والا نہیں ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ سرسید میں بہت سے قابلِ قدر کمالات اور غیر معمولی قابلیتیں تھیں۔ مگر اُن میں یہ ایک بڑی کمزوری بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے اس لئے وہ دینی قابلیتوں اور عقلمندیوں کو آزادی کے ساتھ استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ غیر اللہ کا وظیفہ خوار ہونا چونکہ انسان کی آزاد خیالی و آزادی میں مخل ہوا کرتا ہے اس لئے آج تک کوئی پنشن خوار انسان نبی نہیں ہوا۔

۲؎ یعنی یہ صحیح ہے کہ انقلابِ زمانہ نے کلیسا کو (یعنی کلیسا کے ماننے والے عیسائیوں کو) عروج پر پہنچا دیا لیکن سرسید کی یہ قابلیت بھی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے اپنی اُن نظروں سے جو طوافِ حرم کی عادی تھیں یعنی جن کو بچپن سے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وابستگی رہی تھی کلیسا یعنی انگریزوں کو اپنا مخالف نہیں بننے دیا بلکہ دوست بنالیا۔

سرسیّد بڑے کام کرنے والے تھے

ہماری باتیں[۱] ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا | نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ | خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

پڑھے لکھے مسلمانوں میں جنگ

علی گڈھ[۲] میں حریفانہ ترنگیں | پڑھے لکھے مسلمانوں میں جنگیں
ہمیں تو کر رہی ہیں سخت مایوس | تمھیں کو ہوں ترقی کی اُمنگیں

۱؎ یعنی ہم محض باتیں بناتے ہیں کام نہیں کرتے۔ سرسید کی خدماتِ قومی اور کارگزاریوں کا جو پُرخلوص اعتراف ان اشعار میں کیا گیا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اکبرؔ سرسید کے قومی مقاصد اور سرگرمیوں سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود سرسید مرحوم کی علمی قابلیتوں اور اُن کی پُرخلوص کارگزاریوں کی بہت قدر کرتے تھے اور اپنی تقویٰ شعاری سے مخالفوں کے متعلق بھی عدل و انصاف کی رائے کا اظہار کرنے میں تامل نہیں فرماتے تھے۔

۲؎ یہ قطعہ غالباً علی گڈھ کالج کے طالب علموں کے باہمی جھگڑے کی اطلاع ملنے پر لکھا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایسے مخالفانہ جھگڑوں کا ہونا اُن تمام اُمیدوں کو خاک میں ملا دیتا ہے جو اس کالج سے قوم کی ترقی ہونے کے متعلق نئی روشنی کے مسلمانوں نے قائم کر رکھی ہیں۔

تقلید فرنگ

صرف نقالی

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے — بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی[1] — یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

دن کو کچہری کی مسلیں، رات کو تاریخ اسلام

جو کام تھا گھنٹے کا نکلتا ہے وہ پل سے[2] — خوش کیوں نہ رہیں لوگ فرنگی کے عمل سے
تاریخ تو خالد[3] کی پڑھو رات کو گھر پر — اور دن کو کچہری میں دبو نیل کمل سے

دل آگیا نٹن پر

اس درجہ جھک پڑے ہیں وہ بیف پر مٹن پر[4] — ہے بار پیٹ ان کا پتلون کے بٹن پر
صورت پہ اور نسب پر ترجیح دی ہنر کو — کس بل جو اس کے دیکھے دل آگیا نٹن پر[5]

---

[1] یعنی ہندوستانیو! تم یورپینوں کی وضع قطع اور طرز بود و ماند کی نقالی تو کر رہے ہو مگر کیا تمہاری خلقت و فطرت بھی یورپی خلقت و فطرت سے بدل سکتی ہے۔ اگر نہیں بدل سکتی اور ایک مشرقی مغربی نہیں ہو سکتا تو پھر اس ظاہری نقالی سے کیا فائدہ۔

[2] یعنی اہل مغرب کی ایجاد کردہ مشینوں سے گھنٹوں کا کام پلوں میں نکل آتا ہے اس لئے فرنگیوں سے ہم لوگ کیوں نہ خوش رہیں۔

[3] یعنی حضرت خالد ابن ولید جو رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی اور اسلام کے ایک بڑے بہادر اور مشہور جرنیل اور فاتح تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے معزول کر دیا تھا۔

[4] یعنی حد سے زیادہ بیف اور مٹن کھانے سے ان کی توند اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پتلون کا بٹن نہیں لگتا یا پتلون ان کی موٹی توند پر بری معلوم ہوتی ہے۔

[5] یعنی مغربی روشنی کے نوجوان نہ صورت کو دیکھتے ہیں نہ حسب نسب کو ظاہری اور بازیگرانہ ہنروں کو دیکھ کر نٹنیوں تک پر عاشق ہو جاتے ہیں۔

نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے ہوئے

رسوا وہ ہوا جو مستِ پیمانہ ہوا
لپکا جو ہیائے پر وہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ[1] سے اپنا دل جو لایا نہ درست
محروم اُدھر اِدھر سے بیگانہ ہوا

یورپی قال کا جال

سوچو کہ آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے
دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا دھرا ہے[2]
ہُشیار رہ کے پڑھنا اِس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے

شوقِ ترقّی سببِ تباہی

نہ راجگی کا مجھے شوق ہے نہ شاہی کا
اگرچہ میں بھی ہوں طالب مگر خدا ہی کا
یہ وعظِ مغرب اور اِس کا اثر یہ مِلّت پر[3]
بنا ہے شوقِ ترقی سبب تباہی کا

[1] مطلب یہ ہے کہ انگلستان میں رہنے یا تعلیم حاصل کرنے سے جن کے دلوں اور عادتوں میں ناپسندیدہ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ وہاں کے قیام کے مقاصد میں ناکام رہتے اور نامراد واپس آتے ہیں اور اپنے وطن سے بیگانہ ہو جاتے ہیں یعنی اپنی وطنی معاشرت اُن کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اگر شراب پی کر بدمستیاں کرتے ہیں تو رسوا و ذلیل ہوتے ہیں اور اگر کسی یورپین لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر بے سوچے سمجھے اُس سے شادی کر لیتے ہیں تو بیوی ایسا ناک میں دم کرتی ہے کہ دیوانے ہو جاتے ہیں۔

[2] یعنی محض یورپ کے بڑے لوگوں کی تحریرات اور اقوال کو پڑھ کر اپنے مستقبل کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرو بلکہ ماضی اور حال کی حالت کا موازنہ کر کے دیکھو کہ پہلے تمھارے گھروں میں کیا تھا اور اب کیا ہے اور اُسی موازنہ سے اندازہ کرو کہ آئندہ تمھارا کیا حشر ہونے والا ہے۔

[3] یعنی جو لوگ مغربی ترقیوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کو بھی ویسی ہی ترقیاں کرنے کے وعظ سُنا رہے ہیں۔ اُن کے وعظوں کا اثر قوم پر اُلٹا پڑ رہا ہے اور ترقی کرنے کے شوق میں قوم تباہی کی طرف چلی جا رہی ہے۔

جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں
اُس کی ہر اِک بات کا میں دیوانہ ہوں
شب[1] میں پیدائش ہوئی ہے پیشِ شمع
جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

آنکھوں میں عینک منہ میں مصنوعی دانت

عینک آنکھوں میں مُنہ میں مصنوعی دانت
نیچر نے سُکھا کے کر دیا جسم کو تانت[2]
اب تک ہے مگر وہی ہوس حضرت کی
ہے[3] طولِ امل ہنوز شیطان کی آنت

کیک نے روٹی اور پتلون نے لنگوٹی بھی کھوئی

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ[4] کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

[1] یعنی میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوا ہوں جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور نئی روشنی کی شمع جل رہی تھی اِس لئے میں آفتاب کے جلوہ یعنی مسلمانوں کی ترقیات سے ناآشنا ہوں اور یورپ کی ہر ایک بات مجھے اچھی اور دلکش معلوم ہوتی ہے۔

[2] تانت جانوروں کی اُس انتڑی کو کہتے ہیں جسے بٹ کر یا سُکھا کر کمان یا سارنگی وغیرہ میں لگاتے ہیں۔ "جسم کو تانت کر دیا" سے مُراد ہے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

[3] یعنی ضعیف العمری کی وجہ سے آنکھوں پر عینک لگانی پڑ رہی ہے۔ دانت مصنوعی ہیں اور جسم سُوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود حرص و ہوس اب تک بدستور ہے اور ویسی ہی لمبی چوڑی امیدیں ابھی تک قائم کی جا رہی ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

[4] یعنی پرانے خیال کے واعظوں کا کہنا نہیں سُنا۔ کیک کھانے اور پتلون پہننے کے شوق میں روٹیوں سے محتاج ہو گئے اور لنگوٹی بندھ گئی

ٹاک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم

اندھیر مچا ہے زیرِ فلک خلقت بھی ہے چپ اور راج بھی چپ
ہم دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے پر کل بھی تھے چپ اور آج بھی چپ
صاحبزادے نشے میں ہیں اور بیف کنور جی کی ہے ٹفن
ہیں مولوی صاحب قبلہ بھی چپ اور پنڈت جی مہراج بھی چپ

نئی روشنی کے پروانے

ہیں لیمپ عزیز شمع بیگانہ ہے — جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے روئے روشن پہ نگاہ — جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

بے بصیرتی، بے ہمتی اور بے دینی

جب نورِ یقیں نہیں بصیرت کیسی — طاقت ہی نہیں دلوں میں ہمت کیسی
اسلام نئی روشنی میں کیا ہو یک رخ — مسجد ہی نہیں تو پھر جماعت کیسی

۱ یعنی مسلمان امرا کے لڑکے شراب پی رہے ہیں اور ہندو راجاؤں کے لڑکے گائے کا گوشت کھا رہے ہیں۔ مگر نہ کوئی مولوی بول سکتا ہے نہ پنڈت۔
۲ یعنی جو آج کل بڑے عقلمند سمجھے جاتے ہیں وہ کڑوے تیل کے چراغ سے جلتے یعنی اس کو برا سمجھتے اور اس سے نفرت کرتے ہیں چراغ سے جلنے میں صنعت ایہام ہے۔
۳ بصیرت باطنی آنکھ یا دل کی بینائی کو کہتے ہیں یعنی حقائق شناسی و عبرت اندوزی کو۔ مطلب یہ ہے کہ دل کی آنکھ کے لئے نورِ یقین کا ہونا ضروری ہے یعنی حقیقت شناسی کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ آدمی ایمان اور یقین کی روشنی میں دل کی آنکھ سے کام لے ورنہ وہ تذبذب اور گمان کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔
۴ یعنی جتنا انسان کا دل قوی اور مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی وہ اولوالعزم و عالی حوصلہ ہوتا ہے۔ جن کے دل کمزور ہیں ان میں ہمت اور اولوالعزمی کیسے ہو سکتی ہے۔
۵ یعنی نئی روشنی کے مسلمانوں کا جب کوئی مرکز و مقصد ہی نہیں ہے تو ان میں یکجہتی و ہم خیالی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ بغیر ایک قبلہ کے جماعت سے نماز پڑھنا کب ممکن ہے۔

نئی روشنی خوش نما تو ہے مگر بے اصول

چالیس سال سے ہے نئی روشنی کا دور — کیونکر اسے کہوں کہ سراسر فضول ہے
البتہ ایک عرض کروں گا دبی زباں — گو خوش نما بہت ہے مگر بے اصول ہے

گورے کو نہ بنانا سالا

ایسا شوق نہ کرنا اکبر — گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا — ہم بھی کالے یار بھی کالا

ہوٹل میں عیش، ہسپتال میں ہائے ہائے

کل مستِ عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں — اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
دنیا اسے قرار دو اور آخرت یہ ہے — سن لو کہ سازِ معنیِ اکبر کی گت یہ ہے

۱ دبی زبان سے کچھ کہنا محاورہ ہے بمعنی صاف صاف نہ کہنا۔ لحاظ سے بات کرنا۔ شعر میں دبی زبان سے نہیں بلکہ صرف "دبی زباں" موزوں ہوا ہے۔
۲ یعنی نئی روشنی کا دور (زمانہ) بظاہر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اس دور کے لوگوں کے سامنے کوئی ایک مقصد اور ان کے کاموں کا کوئی ضابطہ اور اصول نہیں ہے۔
۳ مطلب یہ ہے کہ کالے مردوں (یعنی ہندوستانی مردوں) کا نباہ کالی عورتوں (یعنی ہندوستانی عورتوں) سے ہو سکتا ہے اس لئے گوری عورتوں (یعنی یورپین عورتوں) سے ہندوستانیوں کو شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ ورنہ یہ یورپین بیویاں ہی نہیں بلکہ ان کے بھائی بند بھی زندگی تلخ کر دیں گے۔
۴ مطلب یہ ہے کہ اکبر اپنے اشعار میں جس بات پر بار بار زور دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ بدعملوں کی دنیا اور آخرت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک دن تو ہوٹل میں خوب عیش و عشرت کرے اور گلچھرے اڑائے اور دوسرے دن بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو اور تکلیف سے ہائے ہائے کرے۔ یعنی دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزا۔

نماز روزہ خلاف فیشن

پشّے[1] نے کہا سُبک نشینی میری ہے قابلِ داد اگر کریں آپ انصاف
میں نے یہ کہا بجا ہے لیکن یہ نیش ہے بارِ گراں و تلخ تقصیر معاف
فرمائیں مرا قصور حضرت جو معاف جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف
انکار[2] نہیں نماز روزے سے مجھے لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

لیلیٰ اسکول مسٹرس اور قیس ریڈر

اللہ رے[3] انقلابِ طرز و مذاقِ مشرق حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈر
لیلیٰ کا نازِ رخصت، اسکول مسٹریس ہیں سودائے قیس غائب، اب وہ بنے ہیں ریڈر

۱ پشّہ یعنی مچھر سے مراد انگریز ہیں جو دوسرے ملکوں میں اپنی حکومت کے پیر اس طرح جماتے ہیں کہ کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا مگر جب محکوموں کا خون پینے کے لئے ڈنک مارتے یعنی محکوموں کو محتاج بنا کر خود مالدار ہونے کی چالیں چلتے ہیں تو بڑی ناگواری اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

۲ یعنی نماز روزہ کے ذانہ سے تو نئی روشنی والے بھی انکار نہیں کرتے اُن کو اعتراض صرف یہ ہے کہ نماز روزہ کے پابند لوگ دقیانوسی خیال کے سمجھے جاتے ہیں کیونکہ نماز، روزہ کا طریقہ اب فیشن کے خلاف ہوگیا ہے۔

۳ یعنی اہلِ مشرق کے مذاق و تمدن میں یہ کیسا عجیب انقلاب ہو رہا ہے کہ حافظ شیرازی کے اشعار کی بجائے اب انگریزی کی ریڈریں پڑھی جا رہی ہیں اور مشرقی عورتیں لیلیٰ کے ناز و انداز دکھانے کی بجائے اسکولوں میں اُستانیاں ہوگئی ہیں اور مشرقی مردوں میں کوئی قیس عامری کا سا مجنون نظر نہیں آتا بلکہ اُنھوں نے عدالتی پیشکاری کی ملازمتیں کر رکھی ہیں۔

آزادی و تقلیدِ بے جا کی یورش

نہ مسجد[1] میں نظر آتے نہ رہتے ہیں محلّوں میں ترقی پا کے بَس بل جاتے ہیں برگیڈ کے گلوں میں
یہی یورش رہی آزادئ و تقلیدِ بے جا کی تو غائب قوم کی تمکین ہے دو چار ہلوں میں

حکومتی کیمپ کا چکّر

پایا[2] جب کیمپ کے چکّر میں اُنھیں سب کا شریک رشک جاتا رہا اس پر کہ بڑے عالم ہیں
صبر و آزادئ طاعت کے مزے لو اکبر اُن کی راہوں پہ اُنھیں چھوڑ دو جو حاکم ہیں

مشین میں اُلجھے ہوئے گھسٹ رہے ہیں

ہماری[3] حالت کو کچھ نہ پوچھو........ فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن فعولُ فعلن
پچھاڑے[4] کھاتے ہیں لوٹتے ہیں پکڑتے ہیں شیخ جی کا دامن مگر مشینیں جو چل رہی ہیں اُنھیں میں اُلجھے گھسٹ رہے ہیں

۱ یعنی آج کل کے ترقی یافتہ نہ مسجدوں میں نظر آتے ہیں اور نہ اپنے محلّوں میں رہنا پسند کرتے ہیں بلکہ وہ بسلسلۂ ملازمت یا کاروبار انگریزوں کے فوجی کیمپوں میں رہایش اختیار کر لیتے اور فوجی افسروں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اگر مسلمان بے جا تقلید اور آزادی کے اسی طرح شکار ہوتے رہے تو چند ہی روز میں اُن کی ساری قومی عزّت و وقعت خاک میں مل جائے گی۔

۲ یعنی جو علماء حکام رسمی یا انگریزوں کی ملازمت کے چکّر میں پڑ جاتے ہیں اُن میں علم و فضیلت کا کوئی ایسا امتیاز باقی نہیں رہتا جس پر رشک کیا جائے اس لئے ہم کو صبر و شکر سے کام لینا اور آزادی سے عبادت کرنے کا لطف اُٹھانا چاہئے۔ حاکموں کی ریس نہیں کرنی چاہئے۔

۳ قوم کی اصل حالت کو بیان کرنے کی بجائے صرف شعر کی بحر کا وزن لکھ دیا ہے تاکہ ہم خود حسبِ حال موزوں الفاظ تلاش کر لیں اس بحر کا نام بحر متقارب مقبوض اثلم ہے۔

۴ مطلب یہ ہے کہ قوم کی اصلی حالت تو ناگفتنی ہے۔ ظاہری حالت یہ ہے کہ اُس شخص کی طرح جو کسی مشین کی مال میں پھنس جائے۔ لوٹتے ہیں۔ پچھاڑے کھاتے ہیں اور گھسٹے چلے جاتے ہیں اور سہارے کے لئے شیخ کا دامن تھامتے ہیں یعنی تکلیف و مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزرگانِ دین سے دعائیں کراتے ہیں۔

نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے

مایوس کر رہا ہے نئی روشنی کا رنگ[1] — اِس کا نہ کچھ ادب ہے نہ کچھ اعتبار ہے
تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ — یعنی نہ نورِ دل ہے نہ شمعِ مزار ہے

مسلموں کے حرم میں انگلش لیڈیاں

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پئے تکریمِ مہماں بن سنور کر بیبیاں آئیں
طریقِ مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں — دلوں[2] میں ولولے اُٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں

رگوں میں وہ خون ہی نہ رہا

بوئے[3] گل میں فسون ہی وہ نہ رہا — موسم بدلا جنون ہی وہ نہ رہا
سینے میں وہ دل کہاں سے آئے اکبر — جب اپنی رگوں میں خوں ہی وہ نہ رہا

[1] یعنی نئی روشنی کے دَور میں نہ تو اُستادوں کا ادب و احترام کیا جاتا ہے اور نہ لیڈروں کو ایصالِ ثواب۔ نہ تو زندوں کے دلوں میں نُور ہوتا ہے نہ مُردوں کی قبر پر کوئی چراغ جلاتا ہے۔

[2] یعنی مسلمانوں کے گھروں میں انگریز لیڈیوں کی انگریزی طرز پر مہمانداریاں ہونے سے مسلمان بیبیوں کے دِلوں میں بھی انگریزی تقلید کے ولولے پیدا ہونے لگے ہیں۔

[3] یعنی جس طرح بہار کا موسم ختم ہو جانے پر جب عاشقوں کے دلوں میں جنونی ولولے نہیں اُٹھتے تو پھولوں کی مست خوشبوئیں بھی اُن کو مست و بے خود نہیں کرتیں۔ اسی طرح جب انسانی رگوں میں خون کا جوانی کا سا جوش نہیں رہتا تو دِل بھی افسردہ ہو جاتا اور اُس میں اُمنگیں باقی نہیں رہتیں۔ مقصد۔ یہ ہے کہ نئی روشنی اور قومی تنزّل کے اثر سے اب دل میں ولولے بھی پیدا نہیں ہوتے جو قومی عروج و اقبالِ ہند کے زمانہ میں پیدا ہوا کرتے تھے۔

فلک کو کد ہے کہ بگڑو اور بگاڑو

الاپو[1] مغربی دُھن میں کوئی راگ — اُٹھو مسجد سے اور دامن کو جھاڑو
جنونِ لیڈری کا دَور ہے یہ — فلک کو کد ہے بگڑو اور بگاڑو

مغربی چکّر

مجھ گدا کو کر دیا رخصت جو دے کر عطر پان[2] — فاقہ تو ٹوٹا نہیں، ہاں عزّت افزائی ہوئی
مرکزِ[3] دل بزمِ مشرق میں کوئی ملتا نہیں — ہر طبیعت مغربی چکّر میں ہے آئی ہوئی
مذہب و وضع و زبانِ قوم کا کس کو خیال — جب اکابر کی نظر آنرز کی شیدائی ہوئی
نظمِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی[4]

[1] مطلب یہ ہے کہ آج کل نئی روشنی کی لیڈری کا جنون سروں پر سوار ہے اور یہ لیڈر جو مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ مسجد کی خاک چھاننا چھوڑ دو اور مغربی روش اختیار کرو، خود بھی تباہی کی طرف جا رہے ہیں اور قوم کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔

[2] مشرقی تہذیب میں معزز مہمانوں کی عطر اور پان سے تواضع کی جاتی تھی۔ یہی طریقہ بعض انگریز افسروں نے بھی معزز ہندوستانیوں کی مدارات کا اختیار کر لیا تھا تاکہ ہندوستانی اسے اپنی عزّت افزائی سمجھیں خواہ ملاقات سے اُن کی مقصد بر آری ہو یا نہ ہو۔

[3] یعنی مشرقی ماحول میں اب ایسا کوئی مرکز نہیں ملتا جس سے دل کو وابستہ کیا جائے۔ سب کی طبیعتیں مغربی چکّر میں پھنس گئی ہیں۔

[4] یعنی جس ثقافتی اور تمدّنی انقلاب کے دَور میں سے ہم گذر رہے ہیں وہ تو آ کر رہے گا اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ ہاں اکبر کی نظمیں اس انقلاب کی یادگار رہیں گی۔

لا الٰہ موجود ۔ اِلّا اللہ غائب

بے سبب زیں لائبریری[1] ہا مرا اکراہ (کراہیت، بیزاری) نیست
ہر کتابے را کہ بکشادیم بِسمِ اللہ نیست

کورس[2] را ہر سال تغیر ست و باہم اختلاف
اتحادِ معنوی را سوئے دلہا راہ نیست

از مذاقِ[3] (نصابِ تعلیم) مشرقی ہر طبع را بے گانگی!
چیزے از مغرب بدلہا ہست و خاطر خواہ نیست

صف[4] نشیناں چشم یاری می کُنند از ہم دریغ
کو دلے کاں را دریں محفل جنونِ جاہ نیست

---

[1] لائبریریہا جمع مہند ہے انگریزی لفظ لائبریری (Library) بمعنی کتب خانہ کی۔ ترجمہ:۔ ان (یعنی انگریزی) کتبخانوں سے مجھ کو بلاوجہ نفرت نہیں ہے (بلکہ نفرت کی وجہ یہ ہے) کہ جس کتاب کو بھی میں کھولتا ہوں اُس میں بِسمِ اللہ نہیں ملتی۔ یعنی کوئی کتاب بسم اللہ یا خدا کے نام سے شروع نہیں کی جاتی۔

[2] ترجمہ:۔ ہر سال نصابِ تعلیم کی کتابیں بدل جاتی ہیں اور وہ (مضمون میں) ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں (اس سے معلوم ہوتا ہے) کہ معنوی اتحاد کا دلوں تک گذر نہیں ہوا ہے (یعنی ابھی تک تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا مقصد متعین نہیں ہوا ہے جس پر سب متفق ہوں) حضرت اکبرؔ نے ہر سال نصابِ تعلیم جدید کی کتابوں میں تبدیلیاں ہونے کی یہ بڑی بالغ نظرانہ توجیہہ کی ہے۔ پہلے زمانہ میں مقصد تعلیم اسلامی معیار پر قوم کی تعمیر و تربیت تھی اور اس مقصد پر ساری قوم متحد و متفق تھی۔ اس لیئے تعلیمی کتابوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اور قوم کی سب نسلیں تعلیم گاہوں سے ایک ہی سانچہ میں ڈھل کر نکلتی تھیں۔ برخلاف موجودہ زمانہ کے کہ سب کے خیالات و مقاصد مختلف ہیں اور سب اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔

[3] ترجمہ:۔ مشرقی مذاق (عادات و اطوار) سے ہر ایک شخص کی طبیعت بے گانہ ہو گئی ہے (یعنی کسی کو اُس سے اُنس و تعلق باقی نہیں رہا) کچھ مغربی مذاق دلوں میں (پیدا ہوا ہے) مگر حسبِ دل خواہ نہیں (یعنی جتنا پیدا کرنا چاہتے ہیں اتنا نہیں)۔

[4] ترجمہ:۔ ایک ہی صف میں بیٹھنے والے (یعنی ہم عقیدہ و ہم عصر) دوستی کی آنکھ ایک دوسرے سے چُراتے ہیں (یعنی آپس میں محبت و ہمدردی نہیں رکھتے) اس محفل میں کون ایسا دل ہے جسے جاہ و اقتدار کا جنون نہ ہو (یعنی سب جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لیے آپس میں رشک و رقابت رکھتے ہیں)۔

گفتہ[1] ام مایوس ازیں اندازِ آغازِ شما
لا الٰہیت نمایاں ہست و الا اللہ نیست

صورتِ[2] مذہب کہ می سازند تحسیں می کنم
معنیِ دیں را کہ می سوزند خلق آگاہ نیست

ہانڈی سرد مذہب پر آنچ

کر لی ہے خوب میں نے نئی روشنی کی جانچ
مجھ سے بہت نہ کیجئے اب آپ تین پانچ (جھگڑا، بحث مباحثہ)

اُن[3] لیڈروں کی شعلہ زبانی (گرم گرم تقریریں) سے کیا ہوا
ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پہ آئی آنچ

---

[1] تمہارے اندازِ آغاز یعنی (تمہاری ابتدا اس طریقہ پر ہونے سے میں بہت مایوس ہوں۔ (تمہاری طبیعتوں میں لا الٰہیت (یعنی کسی کو معبود نہ بنانے کا رجحان) تو نمایاں ہے لیکن الا اللہ (یعنی اقرار خدائے واحد) نہیں ہے۔ یعنی تمہاری آزاد خیالی تمہیں اس کی تو اجازت نہیں دیتی کہ تم کسی غیر اللہ کو لائق پرستش سمجھو لیکن اس کے ساتھ ہی تمہارے سر خدائے واحد کی عبادت و پرستش کے لیئے بھی نہیں جھکتے اور اندیشہ ہے کہ اپنی آزاد خیالی کی رو میں کہیں تم خدائے واحد کی ہستی سے بھی منکر نہ ہو جاؤ۔
اس شعر میں ایک بلیغ حکیمانہ اشارہ یہ بھی ہے کہ اگر لا الٰہ کے تصور کے ساتھ ہی الا اللہ کا تصور بھی ذہن میں نہ آئے تو اندیشہ رہتا ہے کہ لا الٰہ کہنے والے کہیں اللہ ہی سے منکر نہ ہو جائیں۔

[2] ترجمہ:۔ مذہب کی جو صورت (ظاہری آرائشوں سے مزین کر کے وہ بناتے ہیں اُس پر تو ہم سب اُن کی تعریف کرتے ہیں لیکن دین کے معنی (یعنی مذہب کی روح اور مغز) کو وہ جلاتے ہیں اس سے دنیا بے خبر ہے۔ یعنی آج کل کے قومی لیڈران بظاہر تو مذہب کے بڑے حامی بنتے ہیں اور مذہب کو بڑی بڑی اچھی اچھی شکلوں میں ہمارے سامنے پیش کر کے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ لیکن جن دل کش اور خوش نما شکلوں میں وہ مذہب کو پیش کرتے ہیں انہی کی وجہ سے قوم میں مذہب کی روح فنا ہوتی جا رہی ہے اور نمائشی مذہب پرستی میں ترقی ہو رہی ہے۔

[3] مطلب یہ ہے کہ اس کا خوب تجربہ ہو چکا ہے کہ نئی روشنی کے لیڈرانِ قوم مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو گرما گرم اور پُر جوش تقریریں کرتے ہیں اُن سے مسلمان قوم کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور مذہب کی روح روز بروز جلتی یعنی فنا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

بُتانِ کلیسا کی مریدی

میں نے کہا یہ اپنے[1] خیالی خضر (رہنما) سے آج
بتلاؤ اس روش (طرزِ اصلاح) سے ترقی کی کیا امید

ہر گام (قدم)[2] پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا
ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

ہاں[3] انتشار و جہل کی تکمیل ہوگی جب
ہو جاؤ گے بُتانِ کلیسا کے تم مرید

شاید[4] کہ مدعا (مقصد) بھی تمھارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے درس کے پردے میں ناپدید

میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

ترقی[5] کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم (زنانخانہ) سے بیبیاں نکلیں

مصیبت[6] میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
دعا مُنھ سے نہ نکلی پاکٹوں (پاکٹ کی جمع بمعنی جیب) سے عرضیاں نکلیں

[1] یعنی اپنے خیال میں ایک قومی رہنما کا تصوّر کر کے اُس سے کہا۔

[2] یعنی اگر تمھاری اصلاحی کوششوں سے قوم کا ہر قدم طاعتِ حق سے الگ پڑتا رہا تو قوم مرکزِ اسلام سے روز بروز دُور ہوتی چلی جائے گی۔

[3] یعنی جس قدر قوم مرکز سے دُور ہوگی اُسی قدر اُس میں انتشار و افتراق اور مذہب سے ناواقفیت پیدا ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام سے برگشتہ ہو کر لوگ عیسائیوں کے مرید اور عیسائیت کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

[4] یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھارا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان عیسائیوں کے گرویدہ ہو جائیں اگرچہ ابھی انگریزی تعلیم کے پردہ میں یہ مقصد چھپا ہوا ہے۔

[5] یعنی دنیاوی ترقی کی نئی نئی راہیں نکلتے ہوئے دیکھ کر مَردوں نے مسجد کو چھوڑ دیا اور پردہ نشین عورتیں گھروں سے بے پردہ باہر نکلنے لگیں۔

[6] یعنی پہلے لوگ کم از کم تکلیف اور مصیبت میں خدا کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب نئی تہذیب کا اثر یہ ہوا ہے کہ مصیبت میں بھی مُنھ سے دُعا نہیں نکلتی۔ حاکموں کے آگے اپنا دکھڑا رونے اور اُن کی امداد طلب کرنے کے لئے جیبوں سے عرضیاں ضرور نکل آتی ہیں۔ یعنی درخواستیں فوراً پیش کر دی جاتی ہیں۔

انگریز
اور
انگریزی حکومت

الحاد کی طرف میلان

چرچے ہیں نہ مذہب کے نہ وہ قفقۂ[1] دل ہے
پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل ہے
اِس عہد میں مائل سوئے الحاد جو دل ہے
اس کی تو گورنمنٹ ہی رسپانسبل ہے

قِسمت نہ لڑنے کا باعث انگریز کی خوش انتظامی

اب تک جو کہیں ہماری قِسمت نہ لڑی[2]
ناحق تجھے ہم نشیں ہے فکر اِس کی پڑی
انگریز کے مُلک میں لڑائی کیسی
یہ ہند ہے یہاں خوش انتظامی ہے بڑی

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے[3] میں جو اُتریں وہ تانیں اُڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر
انا الحق[4] کہو اور پھانسی نہ پاؤ

۱؎ یعنی دلوں کی وہ حالتیں نہیں ہیں جو پہلے تھیں۔ پہلے دل مائل بہ مذہب دروحانیت تھے اور اب مائل بہ الحاد و بےدینی۔

۲؎ قسمت لڑنا محاورہ ہے بمعنی قسمت کا یاور و موافق ہونا۔ یہاں قسمت نہ لڑنے (یعنی قسمت کی یاوری نہ کرنے) کی توجیہ لڑنے کے لفظی معنوں کی رعایت سے یہ کی گئی ہے کہ انگریزوں نے اپنی خوش انتظامی کی وجہ سے ملک میں سب لڑائی جھگڑے ختم کردئے ہیں اِس لئے اُن کے عہدِ حکومت میں ہندوستانیوں کی قسمت کیسے لڑ سکتی ہے۔

۳؎ یعنی جو گانا بھی تم سے گایا جاسکتا ہو گاؤ۔ یعنی جو تمہارا دل چاہے کہو۔

۴؎ "انا الحق" بمعنی میں خدا ہوں حضرت منصور حلاج کو جذبۂ بےخودی میں انا الحق کہنے کی وجہ سے پھانسی دے دی گئی تھی۔ مگر وہ زمانہ قیود نرہبیت کا تھا۔ انگریزوں کی حکومت میں ایسے روحانی جذبات وخیالات کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہر شخص آزاد ہے خواہ وہ "انا العبد" کہے یا "انا الحق"۔

ہندی کی نجات مشکل ہے

بنگالی ہاتھ میں قلم لے تو کیا — مسلم جو مثالِ جامِ جم لے تو کیا
ہندی کی نجات ہے نہایت مشکل — سو[۱] مرتبہ مرکے وہ جنم لے تو کیا

انگریزی حکومت میں ترقی کی معراج

کوئی[۲] کہتا نہیں سیّاح ہوں فطرت کا ماہر ہوں — یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظر ہوں
میں[۳] اپنے نوکروں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں بنگلے میں — "کوئی ہے" لاکھ کہئے۔ کون کہتا ہے کہ "حاضر ہوں"

---

۱ مطلب یہ ہے کہ بنگالی ہندوؤں میں خواہ کتنا ہی زورِ قلم پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کے پاس خواہ دوسرا جامِ جم (جمشید بادشاہ فارس کا وہ پیالہ جس میں علمِ نجوم کے ذریعہ سے دنیا کے حالات معلوم ہو جاتے تھے) ہی کیوں نہ آ جائے مگر انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانا ہندوستانیوں کے لئے بہت مشکل ہے خواہ ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ یا آواگون کے مطابق وہ سو مرتبہ مرکر بھی دوبارہ جنم کیوں نہ لیں۔

۲ یعنی نئی تعلیم سے نہ تو کوئی سیاح پیدا ہوتا ہے جو دنیا کے حالات کو خود گھوم پھر کر معلوم کرے۔ نہ کوئی ایسا ماہر سائنس داں پیدا ہوتا ہے جو رازہائے فطرت سے واقف ہو۔ نئے تعلیم یافتوں کے لئے باعثِ فخر بس یہ رہ گیا ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں یا عدالت کے ناظر۔

۳ مطلب یہ ہے کہ آج کل خدمتگاروں کے دماغ ایسے چل گئے ہیں کہ جب اُن کے آقا قدیم دستور کے مطابق "کوئی ہے" کہہ کر آواز دیتے ہیں تو جواب میں کوئی "حاضر ہوں جناب" نہیں کہتا۔ یعنی حاضر ہوں کہنے کو نوکر بھی کسرِ شان سمجھنے لگے ہیں۔ یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آج کل حکم پر چلنے والے خدمتگار نہیں ملتے۔

ابتری معاشرت کا ذمہ دار کون ہے

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس — ہے[۱] ابتریٔ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اِس کا — ہے اپنے ہی میلِ معصیت کا افسوس

انگریز مہربان نہ ہوں تو نہ سرسید کچھ کر سکتے ہیں نہ حالی

ایک[۲] سید کیا کریں یا بیٹھ کر دس کیا کریں — حضرتِ حالی کے اشعارِ مسدس کیا کریں
سچ تو یہ ہے مہربانی آپ کی درکار ہے — ہم غریب و ناتوان و زار و بےکس کیا کریں

پہلے آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے اب خون نکل رہا ہے

کونسل سے ہر طرح کا قانون آ رہا ہے — مطبع سے ہر طرح کا مضمون آ رہا ہے
لیکن[۳] پڑھوں میں کیونکر آنکھوں کی ہے یہ حالت — اشک آ رہے تھے پہلے اب خون آ رہا ہے

---

۱ یعنی ہم کو اپنی حکومت چلی جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے جتنا کہ اس بات کا افسوس ہے کہ ہماری معاشرت (رہن سہن کے طریقے) بالکل خراب اور بدتر ہو گئی ہے اور ہماری معاشرت میں اس افسوسناک تبدیلی ہونے کے ذمہ دار انگریز اتنے نہیں ہیں جتنے کہ ہم خود ہیں۔ اگر ہمارا میلانِ طبع معصیت اور گناہ کی طرف نہ ہوتا تو ہم یہ معصیت آلود معاشرت ہرگز اختیار نہ کرتے۔

۲ مطلب یہ ہے قوم کی اصلاح کے لئے خواہ ایک سرسید احمد کوشش کریں یا اُن جیسے دس سید احمد اور۔ نہ ان کی کوششیں کارگر ہو سکتی ہیں۔ نہ مولانا حالی کی مشہور مسدس کے موثر اشعار۔ ہماری حالت اِس قدر زبون اور خراب و خستہ ہو گئی ہے کہ جب تک انگریز ہی ہم پر مہربان ہو کر ہماری اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں ہم پنپ نہیں سکتے۔

۳ مطلب یہ ہے کہ قانون بھی ہر قسم کے کونسلوں میں پاس ہو رہے ہیں اور مضمون بھی اچھے اچھے چھپ کر شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن قوم کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھ کر بجائے آنسوؤں کے اب میری آنکھوں سے خون نکلتا ہے اس لئے نہ مضمونوں سے کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ قانون سے۔

اپنے ہم نشیں بھی رقیبوں کے مصاحب ہو گئے

رہ گئے ناآشنا احباب غائب ہو گئے ۔۔۔ ہم نفس ذو اک جو باقی تھے وہ صاحب[۱] ہو گئے
وقتِ بد میں کون رکھتا ہے رفاقت کا خیال ۔۔۔ ہم نشیں اپنے رقیبوں کے مصاحب ہو گئے

گنی کے بجائے پنی، دین گیا تو دنیا بھی چھنی

پہلے تو دکھاتی تھی چمک اپنی گنی[۲] ۔۔۔ اب پیشِ نگاہ ہیں فقط پنس[۳] دپنی
کہتے ہیں حریف ہنس کے اب ازرہِ طعن ۔۔۔ جب دین کو کھو دیا تو دنیا بھی چھنی

اب گریجوئیٹوں کی قدر ہے یا میٹوں کی

کچہریوں میں ہے پرسش گریجوئیٹوں کی ۔۔۔ سڑک پہ مانگ ہے قُلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علمِ دین و تقویٰ کی ۔۔۔ خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

۱ صاحب ہو گئے۔ یعنی انگریزوں کی وضع قطع اختیار کرلی اور بڑے آدمی ہو گئے۔ صاحب ہو کر انگریزوں کے مصاحب ہو جانے میں پُر لطف تجنیس ہے۔

۲ گنی Guinea سونے کا ایک انگریزی سکّہ جو ۲۱ شلنگ یعنی تقریباً پندرہ روپے کا ہوتا ہے۔

۳ پنس Pence پینی Penny کی جمع ہے۔ پینی ایک انگریزی سکّہ ہے جو تقریباً ایک آنہ کے برابر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی ابتدائی حکومت میں تو گنیاں بہت دیکھنے میں آتی تھیں۔ اب زیادہ تر اکنیاں دکھائی دے رہی ہیں یعنی ملکی دولت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ دین کے چھوٹنے کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا بھی چھنتی جا رہی ہے۔

منصفی کا دروازہ بھی بند

مذہب اور مولویوں پہ گالی ہو لی ۔۔۔ اسپیچ پہ انجمن میں تالی ہو لی
دروازۂ[۱] منصفی ہے ہم پر کیوں بند ۔۔۔ ہر بات تو اے جنابِ عالی ہو لی

انگریزوں پر مشرقی ہوا کا اثر

انگریزوں میں عادتِ سحر خیزی تھی ۔۔۔ اندازِ روش میں اِک دلآویزی تھی
مشرق[۲] کی ہوا سے وضع اب ہے بدلی ۔۔۔ پہلے اچھی تھی خالص انگریزی تھی

راہِ رزق میں کانٹے

میں رعیّت ہوں وہ شاہانہ دلیری ہے کہاں ۔۔۔ مجھ کو کیوں رشک آئے وضعِ ملّتِ انگریز پر
کانٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہ رزق میں ۔۔۔ خوف آتا ہے چھُری چلتی ہے اُن کی میز پر

۱ یعنی جب ہم نے وہ سب باتیں اختیار کرلیں جو آپ چاہتے تھے۔ مذہب اور مولویوں کو گالیاں بھی دے دیں اور انجمنوں اور لکچروں میں آپ کے حسبِ منشاء تالیاں بھی بجادیں تو اب ہمیں منصفی کی نوکری کیوں نہیں ملتی۔

۲ یعنی جب تک انگریزوں کو مشرق کی ہوا نہیں لگی تھی اُن میں کئی عادتیں مثلاً علی الصباح بیدار ہونے کی بہت اچھی اور پسندیدہ تھیں۔ مشرق کے اثر سے انگریزوں کی اِن اچھی عادتوں میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ خالص انگریزیت اچھی تھی جس پر مشرق کا اثر نہیں پڑا تھا۔

اپنی زبان سکھانے کا مقصد

۱ نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زباں — مطلب یہ ہے کہ سمجھے اُن کے فرماں
مقصود نہیں میاں کی سی عقل وتمیز — اس نکتے کو کیا سمجھیں جو ہیں ناداں

برٹش اقبال کو اپنا اقبال نہ سمجھو

۲ روز افزوں ہے بلاشبہ برٹش اقبال — جو خلاف اس کے تصور کرے وہ وہمی ہے
اپنا اقبال مگر اُس نے جو سمجھا ہے اِسے — یہ نئی روشنی کی سخت غلط فہمی ہے

انگریز کا رعب داب

۳ اسباب طرب یہاں وہاں سے لائیں — ہر طرح کا فرنیچر دکاں سے لائیں
قائم نہ رہے ادب تو کیا اِس کا علاج — انگریز کا رُعب ہم کہاں سے لائیں

۱ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم انگریز صرف اِس مقصد کو مدِّ نظر رکھ کر دلوا رہے ہیں کہ ہندوستانی محکوم اُن کے احکام کو سمجھ سکیں اور اُن کے دفتری کام چلا سکیں مگر یہ ایسے بے عقل ہیں کہ انگریزوں کی اِس مصلحت کو نہیں سمجھتے۔

۲ مطلب یہ ہے کہ برطانوی اقبال وعروج کی روزافزوں ترقی سے تو صرف وہی انکار کر سکتا ہے جو حقیقت آشنا نہیں ہے بلکہ وہم پرست ہے مگر جو لوگ برطانوی اقبال کی ترقی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ترقی نئی روشنی کی ترقی ہے یعنی جو نئی روشنی پر چلے گا وہ بھی ویسی ہی ترقیاں حاصل کرے گا جیسی کہ انگریز حاصل کر رہے ہیں یہ اُن لوگوں کی بڑی غلط فہمی ہے۔

۳ مطلب یہ ہے کہ طرزِ رہائش اور وضع قطع میں انگریزوں کی پوری تقلید کرنے اور اسی ٹھاٹھ سے رہنے سہنے کے باوجود اگر ماتحت ہمارا ادب ولحاظ نہیں کرتے تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں کا سا رعب داب ہم میں نہیں ہے۔

ہندی مسلمان

اور

ہندو مسلمان

کھانے کو پپیتا، دل بڑھانے کو گیتا

پیٹ کے واسطے پپیتا (انناس خربوزہ) ہے ۔۔۔ دل بڑھانے کو درسِ گیتا[1] ہے
ہند ہی میں دیا خدا نے مقام ۔۔۔ بندہ اب دَیر (بت خانہ) ہی میں جیتا ہے

تدبیر ناکام، تقدیر بدنام

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو ۔۔۔ تقدیر کا نام لیں تو اس میں بدنامی ہو
القصّہ عجیب ضیق (مصیبت، الجھن) میں ہیں ہندی ۔۔۔ یورپ[2] کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

قومی، مذہبی یا رُوحانی

میں کب کہتا ہوں وہ مسلمان نہیں ۔۔۔ سب ہیں چکے ہوئے ہیں لاثانی ہیں
میں تو اتنا ہی کر رہا تھا دریافت ۔۔۔ قومی[3] ہیں کہ مذہبی کہ رُوحانی ہیں

---

[1] ہندوؤں کی مشہور کتاب بھگوت گیتا جس میں ہندوؤں کے پیشوا سری کرشن جی کی دل بڑھانے والی نصیحتیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہندی مسلمانوں کا مسکن ہندوستان بنا دیا ہے جو مشرکوں کی اکثریت کی وجہ سے بُت خانہ تو ہے مگر یہاں کھانے کے لئے پپیتا ہے جس سے پیٹ ٹھیک رہتا ہے اور پڑھنے کے لئے گیتا ہے جس سے دل بڑھتا اور عزم و حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی اپنی ترقی کی تدبیریں کرتے ہیں تو اُن میں ناکامی ہوتی ہے اور تقدیر پر بھروسہ کرکے بیٹھتے ہیں تو نکمّے اور ناکارہ کہلاتے ہیں۔ اِس لئے وہ عجیب مصیبت میں ہیں کہ کیا کریں۔ یورپ کا خدا ہی اُن کو اس مصیبت سے نکال سکتا ہے کیونکہ اُس کے بندے کم از کم اپنی تدبیروں میں تو کامیاب ہو رہے ہیں۔ یورپ کے خدا سے مراد وہ عقائد و اخلاق ہیں جن کی اہلِ یورپ پیروی کر رہے ہیں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھی آج کل تین قسم کے ہو گئے ہیں یعنی قومی۔ مذہبی اور روحانی۔ ان میں سب سے نمایاں قومی مسلمان ہیں جو قوم پرستی کے مدّعی اور نئی روشنی کے پیرو ہیں۔ یہ قومی مسلمان زیادہ نمایاں ہونے کے باوجود اسلام کی راہِ مستقیم سے بہت بھٹک گئے ہیں اور درحقیقت صرف برائے نام مسلمان ہیں۔

ہندی مسلم میں ہند کی نیو

ہندی مسلم میں ہند کی نیو (بنیاد) بھی ہے ... افطار (روزہ کھولنا) میں ہے کھجور تو سیو بھی ہے
اللہ اللہ ہے زباں پر بے شک ... لیکن اک رنگِ بم مہادیو[1] بھی ہے (بیسن سے بنی ہوئی ایک ہندوانی غذا)

نسخۂ گاؤزبان کی مضرّت

وہ لطف[2] اب ہندو مسلماں میں کہاں ... اغیار اُن پہ گذرتے ہیں خندہ زناں (ہنستے اور مذاق اڑاتے ہوئے)
جھگڑا کبھی گائے کا، زبان کی کبھی بحث ... ہے سخت مضر یہ نسخۂ گاؤزباں[3] (پرچہ جس میں طبیب مریض کے لئے دوائیں لکھتا ہے)

---

[1] بم مہادیو (ہندی) بمعنی مہادیوجی کی جے یا بول بالا۔ "مہادیو" ہندو بڑے دیوتا یا شیوجی کو کہتے ہیں۔ بم مہادیو کا مفہوم ہندوؤں کی مذہبی زبان میں اللہ اکبر کا سا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خمیر یا طینت میں چونکہ مذہب بھی شامل ہے اِس لئے اُن کے خصائل و عقائد میں عربیت کے ساتھ ہندوئیت کی خوبو بھی ہے۔ چنانچہ اُن کے روزہ کھولنے کے سامان میں جہاں عرب کی کھجوریں ہوتی ہیں وہاں ہند کے چٹ پٹے سیو بھی۔ وہ زبان سے اللہ اللہ ضرور کرتے ہیں لیکن اُن کی طبائع شرک کی طرف بھی کچھ نہ کچھ مائل رہتی ہیں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ گائے کُشی اور اُردو ہندی کے جھگڑوں کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات اِس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ اُن کے آپس میں روز فساد اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جن پر دوسری قومیں ہنستی اور اُن کا مذاق اُڑاتی ہیں۔

[3] گاؤزبان ایک مشہور دوائی بوٹی ہے جس کی پتّیاں گائے کی زبان کی شکل کی ہوتی ہیں۔ گائے اور زبان کے جھگڑوں کی رعایت سے نسخۂ گاؤزبان کے ہندیوں کے لئے مضر ثابت ہونے میں کیسی ادبی لطافت ہے۔

آپس میں ملتے بھی ہیں اور لڑتے بھی ہیں

چغلیاں[1] اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں ... ناگہاں غصّہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ ... ہیں[2] نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

لڑو مگر ایک رہو

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی ... اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی[3] ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ ... موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ہندو زر کے لئے عزّت چاہتا ہے اور مسلمان عزّت کے لئے زر

دونوں کو اگرچہ ہے طلب (آرزو) آبِرو[4] (عزت و رتبہ) کی ... رُخ اُن کے جدا ہیں اس کی علّت (غرض و غایت) کے لئے
بنیاد وہ اپنی چاہتا ہے مضبوط ... بے چین ہے یہ نمودِ (نمائش) حالت کے لئے
ہندو عزّت طلب (یعنی طالبِ عزت) ہے زر کی خاطر ... مسلم کو طلب ہے زر کی عزّت کے لئے

---

[1] چغلیاں جڑنا اور چغلیاں کھانا ایک ہی معنوں میں آتا ہے یعنی ایک دوسرے کی بُرائیاں یا غمّازی کرنا۔

[2] نظر ملنا اور نظر لڑنا یہ دونوں محاورے بھی تقریباً ہم معنی ہیں یعنی آنکھیں دوچار ہونا۔ دو شخصوں کی آنکھوں کا بالمقابل ہونا مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کا آپس میں لڑنا اور ملنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اُردو محاورہ میں آپس کی نظروں کا ملنا اور لڑنا۔ یعنی ہندو مسلمانوں کی آپس کی لڑائی دراصل لڑائی نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ غصّہ میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ زمانہ تمھارے خلاف ہو رہا ہے۔ اُس کی لاٹھی کی مہلک زد سے بچنے کے لئے تم کو اپنے اپنے طریقوں کے مطابق نیک بن کر پانی کی طرح ہو جانا چاہئے جس پر لاٹھی کی ضرب سے موجیں تو پیدا ہوتی اور آپس میں لڑتی بھی ہیں لیکن پانی ایک ہی رہتا ہے۔

[4] یعنی ہندو اور مسلمان اگرچہ دونوں عزّت و جاہ کے طالب ہیں لیکن غرض و غایت دونوں کی مختلف ہے۔ ہندو اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے عزّت و جاہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور مسلمان محض نمود و نمائش کے لئے۔ ہندو روپیہ کمانے کے لئے عزت حاصل کرتا ہے اور مسلمان عزّت حاصل کرنے کیلئے روپیہ کماتا ہے۔

ہم خیالی نہ ہونے سے آپس میں دشمنی کیوں ہو

۱ ہ سے ہندو م سے مسلم یہ دونوں مل کر ھم ۔۔۔ سر پہ انگریزی آ اس سے ہوئی حالت اھم

ہے آ ہم سے جدا لیکن محافظ اور معین ۔۔۔ اس کے سائے میں رہے ہ م شامل ہوں بہم

دوست کیوں کر ہوں نہ ہوں جب ہم خیال و ہم مذاق ۔۔۔ لیکن اس کا یہ اثر کیوں ہو کہ ہوں دشمن بہم

اپنا اپنا وقت ہے موقع ہے اور میلانِ طبع (طبیعت کا جھکاؤ) ۔۔۔ آپ اپنے شغل میں رہئے اور اپنی دُھن (شغل) میں ہم

شیخ جی کی پالیسی جو صاحب کی مرضی

لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اَن ۲ سے پنپتے ہیں ۔۔۔ ہماری بھی دُعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو

مگر ہاں شیخ جی کی پالیسی سے ہم نہیں واقف ۔۔۔ اِسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

---

۱ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان ایک قوم کی تعریف میں آنا اور اپنے لئے ہم کے استعمال کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں تو دونوں کو اس طرح مل کر رہنا چاہئے جیسے کہ لفظ ھم میں ہ اور م ملے ہوئے ہیں اور یہ سمجھنا چاہئے کہ ھم کی ہ سے ہندو اور م سے مسلمان مراد ہیں۔ لیکن انگریزوں کا آ بھی ہمارے سر پر موجود ہے اور اس کی موجودگی سے حالت اھم (ا + ھم) یعنی ذرا پیچیدہ ہو گئی ہے۔ آ اگرچہ ھم سے جدا ہے یعنی ہ اور م کی طرح آپس میں ملا ہوا نہیں ہے لیکن ھم کے شروع میں ہونے کی وجہ سے وہ ھم کا یعنی ہمارا محافظ اور مددگار ہے اور بیرونی حملہ آوروں کے حملوں سے ہماری حفاظت کر رہا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ اُس کے سایہ میں رہنے والے ھم کی ہ کو م سے علیحدہ نہ ہونے دیں یعنی باہمی نا اتفاقیوں سے بچیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہم خیال اور ہم مذاق نہیں ہیں اس لئے دونوں میں یک دلی اور دوستی کا ہونا تو مشکل ہے لیکن دوستی نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم آپس میں دشمن ہو جائیں اپنے اپنے حالات و مقتضیات اور رجحاناتِ طبع کا لحاظ رکھ کر ہر ایک کو اپنے اپنے شغل میں مصروف رہنا چاہئے اور آپس کی لڑائی جھگڑوں سے قومیت کی بنیادوں کو کمزور نہیں کرنا چاہئے۔

۲ اَنّ ہندی بمعنی ناج، رزق۔ پنپتے ہیں یعنی پلے اور بڑھے ہیں۔ گنگا جی یعنی دریائے گنگ جسے ہندو مقدس سمجھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے لڑنا تو نہیں چاہئے کیونکہ ہندوؤں کی طرح ہم بھی ہند میں پیدا ہوئے اور ہند ہی کے ناج سے جس کی پیداوار میں دریائے گنگا کے پانی کو بھی بڑا دخل ہے پلے اور بڑھے ہیں اور ہندوؤں کی طرح ہم کو بھی دریائے گنگا کی خیر منانی چاہئے لیکن ہمارے رہنمایانِ قوم کی پالیسی کچھ اور ہے۔ وہ اُس روش پر چل رہے ہیں جس پر انگریز اُن کو چلانا چاہتے ہیں اور وہ ملکی مفاد کے مقابلہ میں "صاحب کی مرضی" کو مقدم سمجھتے ہیں۔

مسلم کی رکاکت آمیز پالسی اور ہندو کی خوفناک ترنگ

رزق نا محتاج جب دے دے تجھے اللہ پاک ۔۔۔ کر عبادت میں بسر اور سر کو رکھ بالائے خاک

پالسی (ضرورت کے مطابق) ۱ مسلم کی دیکھی اور ہندو کی ترنگ (شیخی۔ خفگی) ۔۔۔ اُس میں ہے اکثر رکاکت (بے غیرتی۔ کمزوری) یہ ہے (اوپر) اکثر خوفناک

مشرقی تعصّب، مغربی پالسی

ہر طرف برپا ہے طوفانِ عناد (دشمنی) و اختلاف ۔۔۔ برہمن اور شیخ سوشل (تمدنی) ساز و ساماں کیا کریں

پالسی ۲ مغرب یہ مشرق پر تعصّب (مذہبی تنگ نظری۔ ہٹ دھرمی) ہے سوار ۔۔۔ اس کو ہندو کیا کریں اس کو مسلماں کیا کریں

بچنا انگریز سے زیادہ چاہئے یا ہندو سے

۳ زیادہ ان سے رہو محترز (الگ تھلگ۔ محتاط)، کہ ہندو سے ۔۔۔ یہ خود ہی سوچ لو دل میں، اگر نہ کچھ کد (بغض۔ مخالفت) ہو

یہ چاہتے ہیں کہ فتنہ (بدامنی) یہاں کا ہو موقوف (بند) ۔۔۔ وہ فکر میں ہیں مسلمانی ہی ندارد ہو

---

۱ یعنی مسلمانوں کی قومی پالسی (روش) میں اکثر انگریزوں کی بے جا خوشامد کو دخل ہوتا ہے اور ہندوؤں کی قومی پالسی میں شیخی اور تعلّی کو۔ مسلمانوں کی پالسی میں رکاکت اور بے غیرتی ہوتی ہے اور ہندوؤں کی پالسی سے فتنے فساد پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۲ یعنی مغربی حکمرانوں نے اپنے مشرقی محکوموں کو ایسی مذہبی آزادی دے رکھی ہے جس کی وجہ سے ان میں مذہبی تنگ نظری اور دوسرے مذاہب سے بغض پیدا ہو گیا ہے۔ اِس کا علاج نہ ہندوؤں کے پاس ہے نہ مسلمانوں کے پاس۔ اور اسی وجہ سے ملک میں فرقہ وارانہ جھگڑوں اور دشمنیوں کا ایسا طوفان برپا ہے کہ نہ ہندو اپنی تمدّنی اصلاح کر سکتے ہیں نہ مسلمان اپنی۔

۳ مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کو نہ تو ہندوؤں سے دشمنی ہے نہ مسلمانوں سے وہ تو صرف اپنا اقتدار اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں بدامنی نہ پھیلے اور اُن کی مخالفت نہ ہو۔ لیکن ہندو اس فکر میں ہیں کہ ملک میں مسلمانی ہی کو ختم کر دیں۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کو خود ہی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ اُن کو ہندوؤں سے زیادہ محتاط رہنا چاہئے یا انگریزوں سے۔

اُردو اور ہندی

گائے کا گوبر اور اونٹ کی مینگنی

سینگ[1] ہے پھر بھی وہ جُھکائے ہے سر — آپ بے سینگ سر اُٹھاتے ہیں
حامیٔ گاؤ ہیں اِسی سے بہت — اُس کو کم لوگ مُنھ لگاتے ہیں
اُس کے گوبر سے لیپتے ہیں مکاں — اونٹ کی مینگنی جلاتے ہیں

[1] گائے اور اونٹ کے استعارہ میں ہندو مسلمانوں کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح گائے سینگ ہونے کے باوجود سر جھکائے رہتی ہے اور اسی وجہ سے ہندو اُس کی حفاظت اور اُس سے محبت کرتے ہیں اور اُس کے گوبر سے اپنے گھروں کو لیپتے ہیں اور اونٹ سینگ نہ ہونے کے باوجود سر کو اونچا اُٹھا لیتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی اُس کو منھ نہیں لگاتا اور پیار و محبت کر کے سر نہیں چڑھاتا اور اونٹ کی مینگنی سے آگ جلانے یعنی ایندھن کا کام لیا جاتا ہے اسی طرح ہندو دولت و عزت و علم رکھنے کے باوجود چونکہ عجز و انکسار سے کام لیتے ہیں اس لئے اُن کے دوست اور حامی بہت ہیں اور مسلمان چونکہ تمول و عزت نہ رکھنے کے باوجود شیخوت و تمکنت سے کام لیتے ہیں اس لئے اُن کے دوست بہت کم ہوتے ہیں اور کوئی اُن کو مُنھ نہیں لگانا اور سر چڑھانا پسند نہیں کرتا۔

اُردو کی حمایت اخبار "البشیر" میں

سرحد پہ باغیوں کو سکھ ماریں گے — گردن اُردو کی رام (مراد ہندوؤں سے ہے) رکھ ماریں گے
قائم رہے البشیر[1] کا یہ پرچہ — ہم بھی مضمون کوئی لکھ ماریں گے

اُردو سے ہندی لڑ گئی

عِلم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی — تخلیئے (تنہائی نہ خلوت) کی بات پبلک کے دِلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اُس بُت سے[2] لڑائی تھی زباں — یہ اثر اُس کا ہوا اُردو سے ہندی لڑ گئی (جھگڑ گئی / ٹکرا گئی)

---

[1] "البشیر" اٹاوہ کا بہت پُرانا اور مشہور ہفتہ وار اخبار ہے جس کے ایڈیٹر خان بہادر مولوی بشیرالدّین صاحب نے یوپی کے لفٹنٹ گورنر میکڈانل صاحب کے اُردو ہندی جھگڑے کی بنیاد ڈالنے پر اُردو کی حمایت اور مخالفینِ اُردو کی مخالفت میں بڑے پُرزور مضامین لکھے اور لکھوائے تھے۔ مقصد اشعار کا یہ ہے کہ سکھ اپنی جنگ جُوئی سے مسلمانوں کو مار سکتے ہیں اور ہندو اپنی سازشی حکمت عملی سے اُردو کو فنا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس سوائے اِس کے اور کیا طاقت ہے کہ البشیر میں اُردو کی حمایت کا کوئی مضمون لکھ ماریں یا لکھ ڈالیں گے۔ اس قطعہ میں ردیف "ماریں گے" کے مختلف محاوراتی استعمالوں سے معنوی حُسن پیدا کیا گیا ہے۔ لکھ مارنا سے محاورہ میں زیادہ تر ایسے تردیدی مضامین کا لکھنا مراد لیا جاتا ہے جن کا کوئی عُملی نتیجہ مترتب نہ ہو۔

[2] زبان لڑانا محاورہ ہے جو جواب دینے اور زبان درازی کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور عاشق و معشوق کے حالت ہیجان جذبات میں زبان سے زبان ملانے یا مَس کرنے کے معنوں میں بھی۔ یہاں دوسرے ہی معنی مراد ہیں۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ہندو مسلم دوستی کے زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں نے ایک ایسی زبان اختیار کر لی تھی جس کے بولنے اور سمجھنے میں دونوں کے لئے آسانی تھی اور جو دونوں کی تقریباً مشترکہ زبان ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس اشتراک زبان کے نتائج پر عام ہندوؤں نے غور کیا اور اُن کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ آپس کی دوستی ہندوؤں کو مسلمانوں میں مدغم نہ کر دے تو اُنھوں نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا اور کہنے لگے کہ ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے اور اُردو زبان مسلمانوں کی ہے۔ اس لئے ہندوؤں کو اُردو کے گرانے اور ہندی کے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ بے میل لوگوں میں جب باہمی محبّت کی بنیاد عارضی جذبات پر رکھی جاتی ہے تو جذبات کے فرد ہونے پر ایسی محبّت کا اثر معکوس باہمی دشمنی و مخالفت کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے۔

اُردو میں عربی اور ہندی میں سنسکرت

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اِس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرءالقیس[1] بنیں — پنڈت جی والمیک[2] ہونے کے نہیں

ہمدم اور لیڈر کی بحث

کہاں اُردو و ہندی میں زرِ نقد — وہی اچھا ہے جو گِنتا منی (روپیہ) ہے
مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث — میانِ (درمیان)[3] ہمدم و چِنتا منی ہے

[1] امرءالقیس عرب کا ایک بڑا مشہور شاعر تھا جو صاحبِ دیوان ہے اور جس کا ایک قصیدہ اُن سات مشہور فصیح و بلیغ عربی قصیدوں میں بھی تھا جو عرب کے سات نامور شاعروں نے اپنا کمال ظاہر کرنے کے لئے کعبۃ اللہ کے دروازہ پر لٹکا دئے تھے اور جو سبعہ معلقہ کے نام سے مشہور ہیں۔

[2] والمیک۔ سنسکرت زبان کا مشہور شاعر۔ رامائن کا مصنف جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رامچندر جی کی زندگی میں موجود تھا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ جب مُلک میں ہندو مسلمان دونوں ہی کو رہنا سہنا ہے تو اُن کو زبان بھی ایسی اختیار کرنی پڑے گی جسے اُردو کی طرح ہندو مسلمان دونوں آسانی سے سمجھ لیں اور بول سکیں۔ ہندی مسلمانوں کا گزارہ نہ تو ہندوستان میں امرءالقیس بننے یعنی عربی کا فاضل بننے سے ہو سکتا ہے اور نہ ہندوؤں کا گزارہ والمیک یعنی فاضل سنسکرت بننے سے۔

[3] ہمدم لکھنؤ کا ایک مشہور اُردو روزنامہ تھا جو اُس وقت سید بشارت علی صاحب جالب دہلوی مرحوم کی ایڈیٹری میں نکل رہا تھا اور مسٹر چنتامنی الہ آباد کے مشہور انگریزی روزنامہ لیڈر کے مدراسی ایڈیٹر تھے جو بعد میں کونسل کے ممبر بھی ہو گئے تھے۔ ہمدم اور لیڈر میں اُردو ہندی کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ حضرتِ اکبر طنزاً لکھتے ہیں کہ ایسی بے سود بحثوں سے کیا فائدہ۔ جس سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہ ہو۔ آج کل تو ایسی بحثیں کرنی چاہئیں جن سے روپیہ ملے۔

خوب مِل کر لڑی زباں سے زباں

معنئ جنگ اُردو و ہندی — مَیں یہ سمجھا بہ عالمِ رندی
یعنی ہے اس میں لُطف وصلِ بُتاں — خوب[1] مِل کر لڑی زباں سے زباں

تین چوتھائی اُردو کے مالک ہندو ہیں

اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود — پھر کیا سبب جو اُس سے اُنھیں انحراف (اختلاف، بیزاری) ہے
یعنی اُرد[2] ہے چیز (تین چوتھائی) اُنھیں کے مذاق کی — اُردو کے تین جزو یہی صاف صاف ہے

[1] مطلب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے وصل و اتحاد کے زمانہ میں دونوں زبانوں کا ملنا یعنی دونوں کا ایک زبان اُردو اختیار کر لینا ہندی زبان کی رقابت کا باعث ہو گیا اور اُردو ہندی زبانیں آپس میں لڑنے لگیں یعنی زبان کا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی کا باعث ہو گیا۔

[2] اُرد جس کو اُرَد بھی بمعنی ماش (مشہور غلہ) اُرد کی دال ہندوؤں کی خاص غذا ہے۔ اُردو کے چار حرفوں میں پہلے تین حرف (یعنی تین چوتھائی حروف) وہ ہیں جن سے لفظ اُرد بنتا ہے۔ گویا لفظ اُردو ہی سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اُس کے تین چوتھائی کے مالک ہندو ہیں پھر مُلک کی مشترکہ زبان ہونے کی حیثیت سے بھی ہندو اُردو کے تین چوتھائی مالک ہونے کے مدّعی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مُلک کی آبادی میں تین چوتھائی حصّہ اُنہی کا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو زبان کی بنیادی ترکیب و ساخت میں بھی تین چوتھائی دخل ہندوؤں کی مخصوص زبان ہندی بھاشا یا پراکرت کو ہے۔

اُردو کو عربی اور بھاشا بنانے کی کوشش

ہم[۱] اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
(بھاشا: ہندوستان کی پرانی زبان پراکرت)

جھگڑے کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں
(تراشا: اختراع کرنا)

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے
(اکھاڑا: دنگل)

جب اِس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں
(فلک: مراد مخالفین اتحاد یعنی انگریزوں سے ہے)

---

۱ مطلب یہ ہے کہ اُردو ہندی کا جھگڑا ہندو مسلمانوں کی باہمی عداوت کی وجہ سے نہیں چھڑا ہے بلکہ اُس کی شہ دینے والے انگریز ہیں جو کوئی ذریعۂ اتحاد ملک میں باقی رکھنا نہیں چاہتے اور جن کی حکومتی مصلحتیں اسی کی متقاضی ہیں کہ ہندو مسلمان آپس میں لڑتے رہیں۔ ان ہی کے اشارہ پر کبھی مسلمان اُردو میں غیر مانوس عربی الفاظ ٹھونس کر اُس کو ہندوؤں کے لئے مُشکل و ناقابلِ فہم بنا رہے ہیں اور کبھی ہندو یہ کوشش کرتے ہیں کہ عربی اور فارسی کے بجائے سنسکرت اور ہندی کے غیر مانوس الفاظ اُردو میں داخل کر دئے جائیں تاکہ اُردو بالکل ہندی زبان ہو کر رہ جائے جسے صرف ہندو ہی سمجھ سکیں۔

اَدبی چُٹکلے اور شعری لطائف

چاہِ ذقن اور گیسو کا جال

کہا جب، غیر کو کیوں تو نے اے گلرو پھنسایا ہے
تو بولا دل لگی کے واسطے اُلّو پھنسایا ہے

اِدھر چاہِ[1] ذقن ہے اُس طرف ہیں جالِ گیسو کے
ہمارے دل کو اُس نے کر کے بے قابو پھنسایا ہے

میں فرشتہ نہ کہار

اُس بُت کے لئے ہے دہر میں فصلِ بہار
اک تختِ[2] رواں پہ پھرتا ہے لیل و نہار

کہتا ہے اُٹھاؤ اس کو یہ ہے مرا عرش
کہہ دو[3] اکبر کہ میں فرشتہ نہ کہار

خیالِ عاشق کی نیک معاشی

عاشق کا خیال ہے بہت نیک معاش
ہونے نہیں دیتا حُسن کے راز کو فاش

کیوں وصل میں جستجو کمر کی وہ کرے
حاضر[4] میں نہ حجت اور نہ غائب کی تلاش

---

[1] فارسی اور اُردو شعراء معشوق کی ٹھوڑی کو کنوئیں سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

[2] تختِ رواں ہوادار کو یعنی اُس تخت کو کہتے ہیں جس پر بادشاہ سوار ہو کر نکلتے ہیں اور جسے آدمی اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوتے ہیں۔

[3] یعنی بُت اگر خدا ہے تو میں فرشتہ نہیں ہوں جو اُس کا تخت اُٹھاؤں اور اگر وہ خدا نہیں ہے تو اُسے اپنا تخت کہاروں سے اُٹھوانا چاہیئے اور میں کہار نہیں ہوں۔

[4] حاضر میں حجت نہیں غائب کی تلاش نہیں، یہ ایک اُردو مثل ہے۔ اس کے معنی ہیں جو موجود ہے، نذر ہے۔ لاکر دینے کا اقرار نہیں۔ شاعرانہ تخیل میں معشوقوں کی کمر نہیں ہوا کرتی یا ایسی پتلی ہوتی ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ اس لئے معشوق کا سچا وفادار عاشق وصلِ معشوق میں معشوق کی کمر کا پتہ چلا کر اُس کے اِس راز کو کہ اُس کی کمر موجود ہے کیوں فاش کرے کہ جس سے معشوق کے حُسن کو بٹہ لگے۔

چینِ جبیں اور دلِ زار

بوڑھے[1] ہوئے کتاب سے بوس و کنار ہے — اپنے لئے الف ہی فقط قدِ یار ہے
اپنی جبیں سے چین[2] کے مالک اگر ہو تم — میں بھی ہوں شاہ روس کہ دل میرا زار ہے

داغِ دل کا روبی (لعل) اور اشک کا پرل (موتی)

کہتی ہے زراہِ کبر مجھ سے وہ گرل — کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈیوک نہ ارل
اکبر نے کہا دکھا کے داغِ دل و اشک — ہے میری گرہ میں بھی یہ روبی یہ پرل

کیا خوب کہا ہے "آداب بجالاتا ہوں"

بوسہ کیسا کہ گلوری بھی نہیں پاتا ہوں — بس کلام اپنا انھیں جا کے سنا آتا ہوں
وہ یہ فرماتے ہیں کیا خوب کہا ہے واللہ — میں یہ کہتا ہوں کہ آداب[3] بجالاتا ہوں

---

[1] یعنی ایک علم دوست جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اُس کے واسطے چومنے اور بغل میں لینے کے لئے بس کتابیں ہی رہ جاتی ہیں اور الف ہی اُس کے لئے قدِ یار کا کام دیتا ہے یعنی عشق کے سارے شوق وہ لکھنے پڑھنے ہی سے پورے کرلیتا ہے۔

[2] چین بمعنی شکن۔ بل اور یہ ایک مشہور مُلک کا نام بھی ہے۔ زار بمعنی نحیف و کمزور۔ مصیبت زدہ اور زار شاہانِ روس کا لقب بھی تھا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق اگر اپنی چینِ جبیں (تیوری کے بلوں) کی وجہ سے مُلک چین کا مالک ہے تو میں اپنے دلِ زار کی وجہ سے شاہِ روس ہوں۔ یعنی معشوق کو اپنے ناز پر ناز ہے تو مجھ کو اپنے نیاز پر۔

[3] "آداب بجالاتا ہوں" کا محاورہ شکر ادا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

عشق نوازی

گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں — پھر بھی سیدھے ہیں نہایت نیک ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ گیو می کِس ڈیر[1] — سر جھکا کر کہتے "یو مے ٹیک[2]" ہیں

گوالن کا عشق کوزے کی آگ

تیرے قدم سے رونقِ شہرِ پراگ ہے — یعنی ترے ہی دم سے بتوں کا سہاگ ہے
بھڑکی ہے دل کی آگ گوالن کے عشق میں — احباب ہنستے ہیں کہ یہ کنڈے[3] کی آگ ہے

آپ کالا لوگ

سب سمجھتے ہیں کہ یہ عشقِ بتاں اک روگ ہے — لیکن اس کو کیا کریں ملتا جو موہن[4] بھوگ ہے
شاہدانِ مغربی کرتے نہیں مجھ کو قبول — ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر 'آپ کالا لوگ' ہیں

---

[1] گیو می کِس ڈیر' یہ الفاظ انگریزی ہیں Give me Kiss Dear بمعنی پیارے مجھ کو بوسہ دو۔

[2] یو مے ٹیک' یہ بھی انگریزی الفاظ ہیں You may Take بمعنی تم لے سکتے ہو۔

[3] کنڈے کی آگ' دھیمی یعنی ہلکی ہوتی ہے مگر زیادہ دیرپا۔ کنڈا اُپلے کو کہتے ہیں جو گائے بھینس کے گوبر کو تھاپ کر بناتے ہیں۔ کنڈے کی گوالن سے مناسبت ظاہر ہے۔

[4] موہن بمعنی موہنے والا۔ فریفتہ کرنے والا۔ دلربا۔ بھوگ بمعنی بھوجن۔ کھانا۔ خوشی۔ عیش۔ ہم بستری۔ موہن بھوگ حلوے کو کہتے ہیں یہاں مراد معشوق کے وصل کی لذت ہے۔

چہرے کی داڑھی یا فرد کی تفصیلِ ذیل

جو ۱؎ مرد ہیں وہ پاک ہیں دنیا کے میل سے — سچ ہے خبیث ملتے ہیں ایسی چڑیلوں سے
چہرے ۲؎ کے نیچے قہر ہے داڑھی کا جھول جھال — اس فرد کو بچائیے تفصیلِ ذیل سے

ڈیر کلّو

چِٹھی اس مِس کی ہے یہ کہ جادو ہے — دل جوشِ مفارقت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے — القاب میں دیکھئے ڈِیر ۳؎ کلّو ہے

۱؎ مرد سے مراد شریف اور بہادر مرد ہیں۔ ایسے مرد دنیا سے محبت نہیں کرتے کیونکہ دنیا ایسی ہے جیسی کہ ایک پلید اور خبیث عورت اور خبیث عورتوں سے میل بلکہ خبیث مرد ہی رکھتے ہیں بمصداق آیۃ اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ خبیث عورتیں خبیث مردوں ہی کے لئے ہوتی ہیں۔

۲؎ چہرہ کو فردِ حساب سے اور داڑھی کو تفصیلِ ذیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فردِ حساب میں آمد وخرچ کا کوئی عنوان لکھ کر اُس کے آگے حسبِ تفصیلِ ذیل لکھ دیا جاتا ہے یعنی اِس آمدنی یا خرچ کی تفصیل نیچے درج کی جاتی ہے اور یہ تفصیل عنوان کے مقابلہ میں بہت طول طویل ہوتی ہے۔ اس شعر میں طنز ہے اُن لوگوں پر جو داڑھی کے ڈھیلے ڈھالے پن کو چہرہ کے لئے ایک مصیبت تصوّر کرتے ہیں۔ جیسا کہ تفصیلِ ذیل، فردِ حساب کے لئے ایک مصیبت ہوجاتی ہے۔

۳؎ بے تکلفانہ انگریزی خطوط مخاطب کے مختصر نام کے ساتھ لفظ ڈیر Dear بمعنی پیارا کے القاب کے ساتھ شروع کئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے کالے آدمی مغرب کی گوری چِٹّی لڑکیوں کے محض خطوں میں اُن کو ڈیر (پیارا) لکھنے سے ایسے بے خود ہوجاتے ہیں کہ اُن لڑکیوں کی جدائی میں تڑپا کرتے ہیں۔

کاسۂ سَر یا چولھے پر توَا

آگ برسانے کو لائی ہے ہَوا — جیٹھ میں اس لوہ کی ہے کیا دَوا
کاسۂ ۱؎ سَر ہوگیا بالائے سَر — جِس طرح چولھے کے اوپر ہو توَا

سب بول ڈالئے

دل ۲؎ میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالئے — اک دم میں کُل متاعِ سخن تول ڈالئے
ترکیب ہے ترقیٔ اُردو کی بس یہ خوب — جو آپ بول سکتے ہیں سب بول ڈالئے

داڑھی بھی پیٹ کی طرف جاتی ہے

خلقت ۳؎ اسی سمت صَف بہ صَف جاتی ہے — با عود و رباب و چنگ و دَف جاتی ہے
ہے نورِ خدا بھی طالبِ رزق کا دوست — داڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

۱؎ یعنی دماغ لوہ کی گرمی سے تپنے لگا اور کاسۂ سر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کسی نے جلتے چولھے پر توا رکھ دیا ہو۔

۲؎ مطلب یہ ہے کہ آج کل جب تک لوگ اپنے خیالات کا پبلک میں اظہار نہ کرلیں اُن کے دل کی گرہ نہیں کھلتی یعنی اُن کو چین نہیں پڑتا۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم اُردو کی ترقی تو ہوتی ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ ساری دُنیا پیٹ کی فکر یعنی طلبِ رزق میں مُبتلا ہے۔ حصولِ رزق کی کوشش میں کوئی گا رہا ہے کوئی بجا رہا ہے۔ کوئی کسی شغل میں ہے کوئی کسی شغل میں۔ غرض یہ کہ جو جس سے بن پڑتا ہے کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ داڑھی جسے خدا کا نور کہا جاتا ہے وہ بھی پیٹ ہی کی طرف جاتی ہے اور طالبانِ رزق کے لئے حصولِ رزق کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

بے زر عشق ٹیں ٹیں

بے سود اشعار اور کبت ہوتے ہیں — مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
(ہندی اشعار) (توجہ کرنے والا)

کر ۱ پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار — یہ بُت تو بزورِ زر چت ہوتے ہیں
(داؤں) (کشتی لڑنے کی جگہ) (پچھڑتے ہیں)

فراقِ یار

آپ کی فرقت میں ئیں کل رات بھر سویا نہیں — لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں
نوشِ جاں فرمائیں حضرت شوق سے یہ ناشتہ — چھ بجے ہیں میں نے تو مُنہ بھی ابھی دھویا نہیں

بُتانِ گمراہ بہ گردِ حبیب اللہ

خلافِ ۲ حق چو حریفاں زراہ می گردند — زفیضِ حکمتِ او رو براہ می گردند
مکرم است بہ ہندوستاں شہِ کابل — بُتاں بگردِ حبیب اللہ می گردند
(یعنی امیر حبیب اللہ خاں)

۱ مطلب یہ ہے کہ معشوق نہ تو شعروشاعری سے قابو میں آتے ہیں نہ اور تدبیروں سے، اُن کو قابو میں لانے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے تو بس زردار ہونے اور اُن پر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں کی مثل مشہور ہے۔

۲ یہ اشعار امیر حبیب اللہ خاں مرحوم سابق فرماں روائے افغانستان کے حکومت انگریزی کے مہمان کی حیثیت سے ہندوستان آنے کے سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ امیر صاحب موصوف کی آمد پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اسلامیت کے پُرجوش مظاہرے کئے تھے اور جن مسجدوں میں امیر صاحب نماز پڑھنے جاتے تھے وہاں اُن کی زیارت کے شوق میں ہزاروں بے نمازی بھی نماز پڑھنے پہنچ جاتے تھے۔ اشعار میں طنز یہ ہے کہ انگریزوں کی اِس حکمت عملی سے کہ اُنھوں نے ایک اسلامی حکومت کے بادشاہ کو ہندوستان میں مہمان بلایا گمراہ بھی راہِ راست پر آگئے اور جو خدا کے آگے نہیں جھکتے تھے وہ بھی حبیب اللہ (یعنی خدا کے دوست) کے گرد پھرنے لگے۔

شملہ بمقدارِ علم

افسوس ہے کہ مرگئے "بک" ۱ اب نہیں کوئی — اِس درجہ جس میں علم ہو اِس درجہ حِلم ہو
(بُردباری)
شملے ۲ میں جان دی تو تعجب ہے اس میں کیا — نازم تھی وہ جگہ جو بمقدار عِلم ہو

درپناہِ من بیا

قصّۂ ۳ منصور سُن کر بول اُٹھی وہ شوخ مِس — کیسا ۴ احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش ۵ اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے — اور یہ کافر پکارے درپناہِ من بیا

سورج کی داڑھی

بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین — دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکین
داڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں — مدعا یہ کہ گھام لیتا ہوں
(مراد سورج کی شعاعیں) (دھوپ میں بدن سینکتا ہوں)

۱ مسٹر بک علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے۔ بڑے بااثر اور نامور انگریز پرنسپل تھے۔

۲ مسٹر بک کا انتقال شملہ پہاڑ پر ہوا تھا جو غیر منقسمہ ہندوستان کا گرمائی دارالحکومت تھا۔ شملہ فارسی میں دستار، عمامہ یا طرہ کو بھی کہتے ہیں۔ "شملہ بمقدار علم" ایک فارسی مثل ہے جس کے معنی ہیں "دعوائے علم بقدرِ علم" یعنی جیسا علم ویسا ہی ٹھاٹھ۔ مطلب یہ ہے کہ مسٹر بک انگریزی کے بڑے عالم تھے اس لئے وہ مرے بھی ایسی جگہ جو انگریزی حکومت میں ہر لحاظ سے بہت اونچی تھی۔

۳ یعنی حضرتِ منصور حلاج رح جن کے اَنَا الحق (میں خدا ہوں) کہنے پر مفتیانِ شرع کے فتوے سے اُن کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

۴ انگریز عموماً ایسی ہی اُردو بولا کرتے تھے۔ یعنی منصور تو دیوانہ تھا اور دیوانے کو پھانسی دینی حماقت تھی۔

۵ یعنی کاش مجھ پر بھی منصور کی سی کیفیت طاری ہوجائے اور مجھے بھی پھانسی پر لٹکانے کا فتویٰ دے دیا جائے اور جو معشوقہ، منصور کی حمایت میں اُن کے پھانسی دینے والوں کو احمق بتا رہی ہے وہ مجھے بھی پھانسی سے بچانے کے لئے اپنی پناہ میں لے لے یعنی اس بہانہ سے مَیں وصلِ معشوق سے شادکام ہوجاؤں۔

بے زر عشق ٹیں ٹیں

بے سود اشعار اور کبت ہوتے ہیں — مفلس سے کہاں وہ ملتفت ہوتے ہیں
کر[1] پیچ تو عشق کے اکھاڑے میں ہزار — یہ بُت تو بزورِ زر چیت ہوتے ہیں

فراقِ یار

آپ کی فرقت میں مَیں کل رات بھر سویا نہیں — لیکن اتنی بات تھی گاتا رہا رویا نہیں
نوشِ جاں فرمائیں حضرتِ شوق سے یہ ناشتہ — چھ بجے ہیں میں نے تو مُنھ بھی ابھی دھویا نہیں

بُتانِ گمراہ بہ گردِ حبیبِ اِلٰہ

خلافِ[2] حق چو حریفاں زراہ می گردند — زفیضِ حکمتِ او رو براہ می گردند
مکرّم است بہ ہندوستاں شہِ کابل — بُتاں بگردِ حبیبِ الٰہ می گردند

[1] مطلب یہ ہے کہ معشوق نہ تو شعر و شاعری سے قابو میں آتے ہیں نہ اور تدبیروں سے، اُن کو قابو میں لانے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے تو بس زردار ہونے اور اُن پر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں کی مثل مشہور ہے۔

[2] یہ اشعار امیر حبیب اللہ خاں مرحوم سابق فرمانروائے افغانستان کے حکومت انگریزی کے میہمان کی حیثیت سے ہندوستان آنے کے سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ امیر صاحب موصوف کی آمد پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی اسلامیت کے پُرجوش مظاہرے کئے تھے اور جن مسجدوں میں امیر صاحب نماز پڑھنے جاتے تھے وہاں اُن کی زیارت کے شوق میں ہزاروں بے نمازی بھی نماز پڑھنے پہنچ جاتے تھے۔ اشعار میں طنزیہ ہے کہ انگریزوں کی اِس حکمت عملی سے کہ اُنھوں نے ایک اسلامی حکومت کے بادشاہ کو ہندوستان میں میہمان بُلایا گمراہ بھی راہِ راست پر آگئے اور جو خدا کے آگے نہیں جھکتے تھے وہ بھی حبیب اللہ (یعنی خدا کے دوست) کے گرد پھرنے لگے۔

شملہ بمقدارِ علم

افسوس ہے کہ مر گئے "بک"[1] اب نہیں کوئی — اِس درجہ جس میں علم ہو اِس درجہ حِلم ہو
شملے[2] میں جان دی تو تعجب ہے اس میں کیا — لازم تھی وہ جگہ جو بمقدارِ علم ہو

درپناہِ من بیا

قصّۂ[3] منصور سُن کر بول اُٹھی وہ شوخ مِس — کیسا[4] احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا
کاش[5] اے اکبر وہی حالت مجھے بھی پیش آئے — اور یہ کافر پکارے درپناہِ من بیا

سورج کی داڑھی

بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین — دھوپ سے مجھ کو ہوتی ہے تسکین
داڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں — مدّعا یہ کہ گھام لیتا ہوں
مراد سورج کی شعاعیں — دھوپ میں بدن سینکتا ہوں

[1] مسٹر بک علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے۔ بڑے بااثر اور نامور انگریز پرنسپل تھے۔

[2] مسٹر بک کا انتقال شملہ پہاڑ پر ہوا تھا جو غیر منقسم ہندوستان کا گرمائی دارالحکومت تھا۔ شملہ فارسی میں دستار۔ عمامہ یا طرہ کو بھی کہتے ہیں۔ شملہ بمقدار علم، ایک فارسی مثل ہے جس کے معنی ہیں "دعوائے علم بقدرِ علم" یعنی جیسا علم ویسا ہی ٹھاٹھ۔ مطلب یہ ہے کہ مسٹر بک انگریزی کے بڑے عالم تھے اس لئے وہ مرے بھی ایسی جگہ جو انگریزی حکومت میں ہر لحاظ سے بہت اونچی تھی۔

[3] یعنی حضرت منصور حلاج رح جن کے اَنَا الحق (میں خدا ہوں) کہنے پر مفتیانِ شرع کے فتوے سے اُن کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

[4] انگریز عموماً ایسی ہی اُردو بولا کرتے تھے۔ یعنی منصور تو دیوانہ تھا اور دیوانے کو پھانسی دینی حماقت تھی۔

[5] یعنی کاش مجھ پر بھی منصور کی سی کیفیت طاری ہو جائے اور مجھے بھی پھانسی پر لٹکانے کا فتویٰ دے دیا جائے اور جو معشوقہ، منصور کی حمایت میں اُن کے پھانسی دینے والوں کو احمق بتا رہی ہے وہ مجھے بھی پھانسی سے بچانے کے لئے اپنی پناہ میں لے لے یعنی اس بہانہ سے میں وصلِ معشوق سے شادکام ہو جاؤں۔

مدہوش لذّت

مارا[1] فلک نشاند بہ پہلوئے آں صنم — مدہوش لذّتیم و ندانم دگر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز پائنیر — کرزن چہ گفت و بِل چہ شنید و مِلر چہ کرد

(پائنیر: انگریزی اخبار الٰہ آباد کا نیم سرکاری مشہور — کرزن: لارڈ کرزن مشہور وائسرائے ہند)

نوشتۂ تقدیر سے بے خبری

ما[2] نیچری شدیم و نہ داریم آگہی — با دیگراں نوشتۂ کلکِ قضا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز جبرئیل — احمد چہ گفت و او چہ شنید و خدا چہ کرد

(نیچری: پیرو سر سیّد — کلک: قلم تقدیر — جبرئیل: مشہور فرشتہ حاملِ وحی — احمد: مراد غالباً سر سیّد احمد خاں سے ہے — او: یعنی جبرئیل)

[1] مجھ کو فلک یعنی انقلاب زمانہ نے اُس معشوق کے پہلو میں بٹھا دیا۔ میں (ہم نشینی) کی لذّت میں مدہوش ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں۔ اب کس کا دماغ ہے یعنی کس میں اتنی ہمّت ہے کہ (اخبار) پائنیر سے پوچھے کہ کرزن نے کیا کہا' بِل نے کیا سُنا' اور مِلر نے کیا کیا۔ دوسرا شعر کسی مشہور فارسی شاعر کے اس شعر میں تصرّف کرکے لکھا گیا ہے ؎ اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں ٭ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد۔ مطلب اشعارِ اکبر کا یہ ہے کہ انگریزوں کے مقرّب و منظورِ نظر ہو جانے کے بعد یہ سوچنے اور معلوم کرنے کا ہوش نہیں رہا کہ انگریزی حکومت کے بڑے بڑے ذمّہ دار افسر ہمارے متعلق کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔

[2] ترجمہ:۔ میں نیچری تو ہو گیا ہوں لیکن مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ دوسرے نیچریوں کے ساتھ تقدیر کا کیا لکھا پیش آیا ہے (یعنی قضا و قدر نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے) اب یہ کس کا دماغ ہے کہ جبرئیل سے پوچھے کہ سر سیّد احمد خاںؒ نے اُن سے (ہمارے متعلق) کیا کہا۔ جبرئیل نے کیا سُنا اور (پھر اس پر) خدا نے کیا کیا۔ یعنی نیچری ہونے کے بعد ہمیں کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ ہمارا حشر دنیا و آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔

لیلیٰ کی صورت کا تصوّر

نہ دِل[1] پستا ہے بسکٹ پر نہ میں پوری پہ لُچپتا ہوں — مذاقی حاشئے کو چھوڑ کر دونوں سے بچپتا ہوں
دلِ رنگیں ہے یاں لِیلا[2] رچانے کی ضرورت کیا — اکیلا بیٹھ کر لیلیٰ کی صورت خود ہی رَچپتا ہوں

مچھّر اور طاعون

مچھّروں نے بہت ستایا رات — میں نے کوسا کہ ہو تمھیں طاعون[3]
بولے اُس کا ہمارا منبع ایک — کیوں وہ کرنے لگا ہمارا خون

(منبع: نکلنے کی جگہ یعنی پیدا ہونے کی جگہ)

[1] دِل پستا محاورہ ہے بمعنی فریفتہ ہونا (پستہ ایک خشک میوہ بھی ہے) لچپنا بمعنی گرویدہ ہونا۔ جھکنا' نرم ہونا۔ (لچپی ایک قسم کی نہایت ملائم پوری ہوتی ہے جو حلوے کے ساتھ بڑی مزے دار معلوم ہوتی ہے) حاشیہ چھوڑنا' بمعنی کاغذ پر چاروں طرف جگہ چھوڑ کر لکھنا۔ مذاقی حاشئے کو چھوڑ کر' سے مراد ہے۔ زبان کے چٹخارے یا مزے کا تو تھوڑا بہت لحاظ رکھنا ہی پڑتا ہے ورنہ میں حتی الامکان بسکٹ اور پوری جیسے مشرقی کھانوں سے بچتا ہوں جو ثقیل اور نقصان رساں ہوتے ہیں۔ بسکٹ کے ساتھ دل پستا۔ پوری کے ساتھ لچپتا اور مذاقی حاشئے کی تجنیسات معنوی قابلِ غور ہیں۔

[2] لِیلا رَچانا محاورہ بمعنی کھیل تماشوں سے خوش ہونا۔ دل بہلانا۔ لیلیٰ۔ قیس کی مشہور معشوقہ۔ عام معشوقہ کو بھی کہتے ہیں۔ رچپنا بمعنی مہندی کا رنگ ہونا۔ شادی کا سامان مہیّا کرنا وغیرہ سے مطلب یہ ہے کہ جن کا دل زندہ اور رنگین ہوتا ہے اُن کو اپنی تفریحِ طبع کے لئے کھیل تماشوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تنہا بیٹھ کر بھی اپنی معشوقہ کے تصوّر سے دِل خوش کر لیا کرتے ہیں۔

[3] طاعون۔ گلٹیوں کی مشہور وبائی بیماری جو چوہوں سے پھیلتی ہے اور چوہوں میں پسّوؤں سے اور پسّوؤں میں گندگی اور غلاظت سے۔ مچھّر بھی گندگی اور غلاظت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اِس لئے مچھروں پر طاعون کا اثر کیا ہوگا کیونکہ دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔

میرے انڈر میں کام کرتا ہے

بابوجی کا وہ بُت ہوا نوکر — غیر اُس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتے ہیں وہ نہ جائے گا — میرے انڈر میں کام دیتا ہے

مِس کے لینے میں مسٹیک

غلطی مجھ سے ضرور یہ ایک ہوئی — پیدا وجہ نصیحتِ نیک ہوئی
لینا تھا لغت سے اور ہی لفظ کوئی — مِس کو جولیا یہ مجھ سے مسٹیک[1] ہوئی

سلونو، نونو اور فونو

بے دل ہمیں بروز سلونو[2] نہ کیجئے — لِللہ بات مانئے نونو نہ کیجئے
کل کی صدا نہ خوبیٔ فطرت نہ لطفِ دید — بہت یہی ہے خواہش فونو نہ کیجئے

[1] مِس ٹیک۔ Mistake انگریزی لفظ ہے جس کے معنی ہیں غلطی۔ یہ لفظ دو جزؤں سے مرکب ہے ایک مِس Miss بمعنی غلطی سے یا غلط طور پر۔ دوسرے ٹیک Take بمعنی لینا۔ مِس Miss کے معنی کنواری لڑکی کے ہیں۔ یہاں مراد انگریز لڑکی سے ہے مطلب یہ ہے کہ عشق کے لئے مِس کو انتخاب کرنے میں مجھ سے غلطی ہوئی اور اس غلطی کا احساس مجھ کو لغت میں لفظ مسٹیک دیکھ کر ہوا جس کے اجزا یہ بتا رہے ہیں کہ معشوق کے لئے مِس کا اختیار کرنا غلطی ہے۔ مسٹیک کے لفظ سے مجھ کو ایک نصیحت حاصل ہو گئی۔

[2] ہندوؤں کا مشہور تہوار جو ساون کے مہینے میں پورنماسی کے دن ہوتا ہے اور جس میں ہندو عورتیں اپنے عزیزوں کی کلائی پر دھاگا باندھتی ہیں جس کو راکھی کہتے ہیں اور اسی لئے اس تہوار کا نام راکھی بندھن بھی ہے۔

[3] مراد یہ ہے کہ مغربی معشوقائیں مشین کی طرح ہوتی ہیں۔ نہ اُن میں کوئی فطرتی کشش ہوتی ہے اور نہ ان کی دید سے کوئی لطف حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے اُن سے دل لگانا بے کار ہے۔

ہولی بائبل

اِس قدر رنگ اُڑا ہو گئے رنگیں اوراق — چوک میں پادری صاحب نے جو کھولی بیبل
ہنس کے اکبر نے کہا رنج نہیں کچھ اِس کا — ہو گئی اب تو حقیقت میں یہ ہولی[1] بیبل

کھچڑی داڑھی اور ترش روئی کی چٹنی

ہوئی جب آمدِ پیری ہوا میں سرکہ پیشانی — ترش روئی کی چٹنی جوڑ ہے داڑھی ہو جب کھچڑی[2]
سوال اب یہ عبث ہے کیوں بُتوں کی ہے یہ ارزانی — چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی[3]

[1] انجیل کو عیسائی انجیلِ مقدس یا ہولی بیبل کہا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پادری صاحب نے ہندوؤں کو ہولی کی ادباشانہ رنگ ریلیوں سے روکنے کے لئے سرِ بازار بائیبل کھول کر نصیحت شروع کی تھی مگر ہولی منانے والوں نے رنگ ایسا اُچھالا کہ انجیل کے اوراق بھی رنگین ہو گئے اور حضرتِ اکبر نے یہ فقرہ چُست کر دیا کہ بائیبل اب حقیقت میں ہولی ہو گئی۔ یعنی ہولی کے رنگ میں رنگ گئی اور ہولی کے معنی ختم ہو گئی کے بھی ہیں۔

[2] کھچڑی داڑھی ایسی داڑھی کو کہتے ہیں جس میں آدھے بال سفید ہوں اور آدھے سیاہ۔ ایسی داڑھی عموماً بڑھاپے کی علامت ہوتی ہے اور بڑھاپے میں مزاج عموماً چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ کھچڑی داڑھی ترش روئی کی چٹنی کے استعارہ کی دلیل سے مفہوم میں لطف پیدا کیا گیا ہے۔

[3] یہ کسی مشہور فارسی شاعر کا مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے:۔ جب کعبہ ہی سے کفر (کا عَلَم) بلند ہونے لگا تو پھر مسلمان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ یعنی جب مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ہی مغربی تقلید میں اپنے دین و مذہب کو چھوڑ بیٹھے تو پھر عام مسلمانوں سے مسلمان رہنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے اور جب مسلمان ہی نہیں رہے تو پھر یہ سوال بیکار ہے کہ بُتوں کی یعنی غیر خدا معبودوں کی اِتنی کثرت اور ارزانی کیوں ہو گئی۔

انرجی، بینرجی، وقتِ ڈنرجی

کچھ سین[1] خوش آتے ہیں نہ بھاتے ہیں بینرجی
میں زیل کا طالب ہوں نہ خواہان انرجی

سُنتا نہیں لکچر میں پڑا رہتا ہوں دن رات
لگتا ہے[2] فقط لیڈیوں سے وقتِ ڈنرجی

او بہ فکرِ عجبے من بہ خیالِ عجبے

طبع[3] سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے
زُلف خوش ہے کہ یہ پھانسی پہ چڑھی جاتی ہے

وہ ہے نافہم یہ عیّار، محیل ہے نازک
اہلِ بینش میں یہ اک نظم پڑھی جاتی ہے

دارد[4] آں آفتِ جاں حسن و جمال عجبے
چشم مستِ عجبے دارد و خالِ عجبے

او بتاراجِ دلم مائل و من مائلِ او
او بہ فکرِ عجبے من بہ خیالِ عجبے

۱؎ سینؔ اور بنرجی وغیرہ۔ بنگالی ہندوؤں کے خاندانی یا نسبی تعلق کے اظہار کے لئے ان کے ناموں کے آخر میں لگائے جاتے ہیں۔

۲؎ یعنی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ نہ تو بنگالیوں کی طرح اُن میں جوش و ولولہ ہے نہ قوّتِ عمل۔ وہ لیڈروں کے لکچر وغیرہ بھی نہیں سُننے اور گھر میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ اُن کا دل تو بس انگریز لیڈیوں کے ساتھ ڈنر کھانے میں لگتا ہے۔

۳؎ مطلب یہ ہے کہ نئی تہذیب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ ترقی کر رہے ہیں اور جنھوں نے زلف کا یہ جال ہمارے لئے بچھایا ہے وہ خوش ہو رہے ہیں کہ ہم خود ہی اپنے گلے میں پھانسی ڈال رہے یعنی اپنی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں۔ ہم تو بھولے اور ناسمجھ ہیں اور ہمارے مخالف بڑے کائیاں اور مکّار۔ ہم نے اُن کے ظاہری رنگ ڈھنگ پر فریفتہ ہو کر اُن کے تباہ کُن منصوبوں کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

۴؎ یہ اشعار امیر خسروؔ کی ایک مشہور غزل ؎ چشم مستِ عجبے زلفِ درازے عجبے کی طرز پر لکھے گئے ہیں۔ ترجمہ اُن کا یہ ہے:- وہ آفتِ جاں عجیب حُسن و جمال رکھتا ہے۔ عجیب چشمِ مست رکھتا ہے اور عجیب خال و رُخ۔ وہ میرے دل کو لوٹنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے اور میں اُس کی طرف مائل ہوں وہ ایک عجیب فکر میں ہے اور میں ایک عجیب خیال میں۔

شعروشاعری

شاعروں کا نالۂ موزوں

جب پڑی قومی مصیبت تو کسی نے کیا کیا
سب ہوئے اندوہ گیں خونِ جگر سب نے پیا

ہاں جو[1] شاعر تھے اُنھوں نے نالۂ موزوں کے ساتھ
داغِ دل کو آسمانِ نظم پر چمکا دیا

غیر فطری شاعری

سُنتا ہوں ناممکن[2] محال ہے خدائی سے گریز
لیکن کہتا تھا مجھ سے کل اِک انگریز

تم مانگ لو اپنے شاعروں سے گھوڑا[3]
فِطرت کے حدود سے زیادہ ہے وہ تیز

---

[1] مطلب یہ ہے کہ جب غیر ملکی حکومت کے مظالم سے قوم پر مصائب نازل ہوئیں تو ابناءِ قوم سب خونِ جگر پی کر رہ گئے اور سوائے غم و غصہ میں تڑپنے کے اُن سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ البتہ شاعروں نے اپنے غمزدہ دلوں کے پُر درد نالوں کو اشعار میں موزوں کر کے آسمانِ نظم پر چمکا دیا یعنی دنیا پر اپنی مظلومیت اور ظالموں کے ظلم کو آشکار کر دیا۔

[2] یعنی مشرقی شاعروں کا گھوڑا فطری حدود یعنی فطرت کی مقرر کردہ رفتار سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے شاعر ایسے مبالغہ سے کام لینا جانتے ہیں کہ وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں اور اپنے تخیل کے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ خدا کی خدائی سے بھی گریز کر سکتے ہیں۔ انگریز ہمارے شاعروں کے اِس کیرکٹر کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم تو اپنے شاعروں کے ذریعہ سے ہر مصیبت سے نجات حاصل کر سکتے ہو اور اپنے دل کو تسکین دے سکتے ہو۔

وقت نے شاعروں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے

شعر کہتا ہے بزم سے نہ ٹلو
داد لو واہ کی ہوا میں پلو
وقت کہتا ہے قافیہ[1] ہے تنگ
چُپ رہو، بھاگ جاؤ، سانس نہ لو

آج کل کی شاعری

لفظوں کے چمن بھی اِس میں کھِل جاتے ہیں
بے ساختہ قافیئے بھی مِل جاتے ہیں
دِل[2] کو مطلق نہیں ترقّی ہوتی
تعریف میں سر اگرچہ ہِل جاتے ہیں

[1] قافیہ تنگ ہونا محاورہ ہے بمعنی شعر کا قافیہ نہ مِلنا یا قافیہ کا شعر میں موزوں نہ ہونا۔ نیز بمعنی عاجز آنا۔ تنگ ہونا۔ گھبرانا۔ مطلب یہ ہے کہ اشعار کی خوبی تو شاعر کو اس پر مجبور کر رہی ہے کہ وہ اُنھیں جلسوں میں پڑھ کر سُنائے اور سُننے والوں کی داد یعنی تعریف و توصیف سے محظوظ ہو اور اپنے حوصلے بڑھائے۔ لیکن وقت ایسا نازک ہے جس نے شاعر کا قافیہ تنگ یعنی اُس کو عاجز و پریشان کر رکھا ہے اور مصالحِ وقت کا اقتضا ہے کہ دِل کے جذبات و خیالات کو دل ہی میں رکھا جائے اور کسی کے سامنے زبان پر نہ لایا جائے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ آج کل کی شاعری میں اگرچہ محاسنِ لفظی بھی ہوتے ہیں اور محاسنِ معنوی بھی اور اُن کو سُن کر سُننے والے بے ساختہ داد بھی دیتے ہیں لیکن دلوں پر اُن شعروں کا کوئی مُفید اثر نہیں پڑتا اور اُن سے کوئی اِصلاحی مقصد پورا نہیں ہوتا۔

آرائشِ الفاظ

جب واقعاتِ اصلی پیشِ نظر نہ آئے
شاعر نے کام رکھا تحسین و آفریں سے
الفاظ نے سنور کر اپنے قدم جمائے
نیچر[1] نے کی گذارش رخصت ہوں میں یہیں سے

شاعری کی تین قسمیں

اِک شاعری وہ ہے جو بڑھاتی ہے عقل و ہوش
اِک شاعری وہ ہے جو دلاتی ہے دل کو جوش
ارشاد ہو تو قسمِ سوم کو بھی کر دوں عرض
اِک شاعری وہ ہے کہ جو ہے صِرف واہ نوش[2]
لیکن کوئی بھی قسم ہو اچھا ہے شعر اگر
محفل کو غالباً ہمہ[3] تن پائیے گا گوش

[1] مطلب یہ ہے کہ جن شاعروں کی نظریں حقائقِ فطرت و مناظرِ کائنات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتیں اُن کا مقصدِ شعر گوئی صِرف سُننے والوں کی داد و تحسین حاصل کرنا ہوتا ہے اور جب سارا زورِ تخیّل الفاظ کی زیبائش و آرائش اور صنائعِ لفظی میں صرف کر دیا جاتا ہے تو شعر میں فطری شاعری کا رنگ اور فطرتِ انسانی پر اثر اندازی کرنے کی خوبی باقی نہیں رہتی۔

[2] واہ نوش فنّی اور دِلچسپ ترکیب ہے بمعنی لفظی واہ پینے والی، یعنی جس کا مقصد صِرف یہ ہوتا ہے کہ سُننے والے اشعار کو سُن کر واہ واہ کریں۔

[3] ہمہ تن گوش پانا یعنی اہلِ مجلس کو شعر سُننے کی طرف پوری طرح متوجہ پانا اور محاسنِ شعری سے محظوظ ہوتے دیکھنا۔

کلامِ حافظ و فردوسی کی بجائے باقاعدہ لٹریچر

اب کہاں نشو و نما پائے نہالِ معنی — کس زمیں پر دلِ پرجوش کی بدلی برسے
بزمِ حافظ[1] ہے نہ میدان ہے فردوسی کا — قوم کو کام ہے باضابطہ لٹریچر سے

کام کی اور کھیل کی شاعری

اِک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے — اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحقِ داد — منزل سے اُس کو کام ہے اِس کو کلیل[2] ہے

[1] حافظ = خواجہ حافظ شیرازی ایران کے مشہور اہلِ دل شاعر۔ فردوسی = تخلص ہے حکیم ابوالقاسم منصور طوسی کا جو سُلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ایک مشہور باکمال شاعر تھے اور جن کا شاہنامہ فارسی لٹریچر کی ایک مشہور تاریخی تصنیف ہے۔ باضابطہ لٹریچر سے مراد قانونی اور سرکاری محکموں کے قواعد و ضوابط کی کتابیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب قوم کو زیادہ تر کام قوانین و قواعد و ضوابط کی کتابوں سے پڑ رہا ہے۔ نہ اُن کے تخیّل میں حافظ کی سی بلندی رہی نہ اُن کے دِلوں میں فردوسی کا سا جوش۔ معنی آفرینی کے بجائے اب سب معنی فہمی کے چکّر میں پڑ گئے ہیں۔

[2] کُلیل = خوشی میں گھوڑے کا اُچھلنا کودنا۔ مطلب اشعار کا یہ ہے کہ ایک شاعری تو وہ ہے جو فطری جذبات کا اظہار کرتی اور انسانی فطرت پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور ایک شاعری وہ ہے جس کا مقصد صرف شعری مقابلہ کے کھیلوں یعنی مشاعروں میں سامعین سے تحسین و آفرین کا حاصل کرنا ہے۔ بزبانِ استعارہ فطری شاعری ایک ایسا گھوڑا ہے جس کے سامنے ایک منزل ہے یعنی جس میں کسی قومی مقصد کو مدِّنظر رکھا جاتا ہے اور دنگلی شاعری ایک ایسا گھوڑا ہے جو خوشی میں صرف اُچھلتا کودتا ہے اور جس کے سامنے کوئی منزل یا مقصد نہیں ہوتا۔

شاعروں کا مذہب

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدّعائے خاص — جس[1] رخ ہے قافیہ مرا مطلب بھی ہے وہی
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جنابِ شیخ — جس[2] وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی

[1] یعنی آج کل کی شاعری خیالات و جذبات کی نہیں بلکہ ردیف و قافیہ کی پابند ہوتی ہے یعنی ردیف اور قافیہ جس طرف خیالات و جذبات کو پھیر دیتے ہیں اُسی رنگ میں شعر کہے جاتے ہیں۔

[2] یعنی شاعروں کا تخیل اُن کے مذہب کا نہیں بلکہ شاعروں کا مذہب اُن کے تخیل کا پابند ہوتا ہے۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے جو اچھا خیال اُن کے دماغ میں آجاتا ہے اُسی کو قلم کر دیتے ہیں خواہ وہ مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔

اکبرؔ اور اُن کی شاعری

(بزبانِ خود)

صاحب کی محفل اور اکبرؔ کے احباب

واں شوکت و زینت کے جو اسباب بہت ہیں — معنی کے یہاں گوہرِ نایاب بہت ہیں

صاحب کی سی محفل تو میسّر نہیں لیکن — صد شکر کہ اکبرؔ کے بھی احباب بہت ہیں

بزمِ اکبرؔ سے اعراض

بزمِ اکبرؔ دانش آموز و نشاط انگیز ہے — ہر سخن اُس کا لطیف و خوب و معنی خیز ہے

بالارادہ اُس سے جو کرتا ہے اعراض و گریز — ناتواں ہی ہے وہ یا کودن ہے یا انگریز[۱] ہے

پیری آئی - ہوئی جوانی رخصت

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت — ساتھ اس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت

ہے اب[۲] تو اسی کا انتظار اے اکبرؔ — ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

۱؎ انگریز سے مراد یہاں انگریزوں کے مقلّد ہیں۔ جو نئی تہذیب کے ایسے گرویدہ ہو گئے ہیں کہ حضرت اکبرؔ جیسے پرانے خیال کے دانشمند، دُور اندیشوں کی کوئی بات اُن کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

۲؎ یعنی بڑھاپے میں کوئی لطفِ زندگی باقی نہیں رہتا اور ہر وقت یہی انتظار رہتا ہے کہ موت کب آتی ہے۔

اکبرؔ کے اشعار کا اثر ہوگا مگر ٹھوکریں کھا کر

دیکھے اکبرؔ کے آج کچھ اشعار — آئی بے حد پسند یہ گفتار
تجربہ[1] خود بنے گا واعظِ دین — لیک بعد از خرابیٔ بسیار

اکبرؔ کی ایک ہی رٹ

گردن خالق کے آگے جھکتی ہی نہیں — اب ابتری سے یہ قوم رُکتی ہی نہیں
ہوتی نہیں ان میں کچھ بھی غیرت پیدا — اور[2] بات اکبرؔ کی ہے کہ چُکتی ہی نہیں

کنجِ تنہائی اور خدا کا دھیان

ارماں نہ شراب و بزمِ شاہد کا ہے — ساماں[3] نہ محافل و مساجد کا ہے
اکبرؔ کو ہے اُنس کنجِ تنہائی سے — دھیان اُس کو فقط خدائے واحد کا ہے

[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نئی تہذیب پر فریفتہ ہو کر خدا پرستی و دینداری کی صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں وہ کچھ روز کے تلخ تجربوں کے بعد خود ہی دھکّے کھا کر راہِ راست پر آجائیں گے لیکن اُس وقت جب کہ نئی تہذیب کے تجربوں سے اُن کو بہت بڑا نقصان پہنچ چکا ہوگا۔ دوسرا مصرعہ شیخ سعدی کے اُس شعر کا ہے ؎ انچہ دانا کند کند ناداں ، لیک بعد از خرابیٔ بسیار — ترجمہ:۔ نادان بھی کرتا وہی ہے جو دانا کرتا ہے مگر کافی نقصان اُٹھانے کے بعد۔
[2] یعنی یہ دیکھنے کے باوجود کہ اُن کی نصیحتوں کا آج کل کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور برابر تباہی کی طرف چلی جا رہی ہے اکبر نصیحتیں کئے ہی جاتے ہیں۔
[3] یعنی بُڑھاپے میں اس کی بھی توفیق نہیں ہے کہ دینی محفلیں منعقد کی جائیں یا مسجدوں کی رونق کو بڑھایا جائے۔

نظّارۂ شاہدِ معانی

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے — اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں کوچۂ سخن میں اکبرؔ — نظّارۂ[1] شاہدِ معانی کے لئے

دل و دماغ بے قابو

فلک مجھ کو اگر ایوان دیتا اور چمن دیتا — مزا[2] جب بھی مرے دل کا یہی داغِ کہن دیتا
دماغ و دل پہ اب قابو نہیں ہے ورنہ اے اکبرؔ — حریفوں کو دکھاتا بانکپن، دادِ سخن دیتا

نظمِ اکبرؔ دافعِ سحر و کفر

ایمان[3] کی ہے تاک کافری ہے تو یہ ہے — تقویٰ بے دم ہے ساحری ہے تو یہ ہے
نظمِ اکبرؔ ہے دافعِ جادو و کفر — ماشاء اللہ شاعری ہے تو یہ ہے

[1] یعنی میری شعر گوئی کا مقصد اُن حسین مطالب و معانی سے لطف اندوز ہونا ہے جو مجھے اپنے اشعار میں نظر آتے ہیں۔
[2] یعنی اگر مجھ کو بڑے امیروں کی طرح رہنے کے لئے محل اور سیر و تفریح کے لئے چمن نصیب ہوتے تب بھی سب سے زیادہ مزہ اور لُطف مجھے اس میں آتا کہ قوم کی بے راہ روی کے غم کا جو داغ ابتدائے عمر سے میرے دل میں بیٹھ گیا ہے اُس کو اپنے اشعار کے ذریعہ سے ابناءِ قوم کو دکھاتا رہوں۔
[3] مطلب یہ ہے کہ آج کل کی کافری محض بے ایمانی نہیں، بلکہ ایمان دشمنی ہے۔ یعنی کفر کے دوست ایمان کو مٹا دینا چاہتے ہیں اور نئی تہذیب کی یہ ایک بڑی جادوگری ہے کہ اُس نے خدا ترسی اور دینداری کو بے حس و بے جان کر دیا ہے۔ مگر اکبر کے اشعار اُس کفر کو بھی دبا رہے ہیں اور اُس جادو کو بھی۔

عام شاعروں کی پیروی

کہتے ہیں شاعری یہ تری بے اصول ہے — کہتا ہوں صاف میں تو نہیں تجھ کو مانتا
میں[1] نے کہا کہ آپ کی کرتا جو پیروی — تو آپ کے سوا کوئی مجھ کو نہ جانتا

انقلابِ زمانہ کا اثر اکبر پر

رنگ ہی کچھ اور اب تو روز و شب کا ہو گیا — جس طرف دیکھو دگرگوں حال سب کا ہو گیا
اس تغیر سے مگر اُس کو نہیں پہنچا ضرر — انقلاب[2] آیا بھی اکبر پر تو رب کا ہو گیا

زبان تیغ کے بجائے عصا ہو گئی

میری طرف سے سارا جہاں بدگماں ہے اب — آزادیِ کلام وہ مجھ میں کہاں ہے اب
رکھتی ہیں پھونک پھونک[3] کے باتیں مری قدم — تیغِ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب

[1] یعنی میں بھی اگر اس رنگ کی شاعری کرتا جس رنگ کی آج کل کے عام شعرا کر رہے ہیں تو سوائے اُن شاعروں کے مجھے اور کوئی نہ جانتا اور میری اصلاحی اور تبلیغی شاعری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ نہ ہوتی۔

[2] یعنی خدا ہے برگشتگی کا انقلاب دنیا میں آیا ہوا ہے اُس کا اثر اکبر پر اُلٹا ہوا ہے کہ وہ "رب" کا ہو گیا ہے یعنی اُس کو اپنے رب سے اور زیادہ تعلق و وابستگی پیدا ہو گئی ہے۔ پُر لطف صنعتی خوبی اس شعر میں یہ ہے کہ لفظ اکبر کو اگر اُلٹ دیا جائے تو "رب کا" ہو جاتا ہے۔ گویا لفظی انقلاب بھی معنوی انقلاب کی تصدیق کر رہا ہے۔

[3] پھونک پھونک کر قدم رکھنا، محاورہ ہے یعنی بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اربابِ حکومت اور علم بردارانِ تہذیبِ جدید کو میری طرف سے اور میری شاعری کے مقاصد کے متعلق بہت بدگمانیاں ہو گئی ہیں اور میرے شعروں سے ایسے مطلب نکالے جاتے ہیں جس سے مجھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اس لئے مجھے شعروں کے لکھنے اور اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ دوسرے شعر اور اپنی زبان یعنی اپنے شعروں سے تلوار کا کام لیتے ہیں اور مجھے اپنے خیالات کو زبان کی لاٹھی کے سہارے سے چلانا پڑتا ہے۔ یعنی خیالات کے اظہار میں ایسے لفظوں کا التزام رہنا پڑتا ہے جو قانونی احتیاط اور مصلحتِ وقت کے خلاف نہ ہوں۔

واہ واہ کے لئے لفظوں کی دوکان

خوب اِک ناصحِ مشفق نے یہ ارشاد کیا — بزم میں اُس نے تعلّی جو کل اکبر کی سنی
نہ تری فوج نہ شاگرد نہ پیر اور نہ مرید — نہ تو ارجن[1] ہے نہ سقراط، رشی ہے نہ مُنی
کس نگیں پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں — نوٹ بک تیری شکستہ تری پنسل ہے گھُنی[2]
فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں — واہ وا کے لئے[3] لفظوں کی دکاں تو نے چُنی
طبع میں تیری وہی خامیِ حرصِ دُنیا — آتشِ خوفِ خدا سے نہ جلی ہے نہ بھُنی
خود پرستی ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے — دِل دہی[4] کم ہے تو ہے دِل شکنی چار گُنی

تکیہ[5] بر جائے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف
مگر اسبابِ بزرگی ہمہ آمادہ کُنی

[1] ارجن = پانڈوں کے تیسرے بھائی جنھوں نے مہا بھارت کی لڑائی میں کرشن جی کے مشورہ پر اُپدیش سے جسے گیتا کہتے ہیں متاثر ہو کر راجہ کرن اور بڑے بڑے سورماؤں کو قتل کیا تھا اور جو ایک بڑے تیر انداز تھے۔ سقراط = یونان کا ایک بہت بڑا اور مشہور فلسفی جس پر کفر کا الزام لگایا گیا اور جس کو زہر کا پیالہ پی کر جان دینی پڑی۔ رشی اور مُنی ہندی میں عابد و زاہد اور مقدس بزرگ کو کہتے ہیں۔

[2] گھُنی بمعنی گھُن کھائی ہوئی۔ کھوکھلی۔ اندر سے گلی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو تمہارے پاس کوئی ظاہری ساز و سامان ہے نہ لاؤ لشکر۔ نہ تمھارا کوئی شاگرد ہے نہ مرید۔ کوئی خاص علمی اور عملی قابلیت بھی نہیں ہے۔ پھر تم کس بات پر گھمنڈ کر رہے ہو۔

[3] یعنی شعر گوئی سے تمھارا مقصد نہ تو اپنی دماغی اور روحانی قوتوں کو بیدار کرنا ہے اور نہ حوادثِ عالم سے عبرت حاصل کرنا۔ لفظوں کی یہ دوکان تم نے صرف واہ واہ حاصل کرنے یعنی اپنی شاعری کی تعریف و توصیف سُننے کے لئے کھولی ہے۔

[4] یعنی دنیا و دی نمود کی حرص کی خامی ابھی تک تیرے دل میں موجود ہے کیونکہ ابھی تو نے اُس کو خوف و خشیتِ الٰہی کی آگ میں نہیں تپایا ہے۔ یعنی اگر تیرے دل میں خدا کا ڈر ہوتا تو وہ سوائے خدا کے کوئی اور آرزو نہ کرتا۔

[5] یعنی خود غرضیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ابناء قوم کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنے اور اُن کی خدمت کرنے کے مقابلہ میں ایسی حرکتیں ہم سے بہت زیادہ سرزد ہوتی ہیں جن سے اُن کے دلوں کو تکلیف پہنچتی اور ہم سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔

[6] یہ فارسی شعر بھی کسی پرانے شاعر کا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ بزرگوں کی جانشینی پر اعتماد مشیخت و تعلّی کی بنا پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جو بزرگ بننے کے لئے ضروری ہیں۔

شیخ و سیّد کی ذات سے خطاب

شیخ و سیّد سے[1] تو خالی نہیں ذکرِ شاعر — ذات سے اُن کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر
طبعِ مجنوں مری ہے عاشقِ ملّت اے دوست — کیوں روا رکھتا ہے ناحق مری ذلّت اے دوست
راہِ وحشت میں[2] اگر قیس سے لغزش ہو جائے — حیف لیلیٰ پہ جو آمادۂ کاوش ہو جائے

دل کو گرم رکھنے والا نغمہ

پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو[3] ولایتی نہیں دیسی چُھرا سہی
اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے — دِل[4] کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

[1] یعنی اکبر کی شاعری میں شیخ و سیّد کی قومی اور ملّی رہنمائیوں پر طنز و طعن تو ضرور ہوتا ہے لیکن اُس سے کسی شیخ یا سیّد کی ذاتی توہین و تنقیص مقصود نہیں ہوتی۔

[2] یعنی اکبر کو اپنی ملّت اور قوم کا عشق ہے اور اس عشق کے جوش میں اگر اکبر سے کوئی لغزش یا غلطی ہو جاتی ہے تو یہ غلطی ایسی ہی ہے جیسی کہ لیلیٰ کے عشق میں مجنوں سے ہو جائے اور ایسی والہانہ اور غیر اختیاری غلطی پر اکبر کا مخالف ہو جانا اور اُس کی تذلیل کرنا مناسب نہیں ہے۔

[3] یعنی اگرچہ ہمارے پُرانے مذہبی رہنماؤں میں وہ ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ نہیں ہے جو نئے لیڈروں میں ہے لیکن اُن کی مثال ایسی ہے جیسے دیسی چھرے کی جو ولایتی چاقو کے مقابلہ میں بھدا سا بے ڈھنگا اور بوجھل ہونے کے باوجود ولایتی چاقو سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے اِس لئے مجھے تو نئی روشنی کے لیڈروں کے مقابلہ میں پُرانے مذہبی رہنما ہی زیادہ محبوب و عزیز ہیں۔

[4] یعنی اکبر کی شاعری شاعری کے معیار پر پوری نہ بھی اُترے دلوں پر اثر تو کرتی ہے اور قوم کے حق میں مفید ثابت ہوتی ہے۔

بُلبل کو بے سُرا کہنے والے

ناواقفِ وزنِ شعر جو مجھ کو کہے — اُس کے آگے ضرور ہے چُپ رہنا
بُلبل[1] کو بھی بے سُرا وہ کہہ دے گا کبھی — ایسے سنجیدہ شخص کا کیا کہنا

بھجن کی دُھن میں بُتِ طنّاز کی تردید

زباں اکبر کی اِس طرزِ سخن پر ناز کرتی ہے — بھجن[2] کی دُھن میں تردیدِ بُتِ طنّاز کرتی ہے
معزّز کرتی ہے اُن کی نظر ممتاز کرتی ہے — بس[3] اِتنا ہے دلِ الحاد کو بھی باز کرتی ہے
معاشر کیمپ میں کیوں جا بسے مجھ سے نہ پوچھ اے دل — مثالِ اوّلیں[4] خود تجھ پہ کشفِ راز کرتی ہے

دلِ رنگین کا خون

یہ کیا سبب ہے جو رہ رہ کے جی[5] بھر آتا ہے — یہ کیا ہوا جو مجھے شہر کاٹے[6] کھاتا ہے

[1] یعنی جو لوگ اکبر کے اشعار کے پُر اثر ہونے کی خوبیوں کو نہیں دیکھتے بلکہ اُن کے وزن سے گر جانے وغیرہ کے ظاہری شعری نقصوں کو دیکھتے ہیں وہ تو بلبل کے پُر اثر نالوں میں بھی بے سُرا پن محسوس کر سکتے ہیں۔

[2] یعنی ابناءِ قوم و وطن کے محبوب و مرغوب خیالات و معتقدات کی تردید ایسے پیرایہ سے کرتی ہے کہ بظاہر وہ تردید تائید معلوم ہوتی ہے۔

[3] یعنی انگریزوں کے منظورِ نظر ہو جانے سے عزّت و امتیاز تو ضرور حاصل ہوتا ہے مگر ساتھ ہی بے دینی اور مذہب سے روگردانی کا راستہ بھی کُھل جاتا ہے۔

[4] جی بھر آنا بمعنی دل کا غمزدہ اور آنکھوں کا پُرنم ہو جانا۔

[5] کاٹے کھانا بمعنی خوف ناک معلوم ہونا۔ تکلیف دینا۔

یہ خون[1] ہوگئی کیوں میرے دل کی رنگینی — یہ داغ[2] دینے لگی کیوں چمن کی گُل چینی
اُداس ہوگئی کیوں روح خانۂ تن سے — اُچاٹ ہوگئیں کیوں بُلبلیں یہ گلشن سے

شیطان پر طعن کا طعنہ

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں — گو اُس نے بہت کہا۔ کہا کچھ بھی نہیں
زلف[3] و کمرِ بُتاں کا مفقود ہے ذکر — شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

مقرّر کردہ حُدود شاعری

نہ[4] ہوں جو شعر مرے آپ کو پسند نہیں — پسند فرض نہیں اور مجھے گزند نہیں

[1] خون ہونا بمعنی مارا جانا۔ ختم کر دیا جانا۔ دل کی رنگینی خون ہوگئی یعنی زندہ دلی اور دل کی اُمنگیں ختم ہوگئیں۔

[2] داغ دینا بمعنی رنج دینا۔ تکلیف پہنچانا۔ یعنی زندہ دلی ختم ہو جانے پر گُل چینی چمن جیسے تفریحی مشغلوں سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔

[3] یعنی اکبر کے شعروں میں چونکہ سوائے اس کے کہ اہناءِ قوم کے شیطانی افعال و اعمال پر لعن و طعن ہے، نہ حسینوں کے حُسن کا ذکر ہے نہ عشق و عاشقی کا، اِس لئے اُس کے اشعار بالکل بدمزہ اور پھیکے ہیں اور اگرچہ کہنے کو تو اکبر نے ہزاروں شعر کہے ہیں مگر آج کل کے عام مذاق کے لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

[4] اس شعر میں تعقید لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میرے شعر آپ کو پسند نہیں ہیں تو نہ ہوں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر جو شعر بھی کہے وہ پسند بھی کیا جائے اس لئے میرا شعر پسند نہ آنے سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

بجز[1] خطائے نظر اور بھول چوک کاتب کے — کچھ اعتراض اگر ہیں تو سود مند نہیں
حدود میں نے معیّن کئے ہیں اپنے لئے — اور ان حدود کے اندر کہیں میں[2] بند نہیں

شاہدِ معنی پر ظرافت کا لحاف

لغزشیں مدِّ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر — دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اُس کو معاف
سردِ[3] موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار — شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اکبر کے کلام سے ناراضی

اکبر کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے — نامہ ہے نہ پیغام نہ حصّہ ہے نہ بخرا
مانا کہ حسینوں کے لئے ناز ہے لازم — لیکن[4] کوئی پوچھے تو کہ پاگل سے بھی نخرا

[1] یعنی میرے اشعار پر اگر ایسے اعتراضات کئے جائیں جن کا تعلق میری کسی بھول چوک یا کتابت کی غلطی سے ہے تو یہ اعتراضات تو میرے لئے فائدہ مند ہو سکتے ہیں اور جو دوسرے اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ اختلافِ خیالات و عقائد و مذاق سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے بیکار ہیں۔

[2] بند نہ ہونا بمعنی مجبور نہ ہونا۔ یعنی جو قیود و حدود میں نے اپنی شاعری کے لئے مقرّر کر لئے ہیں اُن کا پابند رہ کر ہر رنگ میں میں شعر کہہ سکتا ہوں۔

[3] مطلب یہ ہے کہ جن لطیف و حسین مطالب و معانی کو میں اپنے شعروں میں ظاہر کرنا چاہتا تھا زمانہ کی ذہنیت اور سیاسی فضا کے ناموافق و خطرناک ہونے کی وجہ سے مجبوراً مجھے اُن مطالب کو ظرافت کے رنگ میں پیش کرنا پڑا ہے۔

[4] یعنی خرافات بکنے والا تو پاگل ہوا کرتا ہے اُس کی ہنسی مذاق کی باتوں سے ناراض ہو کر قطع تعلق کر لینا دوستوں کے لئے مناسب نہیں ہے۔

کہتے بھی خوب ہیں، سُنتے بھی خوب ہیں

بے جا ہوا عتراض تو اُس پر بھی ہیں خموش — گو دِل ہی دل میں غصّے سے بُھنتے بھی خوب ہیں
کہتے ہیں خوب حضرتِ اکبر شک اِس میں کیا — لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سُنتے[1] بھی خوب ہیں

عارفانہ شاعری کے متعلّق بدگمانی

اِک غزل میں اتفاقاً میرا اِک مصرعہ یہ تھا — دیدۂ عبرت سے رنگِ دَیرِ[2] فانی دیکھئے
کوئی بول اُٹھا زوالِ حُسنِ بُت مقصود ہے — اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے — بزمِ دنیا میں یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

---

[1] سُنتے بھی خوب ہیں، یعنی بُرا بھلا بھی اُن کو بہت کہا جاتا ہے یا یہ کہ اپنی بُرائیوں کو بہت صبر و ضبط سے سُنتے ہیں۔

[2] یعنی دیر (بُت کدہ) کو فانی کہہ دینے سے بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوگئی کہ میرا اشارہ مغربی بُت کدہ کی طرف ہے یعنی میرے شعر سے بُتانِ مغرب کے زوالِ حُسن کی بدشگونی نکلتی ہے۔ حالانکہ میرا مصرعہ عارفانہ رنگ میں تھا اور میں نے تمام دنیا و مافیہا ہی کو ایک بُت کدہ سے تعبیر کیا تھا جس میں پھنس کر انسان خدا کو بُھول جاتا ہے مگر بُت کدۂ عالم کا حوادثِ فنا کی زد میں آتا رہنا یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ خدا خانہ نہیں بلکہ بُت کدہ ہی ہے۔ مگر حکومت پرستوں کی بدگمانیاں اس قدر بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ ایسے عارفانہ شعروں سے بھی اپنے زوال کا مطلب نکال لیتے ہیں۔

ذاتیات

نواب محسن الملک کی کارگزاری

مہدی[1] کو بُرا بھلا جو چاہو کہو ‖ لیکن دکھلا دی اُس نے بیوٹی اپنی [حسن کردار سے مراد]

لاکھوں ہی کے ڈھیر کر دئے کالج میں ‖ پوری کر دی یہ اُس نے ڈیوٹی اپنی [یعنی لاکھوں روپیہ جمع کر دئے — فرض]

ڈاکٹر مینارڈ کی مہارتِ فن

ڈاکٹر مینارڈ[2] ہیں اپنے ہنر میں لاجواب ‖ ہاتھ[3] اُن کا برق ہے نشتر شعاعِ ماہتاب

ہفت سالہ تھا مرض دَم بھر میں زائل ہو گیا ‖ آنکھ روشن ہو گئی جاتا رہا سارا حجاب [جاتا رہا — یعنی بے نظری کا پردہ ہٹ گیا]

پانچ[4] ہی دن میں نہ پٹّی تھی نہ وہ بستر کی قید ‖ حُسنِ کلکتہ تھا اور میری نگاہِ انتخاب

ڈاکٹر مینارڈ کو اللہ رکھے شادکام ‖ اور رہے خلقِ خدا اُن کے ہنر سے فیض یاب [بامراد، خوش و خرم]

---

[1] مراد مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک مرحوم رفیق و جانشینِ سرسیّد۔

[2] ڈاکٹر مینارڈ اُن ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر صاحب کا نام ہے جنھوں نے ۱۹۰۹ء میں حضرتِ اکبر کی آنکھ کا آپریشن کیا تھا۔ یہ اشعار حضرت اکبر نے ڈاکٹر مینارڈ کی فرمائش پر کہے تھے اور اِن کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فریم میں لگا کر اپنے ہاں آویزاں کر لیا تھا۔ (حیاتِ اکبر صفحہ ۹۷)

[3] یعنی ہاتھ بجلی کی طرح تیزی سے چلتا اور سکنڈوں میں آپریشن کر دیتا ہے اور نشتر شعاعِ ماہتاب ہے یعنی جس طرح چاند کی کرنیں آنکھوں کو تکلیف نہیں دیتیں اسی طرح اُن کے نشتر سے بھی تکلیف نہیں ہوتی۔

[4] یعنی پانچ ہی دن میں پٹّی کھُل گئی اور بستر سے اُٹھنے کی اجازت مل گئی۔ کلکتہ کی خوش نمائیاں مجھ کو نظر آنے لگیں اور اپنی آنکھ کے آپریشن کے لئے ڈاکٹر مینارڈ پر نظرِ انتخاب پڑنے سے مجھ کو مسرّت ہوئی۔

مدرسۂ الٰہیات کانپور اور منشی رحمت اللہ رعدؔ

مدرسۂ الٰہیات[1] خوب ہے کانپور میں — قوم کی سچ جو پوچھئے خدمتِ واقعی یہ ہے
حمدِ خدا کے غلغلے ہوں گے بلند اب یہاں — اِس میں ذرا بھی شک نہیں دین کی بہتری یہ ہے
حضرتِ رعدؔ کا یہاں جوش و خروش دیکھ کر — سب نے کہا یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ[2] یہ ہے

نواب محسن الملک مرحوم کی رہنمائی

مہدی سا بزرگ صاحبِ جاہ تو ہے — سنجیدہ کلام کے لئے واہ[3] تو ہے
منزل کا اگر پتہ[4] نہیں ہے نہ سہی — دل کش روشیں ہیں دل کشا راہ تو ہے

[1] یہ مدرسۂ الٰہیات مولٰنا آزاد سبحانی نے کانپور کے مشہور قومی کارکن جناب منشی رحمت اللہ صاحب رعدؔ مالک بڑی جنتری کی کوشش و اثرات سے قائم کیا تھا۔

[2] یہ قرآن مجید کی سورۂ رعدؔ کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے جس کا مفہوم ہے "بادلوں کی گرج حمدِ خدا کے ترانے گاتی ہے" یعنی یہ آیت مجازاً حضرتِ رعدؔ کے اُس جوش و خروش پر بھی صادق آتی ہے جو خدا کا نام بلند کرنے اور اُس کی عظمت و شان کا نقش بٹھانے کے لئے مدرسۂ الٰہیات کے قائم کرنے میں حضرتِ رعدؔ دکھا رہے تھے۔

[3] (۳) یعنی کوئی ایسا شخص تو ہے جو سنجیدہ باتوں کی قدر کرنا جانتا ہے۔

[4] (۴) یعنی اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ ہماری منزلِ مقصود کیا ہے اور ہماری قوم کو کیسی قوم بننا ہے لیکن جن راستوں پر نواب محسن الملک وغیرہ قوم کو چلا رہے ہیں کم از کم وہ راستے تو کافی دل کش اور دلوں کو فرحت بخشنے والے ہیں۔

ایڈیٹر جبل المتین سے معذرت[1]

ملال کا تو محل اے حضور کچھ بھی نہیں — خدا گواہ ہے میرا قصور کچھ بھی نہیں
برائے لطف و کرم لائیے یہاں تشریف — الٰہ آباد علی گڈھ سے دُور کچھ بھی نہیں
محبت آپ کی ہے میرے دل میں مستحکم — میں صاف لکھتا ہوں یہ مکر و زور کچھ بھی نہیں
وہ امر آپ کی جانب سے میں نہ سمجھا تھا — یہ چاہیے کہئے کہ تجھ کو شعور کچھ بھی نہیں

مولوی محمد کریم صاحب کی بھیجی ہوئی مچھلی

عمدہ مچھلی مسلّم و خام ملی — تحفہ پایا مرادِ خدّام ملی
ممنونِ کریم[2] کیوں نہ ہوں اے اکبرؔ — وہ دام[3] میں لائے مجھ کو بے دام ملی

ایک دوست کی غلط فہمی

اک دوست[4] ہمارے ہیں تپ اُن کو شدید آئی — جھیلا کئے بیماری مُدّت میں شفا پائی

[1] ان اشعار پر یہی عنوان کلیات میں دیا ہوا ہے۔ جبل المتین کلکتہ کا ایک مشہور فارسی اخبار تھا جس کے ایڈیٹر سید جلال الدین طہرانی تھے۔ اشعار میں نہ معلوم کس امر کی معذرت ہے۔ کلیات جلد اوّل میں اس پر حاشیہ ہے کہ یہ ایڈیٹر جبل المتین کے نام دعوت نامہ ہے۔

[2] مولوی محمد کریم صاحب تحصیلدار سے مراد ہے جن کے نام ۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو بمقام میجا ضلع الٰہ آباد (جہاں وہ متعین تھے) حضرت اکبرؔ نے یہ قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ مولوی محمد کریم صاحب نے ۱۹۲۹ء میں اپنے وطن دریا باد ضلع بارہ بنکی میں وفات پائی (مولوی عبدالماجد صاحب)۔

[3] قطعہ کا حُسن اسی مصرع میں ہے۔ دام میں لانے سے مراد جال سے پکڑنا ہے اور بے دام ملنے سے مفت حاصل ہونا۔

[4] اس قطعہ پر کلیات میں کوئی حاشیہ نہیں ہے۔ خبر نہیں حضرت اکبرؔ کے یہ دوست کون بزرگ ہیں۔

لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے — حالانکہ ابھی قوت پاؤں میں نہیں پاتے
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت[۱] — وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ
یہ میری غلط بندش وہ اُن کی غلط فہمی — میں[۲] حد سے بڑھا شاعر وہ حد سے سوا وہمی

مولانا شبلی کو کھانے کی دعوت

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی[۳]
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اُس کو پلاؤ قلیا

مولانا شبلی کی شمس العلمائی

شبلی کا قدم علم کی منزل پہ جما ہے — رفتار[۴] میں آخر کی قلم اُس کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزمِ سلف اس کے بیاں سے — روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلما[۵] ہے

---

۱ "لاہور بلا قوت" کا کلمہ تلفظ میں لاحول ولا قوۃ سے ملتا جلتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ شیطان کے بھگانے کے لئے بولا جاتا ہے۔
۲ یعنی میری شاعری کا کمال تھا کہ میں نے "لاہور بلا قوت" الفاظ کی ایسی بندش رکھی کہ اُسے لاحول ولا قوۃ بھی سمجھا جا سکتا تھا اور یہ دوست کا حد سے بڑھا ہوا وہمی پن تھا کہ اُنھوں نے "لاہور بلا قوت" کو لاحول ولا قوۃ ہی سمجھا۔
۳ یعنی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم مشہور مصنف و مورخ، وفات ۱۹۱۴ء
۴ یعنی وہ اپنی قابلیتِ تحریر سے خطاب واعزاز حاصل کر رہے ہیں۔
۵ شمس العلماء کا خطاب انگریزی حکومت میں اُن حضرات کو دیا جاتا تھا جو کسی علمی قابلیت میں ممتاز ہوتے تھے۔

سر سلیمان[۱]، جج ہائی کورٹ

بحمد اللہ کہ حاصل آپ کو ہر ایک نعمت ہے — ذہانت ہے سعادت ہے شرافت ہے لیاقت ہے
علومِ مغربی میں نمبرِ اوّل آپ کا آیا — عزیز و دوست جو ہیں سب کو اُس سے اک مسرت ہے
گورمنٹ آپ کی مدّاح ہے اس قابلیت پر — اکابر قوم کے خوش ہیں ہر اک کو فخر و عزت ہے
پئے تکمیلِ دانش قصد ہے اب مُلکِ مغرب کا — مبارک ہو کہ لندن کا سفر ہے وقتِ رخصت ہے
مبارک آپ کو احباب کا یہ جلسۂ رخصت — حقیقت میں مبارک وقت ہے اور عمدہ ساعت ہے
بخیر و کامیابی آپ واپس آئیں لندن سے — یہی سب کی دُعا اِس دم بہ صد جوشِ طبیعت ہے
زباں پر سب کی جاری ہے یہ شعرِ حضرت اکبر — کہ جن کی نظم پر نظمِ ثریا[۲] کو بھی حیرت ہے

عطا کر قسمتِ تصنیفِ سعدی یارب اس گل کو
پھلے پھولے زمانے میں گلستاں بوستاں[۳] ہو کر

---

۱ یہ قطعہ ڈاکٹر سید سلیمان جونپوری بیرسٹرایٹ لا کے متعلق ہے جو آخر میں سر سلیمان تھے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج رہے۔ پھر چیف جسٹس ہوئے آخر میں سپریم فیڈرل کورٹ کے جج اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چینسلر بھی (مولوی عبدالماجد دریابادی) سر سلیمان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں دہلی میں ہوا اور قبرستانِ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب پائین درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ میں مدفون ہیں۔
۲ ثریا بمعنی پروین یہ چھ ستارے ہیں جو باہم متصل ہیں اور اسی باہمی اتصال کی وجہ سے نظم ثریا (یعنی چھ ستاروں کا ایک جھمکے میں پرویا ہوا ہونا) خوش نظمی کی ایک مثال ہو گیا ہے۔
۳ گلستاں بوستاں یہ دونوں فارسی لفظ بمعنی باغ کے ہیں اور شیخ سعدیؒ کی مشہور عالم و مقبولِ خاص و عام اخلاقی کتابوں کے نام بھی ہیں۔ پھلنا پھولنا محاورہ بھی ہے بمعنی بامراد و کامیاب اور مقبول و مشہور ہونا...

منشی جگن پرشاد

گو دلِ بیتاب امیدِ وطن پر شاد ہے ۔۔۔ شاق لیکن فرقتِ منشی جگن پرشاد[1] ہے

لالہ نہال چند

ممدوحِ خاص و عام ہیں لالہ نہال چند[2] ۔۔۔ در اُن کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند
چندے وصول کرنے کو ہیں پیشوا بہت ۔۔۔ سب کرتے ہیں مباحثِ قرآن و وید و ژند[3]
لیکن دقیق و سخت جو ہوتا ہے کوئی کام ۔۔۔ اُس وقت ہیں جناب ہی ہوتے ہیں دردمند
حکام کے حضور میں کرتے ہیں التماس ۔۔۔ قانون[4] سے جو ہوتا ہے کچھ شبۂ گزند

تقریر رنٹ بل[5] پہ جو کی ٹک بول اٹھا
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند[6]

---

[1] کلیات اکبر جلد اول طبع اول میں اس پر حاشیہ صرف یہ ہے "آگرہ سے تبدیلی کے وقت" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منشی جگن پرشاد صاحب کوئی انگریزی حکومت کے افسر تھے۔ "پرشاد" کی ذومعنی ردیف قابلِ داد ہے۔

[2] لالہ نہال چند شروع صدی میں اُس وقت کی کونسل کے ایک ذی اثر ممبر تھے۔ (مولوی عبدالماجد دریابادی)

[3] وید۔ ہندوؤں کی مشہور قدیم کتاب جس کو وہ الہامی مانتے ہیں۔ ژند حضرت زردشت کی کتاب جس کو پارسی الہامی اور آسمانی کتاب مانتے ہیں۔

[4] یعنی اگر حکومت کا کوئی جاری کردہ یا مجوزہ قانون پبلک کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے تو قانون کو بدلوانے یا رکوانے کی کوشش کرتے ہیں

[5] رنٹ بل Rent Bill بمعنی مسودۂ قانون لگان اراضیات۔ اس مسودۂ قانون کے متعلق مجھے تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ کون سا مسودہ تھا اور اُس کا کیا منشاء تھا۔

[6] کسی مشہور شاعر کا مصرع ہے جس کا ترجمہ ہے "یہ کام تجھ سے ہی ہو سکتا تھا اور مرد ایسے ہی کام کیا کرتے ہیں"۔

منشی نثار حسین[1] سے آموں کی فرمائش

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے ۔۔۔ اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں ۔۔۔ پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس ۔۔۔ سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

حافظ محمد حسین اور نواب محسن الملک

گئے کول حافظ محمد حسین ۔۔۔ تو مہدی سے بولے یہ حاجی مدن
کہ کر دیجئے اُن کی دعوت ضرور ۔۔۔ وہ ہیں صاحبِ دانش و علم و فن
وہ ہیں مولوی آپ بھی مولوی ۔۔۔ ذرا دیکھ لیں رونقِ انجمن

وہ بولے مرا ان کا کیا جوڑ ہے
میں گلڈنگ[2] ہوں وہ ہیں اسٹیلین[3]

---

[1] رسالۂ پیام یار کے مہتمم سیّد نثار حسین صاحب مراد ہیں۔

[2] گلڈنگ لفظ انگریزی Gelding بمعنی آختہ۔ خصّی جانور جس کے خصیئے نکال دیئے گئے ہوں۔

[3] سٹیلین لفظ انگریزی Stallion بمعنی سانڈ۔

حضرتِ اکبرؔ کے چند قابلِ قدر دوست

ڈپٹی صاحب جو ہیں زینتِ عُبّادِ جہاں — پُختہ وضعی کے ہیں انداز دکھانے والے
لَلّو پَتّو سے الگ اور زوائد سے بری — بس مصلّے ہی پہ ہیں چھاؤنی[1] چھانے والے
ساز[2] پر ہاتھ پڑا اور ہوئے رخصت آپ — رہ گئے کھول کے منھ بین بجانے والے
انسپکٹر ہیں جو یہ خان بہادر صاحب — رُعبِ حاکم دلِ دنیا پہ بٹھانے والے
بنچ کے جلسوں میں بھی تہذیب کی تصویر ہیں آپ — اگلے اسلام کی ہیں یاد دلانے والے
دوستوں[3] کے لئے بازو کا ہیں تعویذ جناب — رَہزنوں کو ہیں یہ سولی پہ چڑھانے والے
شان اللہ کی ہیں برکت[4] واسرار[5] ومجید[6] — ان کے اخلاق کے قائل ہیں زمانے والے

فیض ان کا سببِ رونقِ عیشِ احباب
تاجِ زرّیں سرِ عشرت[7] پہ اُڑھانے والے

---

[1] چھاؤنی چھانا محاورہ بمعنی مسکن بنالینا کیمپ قائم کرنا۔ یعنی جانماز ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہی اُن کی حفاظت کا سامان۔
[2] ساز بمعنی باجہ۔ مطلب یہ ہے کہ قوّالی میں طبلہ پر تھاپ پڑتے ہی آپ اپنے ہوش میں نہیں رہتے۔
[3] یعنی آپ کی دوستی ایسی ہے جیسے کسی نے بازو پر حفاظت کا تعویذ باندھ لیا ہو یعنی آپ کے دوستوں کو کسی گزند و مصیبت میں پڑنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔
[4] مولوی برکت اللہ صاحب رئیس غازی پور۔
[5] سر اسرار حسن خاں صاحب مدار المہام ریاست بھوپال۔
[6] خان بہادر عبد المجید خاں صاحب مرحوم۔
[7] سیّد عشرت حسین صاحب مرحوم حضرتِ اکبرؔ کے صاحبزادے۔

سیّد عشرت حسین سے خطاب

شروع[1] سنہ میں مَیں آؤں گا واں تم اپنی ماں کو یہ لکھ چکے ہو
تو دیر پھر کیوں لگا رہے ہو یہ کیا تامّل ہے کیوں رُکے ہو
مجھی کو سمجھو تم اپنا قبلہ سرِ ادب کو یہیں کرو خم
وہاں کے چرچوں[2] میں لُطف کیا ہے جسے اُٹھانے کو تم جُھکے ہو

راجہ صاحب محمود آباد کی قدر شناسیِ کلامِ اکبرؔ

ہیں حضرتِ ساحر[3] آج اک حصنِ کمال — ہے[4] مخزنِ حکمت و خرد اُن کا خیال
اشعارِ اکبرؔ کے کیوں نہوں یاد اُن کو — راجہ[5] کے گھر میں موتیوں کا کیا کال

---

[1] سید عشرت حسین صاحب سے خطاب ہے جو اُس وقت ولایت میں زیرِ تعلیم تھے اور وطن واپس آنے میں لیس و پیش کر رہے تھے (مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی)
[2] چرچوں جمع مہنّد ہے انگریزی لفظ چرچ (Church) بمعنی گرجا کی۔ نیز جمع چرچا (لفظ ہندی) بمعنی تذکرہ۔ شہرہ۔ گفتگو۔
[3] ساحر تخلص تھا راجہ سر علی محمد خاں تعلقہ دار محمود آباد ضلع سیتا پور کا۔
[4] یعنی بڑے بیدار مغز عقلمند اور حکیم ہیں۔
[5] یعنی اکبرؔ کے اشعار موتی ہیں اور راجاؤں کے گھر میں موتیوں کی کیا کمی۔ اس لئے راجہ محمود آباد کو بھی اکبرؔ کے اشعار بہت یاد ہیں۔

مولٰنا حسرت موہانی

تھا دلِ حسرت[1] بھرا ارمان میں
ہم نے لکھ بھیجا اُنھیں موہان[2] میں

بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم
ہاتھ میں لو اب تجارت[3] کا علم

ہوچکی غیروں سے خویشی کی بہار
بس دکھاؤ اب سودیشی[4] کی بہار

کام کو اُٹھو چڑھاؤ آستیں[5]
لَا یُضِیعُ اللّٰہُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْن[6]

[1] الحاج مولٰنا سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم۔ اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر۔ آزادیٔ برصغیر ہند کے پہلے مسلمان علم بردار۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سب سے زیادہ مخلص و دیانت دار رکن و کارکن۔ انگریزی حکومت کے ہاتھوں قید و بند کی انتہائی سختیاں برداشت کرنے والے مجسمۂ ایثار و قربانی۔ اسلامی اخلاق و تہذیب اور سادگیِ معاشرت کا قابلِ تقلید نمونہ۔ بڑے خدا ترس و تقویٰ شعار۔ دلدادۂ روحانیت و تصوف۔ ۱۹۵۱ء میں لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔

[2] موہان اودھ کا ایک مشہور قصبہ۔

[3] مولٰنا حسرت موہانی نے مشاغل ادبی و لیڈری کے ساتھ کانپور میں دیسی ساخت کے کپڑوں کی تجارت شروع کر دی تھی۔

[4] سودیشی تحریک کانگریس کی طرف سے شروع ہوئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ بدیشی مصنوعات کی بجائے ہندوستان ہی کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کی جائیں۔ اِس شعر میں اشارہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ اکبر نے مولٰنا حسرت کو لکھا تھا کہ ہندوؤں کی دوستی کا دَم تو بہت بھر چکے اور اُس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا اب اپنی اور اپنی قوم کی فکر کرو۔

[5] چڑھاؤ آستین = محاورہ ہے یعنی تیار ہو جاؤ۔ کمرِ ہمت باندھو۔

[6] آیۂ قرآنی ہے لَا یُضِیعُ اللّٰہُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْن۔ یعنی اللہ تعالیٰ خلوص سے کام کرنے والوں کے اجر (محنت کا نتیجہ) کو ضائع نہیں ہونے دیا کرتا۔

مولوی عبد الکافی صاحب اور الٰہ آباد کی مسجد

چوک کی مسجد الٰہ آباد میں ممتاز ہے
شہر کے سارے مسلمانوں کو اس پر ناز ہے

وسعت و رفعت میں تھی محسوس لیکن کچھ کمی
تنگ ہوتی تھی جگہ جب ہوں زیادہ آدمی

دین میں راسخ ہیں عبد الکافیِ[1] نیکو صفات
ان کی باتوں میں اثر ان کے ارادوں میں ثبات

کی انھیں نے سعی دل سے اور لگائی حق سے لَو
ہوگئی آخر خدا کے فضل سے تعمیرِ نَو

ہوگئی کافی جگہ اسلام کے اقبال سے
کہہ رہی ہے مسجد اب اپنی زبانِ حال سے

مسجدِ کافی کی شانِ آسمانی دیکھئے
خاکساروں کی بلندی کی نشانی دیکھئے

(یعنی تعمیر کردہ عبد الکافی)

خواجہ حسن نظامی صاحب

حسن[2] نظامی کو میں نے دیکھا شریف خصلت فقیر طینت
عمل[3] ہے اپنے ہی عنصروں میں اگرچہ دہلی کی ہے ذہانت

(فقیر طینت: درویشانہ کیفیت رکھنے والے)

[1] مولوی عبد الکافی صاحب بہت بڑے عالم، جامع مسجد چوک الٰہ آباد کے امام اور مدرسۂ سُبحانیہ الٰہ آباد کے بانی تھے۔

[2] مصوّرِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب (سلمہٗ) خواہر زادہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدّین اولیاء محبوب الٰہی رح و نبیرہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رح۔ اُردو کے مشہور و معروف البیلے انشاء پرداز و صحافی۔ سیکڑوں کتابوں کے مصنّف و مولّف۔ بیسیوں رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر و بانی۔ روحانی تحریر و تقریر کے بادشاہ۔ خوش خلقی و ہر دل عزیزی کے پیکرِ مجسّم۔ ہزاروں مریدوں کے پیر۔ لاکھوں قدر شناسوں کے ممدوح۔ بے شمار حاسدوں کے محسود۔ اپنی ذاتی محنت و کوشش اور خداداد قابلیتوں سے ترقی کرنے والے۔ حضرت اکبر کے ایک مخلص اور معتمد دوست اور حضرتِ اکبر کی معنوی شاگردی پر فخر کرنے والے۔ آج کل بھی اپنے قدیم مسکن درگاہ محبوب الٰہی میں متوطن ہیں۔ ولادت ۱۲۹۴ھ موجودہ عمر ۷۶ - ۷۷ سال۔

[3] یعنی ایک بزرگ زادہ ہونے کی حیثیت سے جو روحانی خصوصیتیں اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں عمل ان کا اُنھی خصوصیتوں پر ہے البتہ دہلی کی ذہانت کا کچھ رنگ بھی اُن کے حملوں پر چڑھ گیا ہے۔

عناں[1] (باگ) اندیشہ ہائے (خیالات) مضطر (بے چین، بیقرار) ادھر ادھر گو کبھی مُڑی بھی
وہ دستِ دل ہے کہ جس سے چھوٹی کبھی نہ حبل المتین (مضبوط رسّی) وحدت
ضمیر[2] میں اُن کے ہے تصوّف معاشرت میں ہیں بے تکلّف
فروع جو کچھ بھی پیش آئیں اصول میں اُن کے ہے قناعت

مولوی عبد الماجد دریا آبادی

"ماجد[3]" کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت — دل میں مرے تو ہے اک امید کا قصیدہ

[1] مطلب یہ ہے کہ افکار و خیالات میں ثبات و استقلال نہ ہونے سے اگرچہ اُن کی زبان و قلم کو کبھی لغزش ہو جاتی ہے لیکن وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی مضبوط رسّی کبھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھُٹتی۔

[2] یعنی دل میں اُن کے تصوّف بسا ہوا ہے اور میل جول میں وہ بڑے بے تکلّف ہیں فروعی باتوں میں خواہ وہ اپنے مسلک بدلتے رہیں لیکن بنیادی اُصول تصوّف و روحانیت پر قائم و قانع ہیں۔

[3] مولانا عبد الماجد دریا بادی بی۔ اے مسلّمہ مشہور فلسفی و ادیب و انشا پرداز و صحافی و شاعر، مصنّف فلسفہ جذبات و دیگر کتب حکمت و تصوّف و تاریخ و سوانح و نیز مترجم و مفسّر قرآن۔ حضرت اکبر سے ذاتی تعلّقات و روابط رکھنے والے اور مرحوم کے بڑے قدردان و مدّاح۔ حضرت اکبر کے متعلق اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ عنقریب "بزم اکبر" کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔ شروع شروع میں مولانا کا رجحان الحاد و دہریت کی طرف تھا۔ لیکن بعد میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ کے فیوض و اثرات سے رنگ پلٹ گیا اور اب مولانا بھی گریجوایٹ ہونے کے باوجود مولانا اشرف علی صاحب کے مسلک کے رنگ میں بالکل رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "بزم اکبر" کو آپ سے بڑی عملی امداد ملتی رہی ہے اور مل رہی ہے۔ حضرت اکبر کے یہ اشعار مولانا ماجد کے متعلق اُس زمانہ میں لکھے گئے تھے جب یہ کہا جاتا تھا کہ مولانا کا رجحان الحاد و دہریت کی طرف ہے۔ حضرت اکبر کہتے ہیں کہ اُن کا مولانا ماجد کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ وہ تصوّف و روحانیت سے بیگانہ ہو گئے ہیں بلکہ اُن کا خیال یہ ہے کہ مولانا پر بھی عشقِ حقیقی اور فنا فی اللّٰہی کی کوئی ویسی ہی کیفیت طاری ہوئی ہے جیسی کہ حضرت مولانا نیاز بریلوی رح کے اس شعر میں بیان کی گئی ہے ؎ من پاکباز عشقم الخ۔ جس کا ترجمہ ہے:۔ میں ایک پاکباز عاشق ہوں اور ذوقِ فنا سے آشنا ہو چکا ہوں۔ میں ہُو کے جنگل کا ہرن ہوں جس نے ماسوا سے تعلق منقطع کر لیا ہے۔ مولانا کے قدیم رجحاناتِ طبع پر حضرت نیاز بریلوی کا یہ شعر کیسے صادق آتا تھا اس کی توجیہ و تشریح خود مولانا ہی کا قلم زیادہ خوبی سے کر سکتا ہے۔ (پیدائش ۱۸۹۲ء۔ عمر موجودہ ساٹھ سال۔)

ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر باثر کے — ارشاد کر گیا ہے اک مردِ برگزیدہ
من پاک بازِ عشقم ذوقِ فنا چشیدہ
آہوئے دشت ہویم از ماسوا رمیدہ

مسٹر برن[1] چیف سکریٹری گورنمنٹ یو۔پی

شاعروں میں جب آیا میرا پارٹن (باری) — پڑھ دیا میں نے پیش حضرت برن
اُردو و فارسی میں آپ ہیں برق — آپ ہی سے ہے نورِ مطلعِ شرق
صاحبِ فیض و لطف و حلم ہیں آپ — عزّت افزائے اہلِ علم ہیں آپ
حق تعالےٰ کو مانتے ہیں آپ — قدر طاعت کی جانتے ہیں آپ
فخر و ناز آپ کے لئے ہے مباح (جائز) — اک زمانہ ہے آپ کا مدّاح
آپ سے مل کے دل کو راحت ہے — ایسا حاکم خدا کی رحمت ہے
آپ کا دل ہے مخزنِ ہمہ اوست[2] — جو ملا آپ سے بنا وہ دوست
ہے بلند آپ کے کرم کا عَلَم (جھنڈا) — ہیں مرید آپ کے سب اہلِ قلم
سازِ بزم آپ کا رہے برتر — ہو مبارک ترانۂ اکبر

[1] مسٹر برن یو۔پی سول سروس کے ایک بڑے ہر دل عزیز و قابل افسر تھے جو بعد میں چیف سکریٹری ہو گئے تھے۔

[2] ہمہ اوست کے لفظی معنی ہیں "سب وہی ہے" قائلین وحدت الوجود کائنات کی ہر چیز میں خدا ہی کے وجود کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب کچھ وہی ہے۔ "ہمہ اوست" "دل کے مخزن ہمہ اوست" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کسی کی غیریت کا احساس نہ ہو اور سب کے ساتھ اپنوں اور دوستوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔

سیّد عشرت حسین صاحب کا بنگلہ

فضل ہو اللہ کا ہوں جمع سالے سالیاں
وہ اُچھالیں بال (گیند) یہ چمکائیں اپنی بالیاں

لمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف
عشرتی[1] جھوما کریں بچے بجائیں تالیاں

گھر رہے آباد سمدھی اور سمدھن خوش رہیں
ڈومنی انعام پائے گائے پیاری گالیاں

گرد بنگلے کے رہے سرسبز ہر شاخِ درخت
نہر کے پانی سے لہراتی رہیں سب نالیاں

ڈھیر ہو پھولوں کا گلدستے بنائے باغباں
پیڑ پھل دیتے رہیں مالی لگائیں ڈالیاں

سونے[2] چاندی کی بہیں موجیں دلہن کے ہاتھ سے
لیں بلائیں اور دعائیں دیں اُنھیں گھر والیاں

غل مچائیں کھیل میں بچے رہے بنگلے میں دھوم
میہمانوں کے لئے پکوان کی ہوں تھالیاں

جھانک کر دیکھیں تو جج صاحب[3] کا دل بھی ہو نہال (خوش و خرم)
کمرے کے دیوار میں دو اک بنی ہوں جالیاں

محمد موسیٰ صاحب کی بھیجی ہوئی لیچیاں

بھیجی تم نے جو مجھ کو لیچی
شربت کی نظر ہے اُس سے نیچی[4]

مُنھ میں رکھ کر جو میں نے چوسا
بولی یہ زبان واہ موسٹی[5]

[1] حضرت اکبر اپنے صاحبزادہ سید عشرت حسین مرحوم کو پیار سے عشرتی کہا کرتے تھے۔
[2] یعنی دلہن خوب داد و دہش کریں۔
[3] مراد خود حضرت اکبر ہیں جو پنشن پانے کے بعد بھی جج کہلاتے تھے۔
[4] نظر نیچے ہونے سے مراد شرمندہ ہونا ہے یعنی لیچیوں کی مٹھاس کے آگے شربت کی مٹھاس بھی ماند ہے۔
[5] یعنی محمد موسیٰ صاحب برادر خورد شمس العلماء مولوی امجد علی صاحب ایم۔ اے۔ موسا ہندی مصدر موسنا کا ماضی بھی۔ موسنا کے معنی ہیں لوٹ لینا۔ مال اُڑا لینا یہاں ممکن ہے کہ یہ معنی بھی مراد ہوں کہ زبان نے منھ سے شکایت کی کہ واہ تم نے تو لیچی کو چوس کر سارا مزا خود ہی اُڑا لیا۔

نوحے، تہنیتیں
اور
مادہ ہائے تاریخ

بر وفات سیّد محمود[1] مرحوم

نہ وہ بک[2] رہ گئے نہ سر سیّد — دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ محمود (فرزندِ سرسید) سے تسلّی تھی — لی اُنھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ — اے حریصانِ شان و شوکت و جاہ

مِٹ گیا نقشِ احمد[3] و محمود
رہ گیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

بر وصال مولانا محمد حسین[4] الٰہ آبادی مرحوم

سُن رہے تھے سماع مولانا — اُسی حالت میں انتقال ہوا
واہ کیا خوش نصیب تھے حضرت — عالمِ وجد میں وصال ہوا

---

[1] جسٹس سیّد محمود (وفات ۱۹۰۳ء) سر سیّد کے فرزند ارجمند۔ سیتاپور میں دفعتاً ایک جمعہ کو وفات پائی۔ (عبدالماجد دریا بادی)

[2] مسٹر بک علی گڈھ کالج کے پہلے اور نامور پرنسپل ہوئے ہیں۔ سرسید اور محسن الملک پر حاوی (مولوی عبدالماجد دریا بادی)

[3] احمد و محمود اسمائے مبارک جناب رسالت مآبؐ کے بھی ہیں مگر اس شعر میں مراد سر سیّد احمد خاں صاحب اور اُن کے صاحبزادے سیّد محمود صاحب مرحوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی بڑی بڑی ہستیوں کے نہ رہنے سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ سوائے ذات اللہ کے باقی جو کچھ بھی ہے وہ فانی ہے۔

[4] شمس العلماء مولانا محمد حسین الہ آبادی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی کے ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ ابتداءً سماع نہیں سُنا کرتے تھے مگر پھر کچھ طبیعت میں ایسا انقلاب ہوا کہ سماع کا بے حد ذوق پیدا ہو گیا یہاں تک کہ ۱۹۰۲ء میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے عُرس کے موقع پر سماع سُنتے ہوئے حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے اس شعر پر ؎ گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا ؛ خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی۔ کیفیت وجد طاری ہوئی اور اسی کیفیت میں انتقال فرما گئے۔ الہ آباد میں بیانِ ذکرِ معراج کے لئے رجبی شریف کے نام سے ایک بڑی مجلس منعقد فرمایا کرتے تھے جس میں دُور دُور سے آکر لوگ شریک ہوتے تھے۔

حضرت کی وفات سے ہے ہر اک دل ریش — رکھتے تھے عزیز اُن کو بیگانہ و خویش
کیا کیا صفتیں تھیں جمع ان میں اکبر — حافظ، حاجی، طبیب، عالم، درویش

مولانا محوِ عشقِ یزدانی تھے — بے شک اس عہد میں وہ لاثانی تھے
بھولیں نہ کبھی انھیں محبانِ رسول — یعنی رجبی شریف کے بانی تھے

تاریخ وفات والدہ[1] صاحبہ سیّد عشرت حسین

مرا راحت رسان و محرمِ اسرار ما بودی — ہمیں تاریخ فوتت گفتہ ام غمخوار ما بودی
۱۹۱۰ء

مادہ تاریخ ولادت سیّد[2] ہاشم

تیغِ فاتح — ظہورِ پدر
۱۸۹۹ء — ۱۳۱۷ھ

مادہ تاریخ ولادت سیّد عقیل ابنِ سید عشرت حسین

محمد عقیل ابن عشرت
۱۳۲۵ھ

---

[1] والدہ صاحبہ سید عشرت حسین صاحب مرحوم کا انتقال بتاریخ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ہوا۔

[2] سید ہاشم مرحوم حضرت اکبر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جن کی جواں مرگی پر حضرت اکبر کو بے حد صدمہ ہوا اور اُن کی کمر ٹوٹ گئی۔

تاریخ وفات جناب سیّد تفضل حسین صاحب پدر حضرتِ اکبر

چو شُد واصلِ ذاتِ رب ذاتِ او — بجو سال تاریخش از ذاتِ رب
۱۳۳۰ھ

بر وفات سیّد ہادی علی صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ الہ آباد

اُن کے مرنے کا نہ کیوں ہو سب کو غم — سچ تو یہ ہے لاکھوں ہی میں ایک تھے
سُنئے الہامی یہ تاریخِ وفات — میر ہادی صُلح جُو تھے نیک تھے
۱۳۱۷ھ

پاکیزہ سرشت صاحب رائے — میر ہادی از جہاں مردانہ رفت
۱۳۱۷ھ

شُد اہلِ بہشت میر ہادی
۱۳۱۷ھ

نوحۂ وفات عثمان پرشاد پسر مہاراجہ[1] سر کشن پرشاد

رحلتِ فرزند سے ہیں راجہ صاحب دردمند — شاد کا دل اِس مصیبت سے بہت ناشاد ہے
اکبر خونیں جگر اس غم میں خود ہے مبتلا — اُس کے لب پر بھی فغاں ہے آہ ہے فریاد ہے
حرفِ تسکین و تسلّی کیا زباں پر لائے وہ — شاد خود صوفی ہیں اُن کو درسِ حکمت یاد ہے

---

[1] مہاراجہ سر کشن پرشاد حیدر آباد دکن کے مشہور علم دوست اور صوفی منش وزیرِ اعظم تھے۔ اُن کے بڑے صاحبزادے کا نام جن کی وفات پر حضرت اکبر نے یہ نوحہ لکھا ہے۔ نظامِ دکن اعلیحضرت میر عثمان علی خاں صاحب کے نام کی رعایت سے عثمان پرشاد رکھا گیا تھا۔

رحمتِ حق پر نظر ہے اور یہی ہے التماس　　منزلِ ہستی کی یہ اک فطرتی اُفتاد ہے

لطفِ اشفاقِ خدا کی گود میں پلتا ہے وہ　　جنّت الفردوس اُس کے دم سے اب آباد ہے

اس تصوّر میں رہے مہراج کی طبعِ بلند

یعنی اب عثمان پرشاد آسماں[1] پرشاد ہے

بروفات مولانا شبلی[2] نعمانی

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نُور ہے　　ویران آج کوچۂ بین[3] السطور ہے

شبلی کا خامہ صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا　　اب مدّ آہ و لوحِ دلِ ناصبور ہے

شبلی ہی اُٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس　　شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اُداس

ڈھونڈھا جو دل نے مادۂ سالِ انتقال　　پھرنے لگا نگاہ میں یارِ سخن شناس

۱۳۲۳ھ

[1] "آسماں پرشاد" کے معنی ہیں "آسمان پر خوش" مرنے کے بعد "عثمان پرشاد" کو "آسمان پرشاد" بنا دینا حضرتِ اکبر کا ایک شاعرانہ کمال ہے۔

[2] شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی رکنِ رکین و معاونِ بناءِ ندوۃ العلماء۔ فاضلِ ادب۔ مورّخ و متکلّم۔ وفات ۱۹۱۴ء

[3] دو لکھی ہوئی سطروں کی درمیانی جگہ کو بین السّطور کہتے ہیں۔ پُرانی کتابوں کے بین السّطور میں الفاظ و معانی کی ایسی مختصر توضیح کردی جاتی تھی جس سے کتاب کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو جاتی تھی۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ مولانا شبلی علوم و تصانیفِ قدیمہ کے متعلق جو کچھ لکھتے تھے اُس کے الفاظ ایسے چُست اور گُتھے ہوئے اور معنی ایسے روشن ہوتے تھے جیسے کہ کسی نے اُن علوم اور کتابوں پر بین السطوری حاشیے لکھ دئے ہوں۔ مولانا شبلی کے انتقال کے بعد اب یہ کوچۂ بین السّطوری ویران ہو گیا یعنی قدیم علوم و تصانیف پر مولانا شبلی جیسا تبصرہ کرنے والا نہیں رہا۔

بروفاتِ والدۂ ڈاکٹر اقبال[1] مرحوم

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں　　قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہوئیں

یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت　　یہ طریقِ راستی خود رائی بے تمکنت

اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے　　باخدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے

جادہ گر اِن میں اُنھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت　　ہے ثمر اُس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت

مادرِ مخدومۂ اقبال جنّت کو گئیں　　چشمِ تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوگیں

روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو

نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو

اکبرؔ اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے　　سالِ رحلت کا بیاں منظور اُسے فی الحال ہے

واقعی مخدومۂ ملّت تھیں وہ نیکو صفات　　رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

۱۳۳۳ھ

[1] علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا۔ مشہورِ عالم ادیب و مفکّر و شاعر فلسفی۔ مصنّف پیام مشرق۔ و بانگِ درا و اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی و زبورِ عجم و جاوید نامہ و شکوہ و جواب شکوہ وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں کے مایۂ ناز انقلاب انگیز شاعر (ولادت در سیالکوٹ ۱۸۷۶ء۔ وفات در لاہور ۱۹۳۶ء) علامہ مرحوم نے اپنی والدہ ماجدہ کی حسرت آیات وفات پر خود بھی پُر اثر نوحے تحریر فرمائے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ۱۳۳۳ ہجری میں ہوا۔

بر وفات سیّد ہاشم مرحوم[1]

صدمۂ فرقت میں کر کے مُبتلا — آج ہاشم عازمِ جنّت ہوا
قوّتِ بازوئے عشرت چل بسی — اور مرا نورِ نظر رخصت ہوا

آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا — آیا سنائیے تو کیا آپ نے کہا ہے
اشعارِ حسرت آگیں کہنے کی تاب کس کو — اب ہر نظر ہے نوحہ ہر سانس مرثیا ہے

بر ولادت و وفات پسر سیّد عشرت حسین

نظر امید کی اِک غنچۂ دل کش کو تکتی تھی — فلک نے ناشگفتہ اُس کو لیکن کر دیا رخصت
سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم اس باغِ ہستی کا — بہ صد حیرت کہی تاریخ رمزِ گلشنِ فطرت

۱۳۳۶ھ

بر وفات شمیم فاطمہ صاحبہ دختر مفتی افتخار حسین صاحب

چل بسی وہ دخترِ گل پیرہن — ہوگیا ویراں ہمارا باغ آہ
سالِ رحلت کیا لکھوں اے افتخار — دیکھتے ہی ہیں جگر میں داغ آہ

---

[1] حضرت اکبر کے ہونہار چہیتے چھوٹے صاحبزادے سیّد ہاشم مرحوم جو بعمر تقریباً ۱۴ سال اپنے زندہ دل بوڑھے باپ کے سارے زندہ دلوں کو ختم کر کے ۵ رجون ۱۹۱۳ء کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ سیّد عشرت حسین صاحب مرحوم سیّد ہاشم مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں "حضرت قبلہ (یعنی حضرت اکبر) جیسے بیٹے کو پسند کرتے تھے ہاشم ویسے ہی بیٹے تھے"۔

فغاں کہ سوخت ز غم جانِ افتخار حسین — دلش فسردہ شد از جورِ عالمِ فانی
شمیم فاطمہ دخت عزیز و نور نظر — نہالِ نورس و زیبا بباغِ امکانی
جمالِ صورت معنی ضمیرِ ہستی او — بہ خلق نجمِ سعادت بہ خلق لاثانی
فغاں کہ دستِ اجل پنجہ زد بدامنِ او — کشید رخت اقامت ز عالمِ فانی
بہار گلشنِ ہستی ہنوز نا دیدہ — پرید طائر روحش بحکمِ یزدانی
فراقِ لختِ جگر را ز والدین بپرس — چہ برقہا کہ فگندہ ز سوزِ پنہانی
ہزار شعلۂ حسرت کہ سرزد از دلہا — ہزار اشک مصیبت کہ کرد طغیانی

چو فکر سالِ وفاتش نمودم از سرِ راہ
شمیمِ خلد شدہ گفت فضلِ رحمانی

۱۳۳۳ھ

قطعہ تاریخ وفات سیّد مہدی حسن صاحب

جنابِ سیّد مہدی حسن خجستہ صفات — بلند مرتبہ ذی علم مصدر حسنات
سدھارے دارِ فنا سے وہ سوئے خُلدِ بریں — سنہ وفات کا خواہاں ہوا جو قلبِ حزیں

پڑھا یہ ہاتفِ غیبی نے مصرعِ جیّد
مقیمِ خلدِ بریں مہدیِ حسن سیّد

۱۳۳۷ھ

تقریظات

قطعہ تاریخ وفات بی بوٹا صاحبہ زوجۂ ثانی حضرت اکبر

آں نونہالِ خوبیِ ماہِ دو ہفتۂ من — در نوبہارِ عمرش رفت از فضائے ہستی
پیمانۂ مے غم سرشار و بیہشم کرد — رفتم سرِ مزارش در بے خودی و مستی
آہے ز دل کشیدم گفتم کہ اے مہِ من — با ایں کمال و رفعت حیف است میلِ پستی
آخر چہ پیشت آمد اے شمعِ محفلِ من — در گوشۂ نشستی وز انجمن گسستی
آخر چہ شُد کہ رفتی اے رونقِ گلستاں — در موسمِ بہاراں رنگِ چمن شکستی
اے برق دش چہ داری نسبت بگورِ تیرہ — اے شعلہ رو بخاکِ تربت چرا نشستی
اے خوش نگاہ واکن چشمانِ سحر آگیں — چیزے بگو بہ عاشق لبہا چرا بہ بستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوشِ جانم — کاے بے خبر زایماں اے محوِ بُت پرستی
آں را کہ شعلہ خوانی واں را کہ برق دانی — آں جملہ بود رنگِ نقشِ طلسمِ ہستی
آں رنگ ہا پرید و بویش بماند رازے — رازے کہ کس نہ داند در بندِ خود پرستی
عبرت کشود چشمِ حیرت بہ ہوشم آورد — در سینہ دفن کردم جوش و خروشِ ہستی

تاریخِ فوت گفتم در صنعت عجیبے
بوٹا[۵۲] بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی
۴۰۹ ۱۷۰۲ ۴۰۹ سنہ ۱۲۹۳ھ

---

[۱] بی بوٹا حضرت اکبر کی کم سن محبوبہ اور پھر منکوحہ۔ تائب ہو کر اور عقد میں آکر عین عنفوانِ شباب ۱۸۷۶ء میں وفات پائی۔ (مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی)

[۵۲] یہ مادۂ تاریخ صنعت تخرجہ میں ہے یعنی گرد باغ ہستی کے اعداد ۱۷۰۲ میں سے بوٹا کے اعداد ۴۰۹ تفریق کرنے سے سنہ وفات ۱۲۹۳ھ نکلتا ہے۔

ایڈیٹر صاحب رسالۂ یدِ بیضا کے نام

عِلمِ اسرارِ دل و حلِّ معمّا داری — برتر از نظمِ دکن نظمِ ثریّا داری
تو چہ حاجت بہ جمالِ سخن ما داری — حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا[1] داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

شاہی کیوڑہ کی تعریف میں

عنبر[2] فشاں ہوا ہے معطّر مکاں ہے — کیوڑے کا یہ عَرق نہیں کیوڑے کی جان ہے
کیوڑہ بنے گا پندرہ قطروں سے اِک گلاس — اس کی یہی ہے جانچ یہی امتحان ہے (یعنی رُوحِ کیوڑہ)

صنعتِ صانع کو دیکھ اِس روغنِ بادام میں — یاسمن (یا چنبیلی) کی روح پھونکی ہے تنِ بادام میں

---

[1] یدِ بیضا (عربی) بمعنی چمکتا ہوا ہاتھ۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے ایک معجزہ یدِ بیضا کا بھی ظاہر ہوا کرتا تھا۔ یعنی جب وہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈال کر نکالتے تھے تو وہ ایسا چمکتا تھا کہ آنکھیں چُندھیانے لگتی تھیں۔ یدِ بیضا ایک ماہوار رسالہ کا نام تھا جو حیدر آباد دکن سے نکلا کرتا تھا اور جس کی تعریف میں یہ اشعار کہے گئے تھے۔

[2] اس قطعہ پر کُلیّاتِ اکبر جلد دوم میں یہ حاشیہ ہے:۔ یہ اشعار حضرت اکبرؔ نے حسب فرمائش شیخ محمد حسین سکندر پُوری ضلع بلیا مصالحہ دار نظامۃ العالیہ مرشد آباد صدر دوکان کھنگرا پٹی کلکتہ ۳ موجد بادامی روغن و شاہی کیوڑہ وغیرہ کے کیوڑے کی تعریف میں موزوں فرمائے۔ (محمد عبدالرحمٰن قلیس)

ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم کی تعریف

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور — ہر حرف سے ہے تجلّیٔ حق کا ظہور
[1]اوجِ ملکوت کا ہے عالم (جہان) ہر لفظ — ہر بیت (شعر) اقبال کی ہے بیت[2] المعمور

ایم۔آر۔ آرزو کا بنولے کا تیل

ایم۔آر۔[3] آرزو کی یہ ترکیب دیکھئے — نیٹو[4] کو رنگ و روپ میں مسٹر بنا دیا
تاثیر میں مفید بنولے کا تیل تھا — خوشبو میں بھی بس اس کو لونڈر[5] بنا دیا

نقی محمّد خاں صاحب کی تصنیف پر قطعہ تاریخ

خدا کے بندۂ صالح نقی محمّد خاں — سپہرِ علم و خرد کے ہیں اخترِ تاباں
کتاب ان کی یہ ہے ہادیِ طریقِ ثواب — ملا ہے ہم کو یہ گنجِ جواہر خوش آب
جو غنچہ قلب کا تاریخ کی طلب میں کھلا — کلیدِ خُلق و صداقت میں سالِ طبع ملا
۱۳۳۵ ھ

[1] یعنی ہر لفظ سے ملکوتی تخیّل کی بلندی عیاں ہے۔
[2] بیت المعمور کے لفظی معنی ہیں بھرا گھر آباد مکان، مذہبی اصطلاح میں اُس آسمانی مسجد کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ طوفانِ نوح کے زمانہ میں اُس کو زمین سے اُٹھا کر عرشِ چہارم پر قائم کر دیا گیا تھا۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ علامہ اقبال کی کس نظم کی تعریف میں یہ اشعار کہے گئے ہیں۔
[3] ایم۔آر۔آرزو نام ہے کسی خوشبودار بنولے کے تیل کے موجد کا۔
[4] نیٹو سے مراد دیسی اور مسٹر سے مراد مغربی ہے۔ یعنی ایک دیسی چیز کو مغربی رنگ و روپ میں تبدیل کر دیا۔
[5] لونڈر (انگریزی) Lavender = انگریزی عطر۔

تقریظ کتاب اعجوبۂ اسرار

نورِ باطن بڑھ گیا اعجوبۂ اسرار سے — دل نے پائی تقویت اس روح کے غمخوار سے
پردۂ غفلت اُٹھا دیتے ہیں وہ مضموں ہیں یہ — پھیر دیتے ہیں طبیعت دہر کے بازار سے
ہیں مصنّف اس زمانے کے بڑے عالی خیال — واقعی یہ ہے کہ ہیں وہ فرقۂ ابرار سے
بند ہے اس وقت چشمِ عبرتِ عرفاں تمام — ہاں لیا ہے کام اُنھوں نے دیدۂ بیدار سے

ہے بجا "اعجوبۂ اسرار" کی نسبت یہ قول
دولتِ ایماں بڑھی تصنیفِ گوہر بار سے

تقریظ کتاب ہدیۂ حیدری

کس قدر پُر نور ہے یہ نظمِ مدحِ بوتراب (حضرت علیؓ) — یہ بلاغت حیرت افزا یہ فصاحت لاجواب
اس قصیدے سے ہوئے روشن زمین و آسماں — اوجِ معنی پر دلِ اختر سے نکلا آفتاب

بزمِ اکبر کی شایع کردہ شاندار کتابیں

سب مجلّد ہیں اور سب کی لکھائی، چھپائی وغیرہ ایسی ہی ہے جیسی قطعات و رباعیاتِ اکبر کی ہے

حیاتِ اکبر حضرتِ اکبر الٰہ آبادی کے یہ حالات اُن کے فرزند سیّد عشرت حسین صاحب مرحوم کے جمع کردہ مواد سے مُلّا واحدی صاحب نے اپنی زبان میں لکھے ہیں۔ بے حد دل چسپ سوانح عمری ہے۔ افسانوں سے زیادہ دل چسپ۔ ضخامت ڈھائی سو صفحے۔ بچپن۔ بڑھاپے اور ججی کے لباس کے نایاب فوٹو ؤں کے ساتھ چھ بلاک اور الگ ہیں۔ قیمت ساڑھے تین روپے۔ محصول ڈاک دس آنے۔

کُلیاتِ اکبر۔ جلد اوّل

لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی

کا

سترہ سال سے پچاس سال تک کی عمر کا کلام

ضخامت چار سو چالیس صفحے

قیمت چھ روپے

محصُول بارہ آنے

کلّیاتِ اکبر۔ جلد دوم و سوم

اس میں

کلّیاتِ اکبر کے پُرانے ایڈیشنوں کے

حصّۂ دوم و سوم کو یکجا کر دیا گیا ہے

ضخامت چار سو چوہتّر صفحے

قیمت سات روپے

محصول چودہ آنے

حسب الارشاد جناب مشتاق احمد صاحب۔ آنریری سکریٹری، بزمِ اکبر
کتاب ہٰذا کلیم پریس کراچی میں چھپی اور دفتر بزمِ اکبر، بنز رٹا لائنز۔ کراچی نمبر ۵ سے شائع ہوئی۔

لسان العصر

حضرت اکبر الہ آبادی کے متعلق اختر انصاری اکبر آبادی نے پچانوے شاعروں سے تازہ نظمیں لکھوائی ہیں۔ کوئی پرانی اور مطبوعہ نظم اس مجموعہ میں نہیں ہے۔

حامد حسن قادری۔ اسد ملتانی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ شاد عارفی۔ ماہر القادری۔ سراج الدین ظفر۔ ادیب سہارنپوری۔ اختر ہوشیارپوری۔ سرشار صدیقی۔ شاہد نقوی۔ رئیس امروہوی۔ ظریف جبلپوری۔ عابد حشری۔ سجاد باقر۔ خمار انصاری۔ سلطان برنی۔ صہبا اختر۔ ہدایت حیدری اور افضل صدیقی جیسے شعرا نے حضرت اکبر کو خراج تحسین دیا ہے۔

رحلت سے مہینہ بھر قبل کا ایک فوٹو اس کتاب میں لگایا گیا ہے۔

ضخامت ایک سو بانوے صفحے۔ قیمت تین روپے۔ محصول آٹھ آنے۔

اکبر اس دور میں

اسے بھی اختر انصاری اکبر آبادی نے ممتاز ناقدین کے تازہ مضامین حاصل کر کے ترتیب دیا ہے۔

حضرت اکبر الہ آبادی پر بے مثل کتاب ہے۔ اکبر اور اکبر کی شاعری کو سمجھنا ہو تو "اکبر اس دور میں" ضرور پڑھئے۔

ضخامت تین سو چھتیس صفحے۔ قیمت پانچ روپے۔ محصول بارہ آنے۔

مہتمم مکتبۂ بزم اکبر۔ "بزرٹا لائنز۔ کراچی نمبر ۴